نئے زاویے

(جلد دوم)

مُرتبہ:-

کرشن چندر

مکتبہ اردو لاہور

قیمت چھ روپے

امرت الیکٹرک پریس لاہور میں چودھری نذیر احمد پرنٹر پبلشر چھپ کر مکتبہ اُردو لاہور سے شائع ہوا



ترتیب

معروضات

نئے زاویے کی پہلی اور دوسری جلد میں ایک ہولناک جنگ کا وقفہ ہے، یہ وقفہ ابھی ختم نہیں ہوا، لیکن مغرب میں اس کی خوں آشامیوں کے مٹنے کے آثار نظر آتے ہیں، مشرق میں ابھی نویدِ سحر نہیں، اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب تک ہو، ایشیا کی روح بے قرار ہو کر اُفق کی جانب دیکھ رہی ہے کہ کب وہ تجلّی ہویدا ہو جو اس کے جسدِ خاکی میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دے، مغربی طاقتوں کے حریصانہ منصوبے اور اُن کے تضادوں کا تصادم ابھی تک اسے ناممکن بنائے ہوئے ہے، اور خود ایشیا میں اتنی سکت نہیں، اتنی خودی نہیں یا وہ ذوقِ عمل نہیں کہ خم ٹھونک کر میدانِ کارزار میں اکیلا اور بے سہارے کھڑا ہو سکے، اُسے اپنی طاقت کا احساس ہو چلا ہے، لیکن یہ احساس، یہ آگاہی ابھی اک دبی دبی نیم ذہنی کیفیت تک محدود ہے، احتجاج کی مضطرب، زخمی، بے چین لے ابھی تک سینے میں پھڑپھڑاتی ہے اور اُس توانا ہیجانی قوت سے محروم ہے جو جھپٹ کر ایک ہی جست میں نصب العین کو پا لیتی ہے، موجودہ جنگ نے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کیا کہ اس روحِ احتجاج کو اس دبی دبی نیم ذہنی کیفیت کی دھڑکن کو ہندوستانی ادیبوں کے افکار میں تیز تر کر دیا ہے، جنگ کا یہی ایک ایسا اہم تاثر ہے جو ہمیں ہندوستانی ادیبوں کے فن پاروں میں واضح طور پر اُبھرتا نظر آتا ہے لیکن جہاں تک فسطائیت اور نافسطائیت کی فکری کشمکش کا تعلق ہے، اس کا تضاد، اس کا جذباتی و عقلی تصادم، اُس کے محرکات کا تجزیہ، اُس کا ہندوستانی ماحول پر اثر، اور اُس سے متعلق دیگر ثانوی مسائل کا بیان ہمارے ادب میں بہت کم آیا ہے اور اب کہ جنگ کا خاتمہ نافسطائیوں کی فتح پر ہونے کو ہے اس امر کا امکان اور بھی کم ہو چلا ہے کہ ہمارے ادب میں اس موضوع پر کوئی ایک

بھی ایسی چیز لکھی جائے گی جو اپنی تخلیقی قوت کے اعتبار سے بے مثل نہ سہی، اعلیٰ پائے کی ہو۔

اس کی وجہ جوازیہ نہیں کہ ہندوستانی ادیبوں کا ذہن فسطائیت کے خطرے سے آگاہ نہیں یا اُس نے جنگ کی فکری کشمکش کو سمجھا نہیں یا وہ اس دورِ ابتلا کی ظلمت سے آگاہ نہیں جو اگر اس کے ملک پر مسلط ہو جاتا تو اسکی کشتِ ادب کو صدیوں کیلئے ویران کر دیتا، بخلاف اس کے ہمارے بیشتر صاحبِ فکر ادیبوں کے ذہن میں فسطائیت کی تمام جزئیات اپنی اپنی جگہ اپنے تسلسل اور ترتیب میں نہایت روشن اور واضح ہیں وہ اسکے شر سے آگاہ ہیں، اسکی بُرائی کرتے ہیں، اس کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں، رسالوں میں اخباروں میں، ریڈیو میں، فوج میں بھرتی ہو کر عوام کے سامنے لیکچر دے کر، گیت گا کر، ڈرامے دکھا کر، ہر نہج سے، ہر ممکن طریق سے انہوں نے اپنی تبلیغی قوتوں سے کام لیکر عوام کے جذبات کو فسطائیت کے خلاف ابھارنے کی کوشش کی ہے، اپنے تبلیغی مقصد میں وہ کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں، اس کا جائزہ جیطۂ ادب سے خارج ہے، ہاں اس سے مفر نہیں کہ ادبی حیثیت سے یہ مساعی زیادہ مشکور نہیں ہوئیں اور ہمارے ادب میں انہیں وہ مقام حاصل نہیں جو مثال کے طور پر اس نوع کی تحریروں کو روس یا چین کے قومی ادب میں حاصل ہے!

آخر ایسا کیوں ہے؟ ہمارے ادیبوں میں جوہرِ مطالعہ، تجربہ، تعمقِ نگاہ، تاریخی شعور کی کمی نہیں، پھر یہ صورتِ حال کیونکر معرضِ وجود میں آئی؟ اس کی وجہ جاننے کے لئے ہمیں اُس داخلی تضاد کا مطالعہ کرنا پڑے گا جو جنگ شروع ہونے پر بلکہ اس سے کچھ عرصہ پیشتر ہمارے ادیبوں کے دل و دماغ پر چھا رہا تھا، اور جس کے اثرات باقی ہیں اور اُن کی تحریروں میں جا بجا جھلکتے ہیں اور نافسطائیت کی آنے والی فتح کے باوجود جاری و ساری ہیں، اور یہ تضاد نتیجہ ہے اُن خارجی اسباب کا جو ہمارے سیاسی ماحول کے طفیل ہماری زندگی کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک مسلط ہیں، جب ماحول ہی اس قدر ناسازگار ہو تو ادیب بیچارہ کیا کرے کیونکہ ادب اپنے ماحول سے باہر کوئی چیز نہیں، اُس وقت اس کی حیثیت اُس مچھلی کی سی ہو گی جو پانی سے نکل کر فضا میں سانس لینا چاہے۔

ہمارے ادیبوں نے اپنے ماحول کے اندر رہ کر اسے بدلنے کی کوشش ضرور کی ہے اور موجودہ جنگ کی فکری اور سماجی اہمیت کو سمجھ کر تاریخی قوتوں کے بہاؤ کو تیز تر کر دینا چاہا ہے۔ لیکن اس ضمن میں اُن کی بیشتر مساعی اُس اندرونی تضاد، اُس کربناک ثنویت کا شکار ہو کر رہ گئیں کہ جو ہمارے ملکی ماحول کے پیشِ نظر ناگزیر سی نظر آتی ہے، اور جس سے بچ نکلنا عقلی نقطہ نگاہ سے تو ممکن ہے لیکن جذباتی مجبوریوں کے پیشِ نظر ناممکن سا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ہندوستانی ادیب فسطائیوں اور محوریوں کے خبثِ باطن پر نظر ڈالکر اور اُن کے نفرت انگیز عمل سے متاثر ہو کر جمہوریوں کا ساتھ دینا چاہتا ہے، اُس وقت اُس کے ذہن میں اکثر اتحادی ملکوں کی استعمار پسندی

کی یاد تازہ ہو جاتی ہے' اُس وقت اس کی نظر اپنے ملک کے سیاسی ماحول پر پڑتی ہے' جہاں ابھی تک سچی جمہوریت کا فقدان ہے' اور جس کے عناصر ترکیبی میں ابھی تک کئی نیم فسطائی اصول کام کر رہے ہیں' اُسوقت وہ بے بس ہو کر سوچتا ہے "یہ بھی تو مخمل نہیں، ریشم نہیں، دیبا نہیں" جب وہ دیکھتا ہے کہ فسطائیت کے ہاتوں پوری دنیا کی آزادی خطرے میں ہے' اور اُس کی تخلیقات میں اس کے خلاف جذبۂ نفرت اپنی پوری قوت سے اُبھرنے کو ہوتا ہے۔ عین اُس وقت اس کے ذہن میں اطلانتک چارٹر کا خیال آتا ہے۔ جو دُنیا کے لئے قرطاس حریت ہے لیکن جس کا اطلاق بقول مسٹر چرچل ہندوستان پر نہیں ہوتا، جب وہ اُس تنگ نظری اور نسلی تنفر کا اندازہ کرتا ہے' جو فسطائیت کے مرکب عمل کا ایک شعبہ ہے' اُس وقت اُس کی نظر اُس "دیوار رنگ" پر پڑ جاتی ہے' جو آج بھی اکثر جمہوریوں کی سیاست کا مرکزی ستون ہے' اور پھر خود اپنے ملک میں وہ اُس بہیمانہ سلوک کا مشاہدہ کرتا ہے جو ہندو ہریجن کے خلاف روا رکھتا ہے' اُس گہری خلیج کو دیکھتا ہے جو ہندو اور مسلمان کے درمیان حائل ہے اور شب و روز وسیع تر ہوتی جاتی ہے "حق آزادی اپنے لئے، لیکن دوسرے کے لئے نہیں!" یہ بھی تو فسطائیت کا ایک پسندیدہ حربہ ہے' جب ایک حساس ادیب یہ سب کچھ دیکھتا ہے' تو کیسے ممکن ہے' کہ اُس کا ذہن، اُس کا شعور' اُس کا ادراک' اِن متضاد قوتوں کی پیکار سے بچ سکے اور وہ اُس المناک ثنویت میں مبتلا نہ ہو جائے جس کے عناصر اُس کی خارجی دنیا میں موجود ہیں۔

لیکن یہ حالات ہندوستانی ادیبوں کی دنیا ہی تک محدود نہیں' روس اور چین کو چھوڑ کر بیشتر مغربی اور ایشیائی ممالک کے ادیبوں کو ان حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے' اور وہ بھی لازماً اسی تضاد کی عکاسی کرتے ہیں، کیونکہ خود اُن کی دنیاؤں میں استعماریت، نسلی امتیاز اور وہ تمام نفرت انگیز عناصر پائے جاتے ہیں۔ کہ جو جمہوریوں اور فسطائیوں کے درمیان مابہ الامتیاز سمجھے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جہاں ہسپانیہ کی گزشتہ لڑائی نے امریکی، انگریزی، فرانسیسی اور دیگر یورپی ممالک کے ادیبوں میں اور اُن کے ادبی کارناموں میں ایک نئی روح دوڑا دی تھی، موجودہ جنگ نے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اُن کی تخلیقی قوتوں کو سلب کر لیا ہے اور وہ اس وقت تک ایک سطر ایک ایسا مصرع بھی نہیں کہہ سکے جسے ادب عالیہ میں شمار کیا جا سکے' غالباً وہ بھی اسی تضاد کا شکار ہیں جس کا ذکر اُوپر کیا جا چکا ہے' اور اپنے وطنی ضمیر سے مطمئن نہیں ہیں، بقول سیسل ڈے لیوس:

It is The Logic of our Times

No Subject For immortal Verse
That We Who Lined by honest dreams
Should defend The Bad against The Worse

ہسپانیہ کی خانہ جنگی دراصل موجودہ جنگِ عظیم کی ابتدا تھی، اُس وقت ترقی پسند ادیبوں کے ادراک فروا نے موقع کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا، اُن کے تاریخی شعور نے اُنہیں اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا، کہ فسطائیت کا یہ بگولہ جو آج سپین میں محوریوں کی سازشوں کی بدولت اُٹھا ہے، ایک دن جنگِ عظیم کی صورت اختیار کر کے رہے گا۔ اگر ابھی سے دُنیا کو اس کے متعلق خبردار نہ کیا گیا وہ جانتے تھے کہ یہ بادِ مخالف ایک دن اُس تاریک طوفان میں بدل جائے گی جو انسانی نسل کو سالہا سال خاک و خون کے بستر پہ تڑپائے گی اور اُسے کراہتی ہوئی جانکنی کی اذیت میں مبتلا کر دے گی، وہ نوعِ انسانی کو اس خوفناک خطرے سے بچانا چاہتے تھے، اور اسے اس تاریک طوفان سے محفوظ کر دینا چاہتے تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے اور اس میں نہ صرف اُن کی عقل بلکہ اُن کی جبلّت اور شاید وہ چھٹی حس جو ہر ادیب میں مستور ہوتی ہے، اُن کی راہنمائی کر رہی تھی اور انہیں آگاہ کر رہی تھی کہ اگر اس وقت انہوں نے دُنیا کو اس خطرے سے آگاہ نہ کیا اور اُسے بچانے کی کوشش نہ کی، تو پھر یہ دنیا جنگ کی مہیب تباہی سے نہ بچ سکے گی، سپین کی خانہ جنگی ترقی پسند ادیبوں کا پہلا محاربۂ عظیم تھا اور اس مرحلے پر اُن کے فکر اور جذبے، عقل اور جبلّت، شعور اور تحت الشعور میں وہ مکمل مطابقت تھی جس نے انٹرنیشنل بریگیڈ کی تعمیر کی، جس نے ترقی پسندوں کے پیغام کو دنیا بھر میں پھیلا دیا، جس نے سپین کو لورکا ایسا شاعر دیا، جس نے امریکی مصنف ہیمنگ کو *For Whom the Bell Tolls* ایسا ناول تخلیق کرنے پر مجبور کیا، جس نے ہنگری میں کاسلر، ہندوستان میں ملک راج آنند، سجاد ظہیر، احمد علی اور انگریزی ادب میں اوڈن، سپنڈر، رالف فاکس، ڈے لیوس، میک نیس کاڈول ایسے ادیبوں کو عزت بخشی، آج بھی ان میں سے بیشتر لوگ لکھ رہے ہیں، کچھ پراپگنڈا ———، کچھ فلسفہ، کچھ وعظ، کچھ رومانیت، کئی ایک یوگا کے مسائل حل کر رہے ہیں، چند خاموش بیٹھے ہیں، منہ میں اُنگلی ڈالے حیرت سے تک رہے ہیں، بعض لوگ اچھے ادب کی تخلیق بھی کر رہے ہیں، لیکن ایسا ادب مفقود ہے جو جنگ کے تلخ ماحول کی عکاسی کرتا ہو، جو فسطائیت کے خلاف اُس شدّتِ احساس، جذباتی ترنّم اور حسنِ تخلیق سے متصف ہو جو ہمیں شولوخوف، ایلیا اہرن برگ، اور واندا وسیلیوسکا کی تحریروں میں نمایاں نظر آتا ہے، وجہ ظاہر ہے۔ *To Difend the Bead agauirt the Worse* عقلیت سب سمجھتی ہے، اور

اُسے اپنی پُوری قوت سے بیان کرنا چاہتی ہے، لیکن اس پیچیدہ حسِ ادراک کے متوازی ایک مختلف جذباتی رَو کار فرما ہے، جو کچھ اور چاہتی ہے، یا کچھ اور بھی چاہتی ہے، اور یہی وہ خوفناک ذہنی کشمکش ہے، وہ کربناک فکری اور جذباتی ثنویت ہے جس کا میں نے اوپر اشارہ کیا جو ہمارے بیشتر ادیبوں مشرقی اور مغربی دونوں پر حاوی ہے، جنہوں نے یا تو اُن کے قلم کو اس حد تک زنگ آلود کر دیا ہے کہ وہ اس موضوع پر کچھ لکھ ہی نہیں سکتے، اور اگر کچھ لکھتے ہیں تو وہ ادبِ عالیہ میں شمار ہونے کے قابل نہیں ہوتا، اور اِس لئے ادبی اعتبار سے درخورِ اعتنا بھی نہیں ہوتا، کیونکہ یہاں عقل اور جذبات ہم آہنگ نہیں، ان میں وہ باہمی ربط، تسلسل، امتزاج، ایک دوسرے میں مدغم ہونے کی وہ کیفیت موجود نہیں کہ جس کے بغیر اچھے ادب کی تعمیر نہیں ہو سکتی، ہاں رُوسی ادب اور ایک حد تک چینی ادب بھی اِس سے مستثنےٰ ہیں، کیونکہ وہاں یہ صورتِ حال نہیں، وہاں کا ماحول مختلف ہے اور ادبِ عالیہ کی تخلیق کے لئے ساز گار ہے، موجودہ جنگ نے وہاں کے ادیبوں کو داخلی اور خارجی، شعوری اور لاشعوری، فکری اور جذباتی اعتبار سے ایک ایسے سنگم پر لا کھڑا کیا ہے کہ جہاں پر ایک سچے حقیقت پناہ زندہ و پائندہ، حیات افروز ادب کی تخلیق ہو سکتی ہے۔ "گاؤں"۔ "محاصرہ سبسطاپول"۔ "سقوطِ پیرس"۔ "نفرت" ایسی رُوسی تخلیقات ہیں کہ جن پر انسانی ادب ہمیشہ کے لئے ناز کر سکتا ہے، دوسرے ملکوں کے ادیبوں کو یہ فخر حاصل نہیں ہُوا، کیونکہ اُن کے ہاں اُن کے ماحول کے پیشِ نظر وہ ربط، وہ امتزاج، وہ ہم آہنگی وہ سنگم ممکن نہیں، اور ہندوستان میں بھی جہاں پر یہ معجزہ ظہور میں آیا ہے، وہاں پر یہ داخلی تضاد، یہ انتشار، یہ بے ربطی یہ ثنویت غائب ہے، مثال کے طور پر "قحطِ بنگال" کا واقعہ، جس نے برق وار ہماری عقل اور جذباتی واردات کو ایک سطح پر لا کر وہ ہم آہنگی پیدا کی گویا کوندے کی ایک ہی لپک سے سارے ہندوستانی ادیبوں کے دل و دماغ روشن ہو گئے ہر صوبے کے ادیبوں نے اس موضوع پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے، اور اکثر بہت اچھا لکھا ہے، اس مسئلے پر اکثر ایسا بھی ہُوا ہے کہ ترقی پسند اور غیر ترقی پسند کی تفریق بھی باقی نہیں رہی، چنانچہ ہماری زبان میں جن ادیبوں نے اِس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے وہ مختلف ادبی تحریکوں سے وابستہ ہیں، یا مختلف النوع ادبی قدروں کے پرستار ہیں، اس پر بھی جگر مراد آبادی، حفیظ ہوشیار پوری، احمد ندیم قاسمی، دیوندر ستیارتھی، اختر الایمان، اور دیگر ادیبوں کے رشحاتِ قلم ملاحظہ فرمائیے، ہندوستان کی چیخ سنائی دے گی اور جب تک ان امور کا حل مہیا نہیں ہوتا ہمیشہ سنائی دیتی رہے گی، کیونکہ یہ مسئلہ ہمارے لئے عقلی اور جذباتی مطابقت رکھتا ہے، یہ وہ منفرد نقطۂ وحدت ہے، جہاں خیالات اور جذبات ہم سطح ہو جاتے ہیں اور بلند، خلاق، خیال افروز ادب ظہور میں آتا ہے!

مغربی اور ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں کے افکار کی اجتماعی مماثلت کے باوجود ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ان دونوں کی تخلیقات کے مخرج مختلف ہیں، وہاں تضاد اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ وہ لوگ خود آزاد ہیں لیکن غالباً دوسرے ملکوں کو آزادی دینے کے لئے تیار نہیں، یا ان کی آزادی کے بارے میں کوئی واضح تخیل نہیں رکھتے، اور ذہنی پس وپیش سے کام لیتے ہیں، یہاں ہم دوسرے ملکوں میں جمہوریت کی بقا کے لئے لڑ رہے ہیں اور خود اپنے ملک میں جمہوریت کا فقدان پاتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ سپین میں صرف ہمیں شکست نہیں ہوئی، سپین کی شکست در اصل انسانی ضمیر کی شکست تھی، آگے بڑھتی ہوئی زندگی کی شکست تھی، اُس حسین آفاقی نظام کی شکست تھی جس کے حصول کے لئے دنیا کے عوام آج تک بے قرار ہیں، ترقی پسندوں نے اس شکست کی تلخکامی کو محسوس کیا اور گو اس ہار نے اُن کے حوصلے پست نہیں کئے لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ وقتی طور پر اُن کی تحریروں میں اپنے آدرش کی دُوری کا احساس قوی تر ہو گیا، اور وہ اُس بے کیف تھکن اور مضمحل جاں گداز کیفیت سے دوچار ہوئے۔ جو ہر شکست کا لازمہ ہے چاہے یہ شکست کتنی ہی وقتی اور عارضی کیوں نہ ہو، جنگ قریب آ رہی تھی اور اُسے روکنے کی تمام مساعی بے سود ثابت ہوئی تھیں، اس لئے یہ بھی ناگزیر تھا کہ نئے ادیب اپنے ادبی تجربات میں اس خونیں مستقبل کی آہٹ اور دھمک کو صاف طور پر محسوس کریں، چنانچہ آدرش کی دُوری کے احساس کے ساتھ آنیوالی جنگ اور جنگ سے وابستہ موت کے لابدی احساس سے اُن کا تخیل تاریک تر ہوتا گیا۔ یورپی ادب میں تو باستثنائے چند اس کا نتیجہ پسپائیت کی صورت میں نمودار ہوا، لیکن انگریزی اور امریکی ادیبوں نے اکثر اس رجعتِ قہقہری کو قبول نہیں کیا (اور بعد میں انہی ادیبوں کے ممالک نے روس کے ساتھ مل کر فسطائیت کیخلاف متحدہ محاذ قائم کیا) لیکن پھر بھی ان ادیبوں کے تخیلہ پر موت کا تصور اکثر غالب آ جاتا ہے، کیونکہ جنگ سے کوئی حساس ادیب خوش نہیں ہوتا، جنگ اکثر حالتوں میں ناگزیر سہی لیکن اس سے کسی انسان کو مسرت حاصل نہیں ہوتی، کیونکہ جب جان مرتا ہے یا امجد دم توڑتا ہے، یا موہن کی موت واقع ہوتی ہے، تو یہ صرف ایک سپاہی کی موت نہیں ہوتی، ایک واحد ہستی، ایک اکائی، ایک منفرد شخصیت کی موت نہیں ہوتی، ایک آدمی کے مرنے سے شاید ایک دنیا مرتی ہے، جس میں حسن و عشق کی ہزار نیرنگیاں مستور ہوتی ہیں، ملک اور انسانیت کی خدمت کے سینکڑوں ارادے ہوتے ہیں، شاید نئی قدروں سے شناسا ہونے اور نئے اخلاق کی سربلندیوں کو چھو لینے کی نابخت آرزوئیں ہوتی ہیں، اور اگر یہ سب کچھ نہیں ہوتا تو وہ تمام چھوٹی چھوٹی بظاہر معمولی لیکن بباطن انتہائی

معروضات

بیش قیمت جزویاتِ زندگی ضرور ہوتی ہیں جو ہر انسان کی زندگی کو چاہے وہ کتنا ہی فاسق و فاجر کیوں نہ ہو ہمارے لئے عزیز بناتی ہیں، کھانے کی آرزو۔ ایک چھوٹے سے گھر میں رہنے کی آرزو۔ جوان ہونٹوں کو چومنے کی آرزو فرشِ زمیں پہ لیٹے لیٹے بلند آسمان کی نیلی گہرائیوں کو تکنے کی آرزو، اور اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی ہزاروں لاکھوں آرزوئیں، اس لئے یہ بالکل سچ ہے کہ جب ایک سپاہی مرتا ہے تو ایک دُنیا مرتی ہے، ایک خیال مرتا ہے، ایک امید مرتی ہے، ایک کتاب مرتی ہے، ایک نئی اپج، سائنس کی کوئی نئی ایجاد، حُسن، سچائی اور دیانت کا ایک ناتخلیق نمونہ مرجاتا ہے، اور دنیا کو پہلے سے زیادہ، غریب، نادار اور ویران چھوڑ جاتا ہے! اسی لئے تو جہاں ترقی پسند ادیبوں کے افکار میں موت کا تصور غالب ہے، وہاں اس بہیمیت کے خلاف اور اس نظامِ زندگی کی ظلمت کے خلاف جو اس بہیمیت کو ممکن بناتی ہے اور ہر بیسویں پچیسویں سال ہمارے دانشور سیاست دانوں اور سرمایہ پرست بینکروں کے طفیل انسانی خون کی ندیاں بہاتی ہے، اک مبہم صدائے احتجاج بھی موجود ہے، نہ صرف امریکی اور انگریزی ادیبوں کے افکار میں بلکہ خود ہندوستانی ادیبوں کے فن پاروں میں یہ چیز صاف صاف نظر آتی ہے ہندوستانی ادیب اگر بلاواسطہ جنگ کا ذکر نہیں کرتے تو بالواسطہ طور پر اُن کے ہاں موت کا ذکر اکثر آتا ہے۔ اور اُن کی تخلیقات میں اکثر موت کے سائے تھرتھراتے رہتے ہیں، اور اکثر اوقات موت کا تصوّر، زیست پر اور تھکن کا احساس توانائی پر غالب آجاتا ہے جسے ہم یاسیت پسندی سے اِس لئے تعبیر نہیں کر سکتے، کہ بالعموم انہی تخلیقات میں تاریکی کے سینے سے روشنی کی کرن بھی پھوٹتی ہے۔ اور اپنے تاریک ماحول سے بیزاری اور اسے بدل دینے کی آرزو کا احتجاجیہ زمزمہ بھی سنائی دیتا ہے!

جنگ کے مفکرانہ پہلوؤں سے قطع نظر دوسرے سماجی شعبوں سے، بالخصوص اُن تمام مسائل سے جو ہماری قومی اور ملّی زندگی میں الجھن اور انتشار کا باعث ہیں، ہمارے ادیبوں نے زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا ہے، وطنی امور کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو بچا ہو جسے ہمارے شاعروں، فسانہ نگاروں، مضمون نگاروں اور مزاح نویسوں نے تجرید، تحلیل اور تجزیہ کی تثلیث میں احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش نہ کی ہو، مذہب، تاریخ، کلچر، روایت، سیاست، تعلیم، اوہام، ہماری سماجی زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جسے انہوں نے اپنے تخیل کی جولانگہ نہ بنایا ہو اور جسے انہوں نے صحیح تاریخی قدروں سے نہ پرکھا ہو، یہی وجہ ہے کہ آج ملک کے فہمیدہ اور صاحب دانش طبقوں میں ان کی تحریروں کو ایک خاص وقعت حاصل ہے اور وہ اِن ادیبوں کے ذوقِ عمل کے معترف

ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ ادیب ہمیشہ اپنے فرائض سے، کما حقہٗ عہدہ برا ہوتے رہیں، اس لئے وہ لوگ ان ادیبوں کی ہمت افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے یہاں تک کہ وہ ان لغزشوں کو بھی معاف کر دیتے ہیں جو ابتداً ہر نئی تحریک اور اس کے چلانے والوں سے اپنے جوشِ عمل یا ناتجربہ کاری کی بنا پر سرزد ہوتی ہیں۔

بخلاف اس کے وہ لوگ بھی ہیں جو گویا اس تحریک کی جا و بیجا مخالفت پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں، ان میں سے بیشتر ایسے لوگ ہیں جو سانتی ادب کے پرستار ہیں اور جواب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ اُردو فقط قصۂ گل و بلبل، حکایتِ رُخِ زیبا اور داستانِ رامش و رنگ ہے اور اس میں کوئی دُوسرا مضمون کھپانا زبان اور کلچر اور اس کے مزاج کے ساتھ غداری کا ثبوت دینا ہے اور اُن تمام روایتوں کو مسترد کر دینا ہے، جنہوں نے اس زبان کی نشوونما میں معتد بہ حصہ لیا ہے، ہمیں ان بزرگوں کی نیت یا خلوص پر کوئی شبہ نہیں، وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، اپنے نظریوں کی بنا پر دیانتداری سے کہہ رہے ہیں، اس لئے کہ وہ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ ہم لوگ زبان اور ادب کی روایت کو مٹا رہے ہیں، اُس کی ہیئت کو بازاری، اور عمومی بنا رہے ہیں اور اُس کی موضوعی یگانگت کو تباہ و برباد کر رہے ہیں،

یہاں ہمیں ان بزرگوں کی خدمت میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آپ کی دیانت مسلّم، لیکن آپ کا مشاہدہ غلط بینی پر مبنی ہے، ہم نے کبھی اپنی زبان کے ماضی کو، اُس کی شاندار روایات کو، اور اُن تخلیقات کو نہیں بھلایا۔ کیونکہ ماضی ہمارا ہے۔ وہ ہمارے ادبی تسلسل اور کلچر کی اک تاریخی کڑی ہے، حال اور مستقبل اُسی ماضی کے بہاؤ کا لازم ہیں جس کے سنگِ میل میر، غالب، انیس، مومن، نظیر ایسے قادر الکلام شاعر ہیں، حال اور مستقبل کی اضافی اقدار کے تعین کے لئے ماضی کا مطالعہ بے حد ضروری ہے، خاص طور پر اُن ادیبوں کا مطالعہ جنہوں نے ہماری زبان کی مشاطگی میں اپنی عمر صرف کر دی، جنہوں نے اپنے عصر کی ترجمانی کرتے ہوئے اسے حقیقت پناہ بنایا، اور اُن رجحانات کو آگے بڑھایا کہ جن کی مدد سے آج ہم اس منزل پر پہنچ سکے ہیں جب زندگی بدل جاتی ہے تو آرٹ بھی بدل جاتا ہے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ اسے کوئی نہیں جھٹلا سکتا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ زندگی بدلتے ہوئے بھی پیہم رواں ہے، اور ماضی، حال اور مستقبل کو ایک تاریخی تسلسل میں باندھے رکھتی ہے۔ اسلئے اپنے ادب کے پورے ماضی کی تکذیب و تحقیر ترقی پسندوں سے تو ممکن نہیں، بے شک ان لوگوں کا شعری اسلوب نیا ہے، افسانہ نیا ہے، موضوعِ سخن نیا ہے، لیکن اس پر بھی وہ حکایتِ رُخِ زیبا سے غافل نہیں، اُنکی داستانوں میں اب بھی رامش و رنگ کا کیف و کم موجود ہے، ہاں ساقی بدل گئے ہیں، جام بدل گئے ہیں، خود شراب بدل

گئی ہے، لیکن یہ تو زندگی کا خاصہ ہے، کیا کیا جائے، مجبوری ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ آپ بدلتی ہوئی زندگی کا ساتھ نہیں دینا چاہتے، اور اُسے ترقی کی طرف تیز گام ہونے کی بجائے رجعتِ قہقہری کی دعوت دے رہے ہیں، اور ہم اس تیز گامی سے بھی مطمئن نہیں نظر آتے۔

پھر یہ کیا غضب ہے کہ وہ بزرگ بھی جو یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اُردو ادب کا بیشتر سرمایہ اور خود اُن کا اپنا ادبی سرمایہ جنسی واردات پر مشتمل ہے، ترقی پسند ادب پر اس لئے خندہ زن ہیں کہ اس کے عناصرِ ترکیبی میں جنسیات اور اِس سے متعلق مسائل کو دخل ہے۔ جنسیات کا ذکر ہر ادب میں اُس وقت تک اہم رہیگا جب تک اس کی اہمیت زندگی میں باقی رہتی ہے۔ ہمارے ادیب حسِ توازن کو ملحوظِ خاطر رکھ کر جنسی واردات کو اس سے سرِ مو زیادہ اہمیت نہیں دیتے کہ جو ان معاملات کو آج ہماری شہری سماجی زندگی میں حاصل ہے، لیکن وہ جنسی امور پر بحث کرتے ہوئے اقتصادی، معاشری، سیاسی اور نفسیاتی مسایل بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔ بعض ادیبوں کو نفسیاتی مسائل کے بیان میں زیادہ لطف آتا ہے، بعض ادیب معاشری اور سیاسی شعبوں کی طرف زیادہ توجہ اور دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں، بعض اقتصادی اور تاریخی امور پر زور رکھتے ہیں، بعض صرف جنسیات پر لکھتے ہیں۔ موضوع انتخاب تو طبعی رجحان اور شخصی جوہر کی نوعیت پر منحصر ہے، لیکن بہ حیثیتِ مجموعی، نئے ادب میں جنسیات کا عنصر پہلے سے بہت کم ہے۔

نئے جنسی ادب میں غالباً جو چیز سامنتی پرستاروں کو کھٹکتی ہے، وہ اس کی بے باکی اور آزادی ہے جسے وہ اکثر "عریانی" سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن ہے یہ دراصل آزادی ہی جو نئے ادیب نے سامنتی محدودیت اور اس کے روائتی آداب کو توڑ کر حاصل کی ہے اور جسے اب وہ کسی قیمت پر کھونے کو تیار نہیں۔ سامنتی ادب میں معشوق بے رحم تھا، عاشق بے ریا، دربان ہوشیار، یا محبوب رنڈی، عاشق جوتیاں چٹخانے والا، رقیب روسیاہ، یہ ایسی پیٹی ہوئی تثلیث تھی، کہ جس کی بے کیف معاملہ بندی، اور جامد کنایوں میں اب کوئی جان باقی نہ رہی تھی، اِس لئے کہ زندگی نے پُرانے لبادے اُتار پھینکے تھے، وہ مہذب اور متمدن امراؤ جان آدا صنعتی دور میں منٹو کی "ہتک" بن گئی تھی، وہ چلمن کی اوٹ سے جھانکنے والی محبوبہ اب عصمت کی کالج کی شوخ لڑکی اور عسکری کی "حرامجادی" بن گئی تھی۔ ساقی نے جام چھوڑ کر درانتی سنبھال لی تھی اور اب وہ ندیم کی نظموں میں بیریوں کے سائے تلے گیت گاتی پھرتی تھی، دربار ختم ہو رہے تھے، کارخانے شروع ہو رہے تھے، نئی زندگی، نئی تصویریں، نئے اشارے —
سامنتی ادب نے جہاں جنس کے موضوع کو محدود کر دیا تھا، وہاں اسکی زبان اور اشاروں کے گرد بھی تکلفاتی حصار

کھینچ دیئے تھے، اب یہ حصار ٹوٹ چکے، اب جنسی معاملات پر آزادی سے گفتگو ہوگی، صحتمند نظریوں کی روشنی میں آپ کی مخفی، گھُٹی گھُٹی، دبی دبی جنسی خواہشوں، ارادوں، رجحانات، محرکات کا تجزیہ کیا جائیگا، کہ اس کے بغیر آپ کی داخلی بیماری کی اصلاح ممکن نہیں، بہت عرصے تک آپ نے اسے شرافت کے لبادے میں چھپائے رکھا، لیکن اب تو اس سے بُو آنے لگی ہے جی۔ یہ وہی "مٹکو کی بُو" ہے، جس سے آپ اتنا بدکتے ہیں، یہ بُو آپ ہی کے جسم سے آرہی ہے، یہ وہی "لحاف" ہے جسے آپ خود اوڑھے ہوئے ہیں، متعفن، غلیظ لحاف! آپ اسے اُتار پھینکیے، "نہ بُو رہے گی نہ لحاف" لیکن جب تک آپ ایسا نہیں کرتے یہ لوگ برابر کہتے رہیں گے، اور بھی زیادہ سختی، تندی بے باکی، آزادی کے ساتھ، آزادی جسے آپ "عریاں" کہتے ہیں!

جنسی موضوعات کے سلسلے میں قدامت پرست حضرات نے ترقی پسند ادیبوں کو طرح طرح سے مطعون کیا ہے، اور پینترے بدل بدل کر مضحک دلیل بازی سے اپنے نگارخانۂ تنقید کو سجایا ہے، عریانی کا ذکر ابھی ہو چکا، فحاشی کا تجزیہ کرنا ہے، الزام وارد ہوتا ہے کہ نئے ادیب فحاشی کے مبلغ ہیں، کیونکہ وہ اپنی تحریروں میں عورت اور مرد کے جسموں کا ذکر اس قدر بے باکی سے کرتے ہیں اور مختلف اعضائے انسانی کے بیان میں اُن اشاروں اور کنایوں اور تمثیلات سے کام لیتے ہیں کہ ہمارے شریفانہ جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں اور دامن صبر و شکیب پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔

عورت اور مرد کے اجسام کا ذکر اور اُن کے جنسی تعلقات کا تجزیہ ادب میں کوئی نئی چیز نہیں، اس سلسلے میں اُردو کے اساتذۂ قدیم کا کلام تمثیلاً پیش کیا جا سکتا ہے اور نہ صرف اُردو بلکہ دنیا کی ہر متمدن زبان کے بہترین ادب میں سے اس کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، صرف ادب ہی پر کیا موقوف ہے۔ فنونِ لطیفہ کی دیگر اصناف میں بھی ان اجسام اور تعلقات کی ترجمانی کی گئی ہے، رقص، مصوری، سنگیت، سنگ تراشی، فنونِ لطیفہ کے ہر شعبے میں ان کی عکاسی کی گئی ہے اور جب تک عورت اور مرد رہیں گے یہ عکاسی ہوتی رہے گی، اور جنسی موضوعات اور انسانی اجسام اور ان کے اعضا سے جو قدرتی صحت مند نشاط دابستہ ہے اُس سے ہر قاری کا ذہن متاثر ہوتا رہے گا، اس تاثر سے صرف آپ کی موت، خودکشی یا نامردی ہی آپ کو بچا سکتی ہے اور کسی صورت میں یہ ممکن نہیں، جھوٹ بولنے اور ایک جھوٹے اخلاق کا واسطہ دینے سے کیا فائدہ؟

لیکن اگر یہ تاثر ایک سچے، صحت مند نشاط سے بڑھ جاتا ہے، اور ایک مریضانہ، ترغیبی پہلو اختیار کر لیتا ہے تو واقعی اس کے نتائج مضر ثابت ہو سکتے ہیں کیونکہ ایک توانا، جاندار، مسرت آگیں سماج کی بنیاد تعیش پسندی کی

سے نہیں بلکہ تزکیہ نفس سے مضبوط ہوتی ہے (بڑے موذی کو مارا نفس امّارہ کو گر مارا) یہ ترغیبی پہلو تو ہمارے نئے ادیبوں میں سرے سے ملتا نہیں، گو اساتذہ قدیم میں اس کے بیشتر نمونے ملتے ہیں جو غالباً جاگیرداروں اور درباروں کے لئے ممسک دواؤں کا کام دیتے تھے، بلکہ مجھے تو یہ شکوہ ہے کہ ہمارے ادیبوں کے ہاں وہ صحت مند نشاط بھی مفقود ہے جو اکثر ترقی پسند روسی، انگریزی، امریکی، فرانسیسی ادیبوں کی تخلیقات میں نظر آتا ہے ہمارے نئے ادیب تو اکثر اوقات عورت اور مرد کے اجسام کا اس انداز میں ذکر کرتے ہیں کہ ترغیب تو درکنار الٹا گھن آنے لگتی ہے۔ وہ بسا اوقات حسن کی تشکیل نہیں کرتے، جیومیٹری کی اشکال پیش کرتے ہیں صحت مند جسم نہیں دکھاتے، بیمار جسموں کو ننگا کرتے ہیں تاکہ آپ ان کے گلے سڑے اعضا، پیپ اور لہو اور رستے ہوئے ناسوروں کو دیکھ سکیں۔ اگر یہ فحاشی ہے تو ہر ڈاکٹر فحش پسند ہے۔

نئے جنسی ادب سے بڑے بوڑھے بزرگ جو اپنی رومانیت میں زندگی کی ساری بہاریں لوٹ چکے، تو بدکتے ہی تھے لیکن اب یہ ادب سکول کے لڑکے اور لڑکیوں کے لئے بھی برا سمجھا جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہمیں ان موضوعات پر نہیں لکھنا چاہیئے کیونکہ اس سے سکول کے لڑکے اور لڑکیوں کے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے لیکن نئے ادیبوں نے یہ کبھی دعوےٰ نہیں کیا کہ وہ سکول کے لڑکے اور لڑکیوں کے لئے لکھتے ہیں، ہر ملک میں نابالغ اذہان کے لئے الگ ادب ہوتا ہے، اور اگر سکول کے نصاب میں شیکسپیئر اور شیلے ایسے مستند ادیب بھی شامل کئے جاتے ہیں تو ان کے کلام کا سختی سے انتخاب کیا جاتا ہے، پھر آپ یہی سلوک جوش، منٹو اور عصمت سے کیوں روا نہیں رکھتے؟ آپ کو کون روکتا ہے، بالخصوص جب ان لوگوں نے خود کبھی یہ دعوےٰ نہیں کیا کہ وہ بچوں یا ان لڑکے لڑکیوں کے لئے لکھتے ہیں جو ابھی جذباتی اعتبار سے خام کار ہیں اور آسانی سے مشتعل ہو سکتے ہیں، اس قسم کے ادب کے حصول کے لئے آپ دار الاشاعت لاہور یا جامعہ ملیہ دہلی سے رجوع فرمایئے جن کی کاوشیں اس سلسلے میں ہر لحاظ سے لائق تحسین ہیں، گو مجھے افسوس ہے کہ ہم میں سے بعض ادیب صرف بچوں یا لڑکے لڑکیوں ہی کے لئے کیوں نہیں لکھتے، امریکہ میں تو جنسی تعلیم بارہ برس کی عمر ہی سے سکول میں شروع کی جاتی ہے لیکن ہندوستانی تعلیمی اداروں نے ابھی تک اس ضروری موضوع کی طرف توجہ نہیں دی، درحالیکہ ہندوستانی بچے امریکن بچوں کے مقابلے پر بہت جلد جنسی بلوغت کی طرف بڑھتے ہیں، جنسی تعلیم سے قطع نظر، ترقی پسند ادب کا، زبان، تاریخ، سائنس، جغرافیہ، معاشیات، الغرض نصاب کے ہر شعبے کے بارے میں مخصوص نقطۂ نگاہ ہے اور مختلف انداز بیان ہے، مجھے یاد ہے ۱۹۳۷ء میں ترقی پسند مصنفین کا کل ہند اجلاس جو کلکتے میں ہوا

تھا۔ وہاں ملک راج آنند اور سجاد ظہیر اور دیگر رفقا کے ایما سے اِس قسم کی ایک تحریک بھی پیش کی گئی تھی۔
اور اب ۱۹۴۴ء میں اردو کانگرس حیدر آباد کے موقعے پر بھی اِس قسم کی ایک قرارداد منظور کی گئی ہے لیکن ابھی تک ہمارے ادیبوں نے اِس موضوع سے زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ بچوں کی تعلیم سے لاپرواہی کا نتیجہ ملک اور قوم اور خود ترقی پسند ادب کے مستقبل کے لئے مفید ثابت نہ ہوگا۔

اس کے علاوہ ہمارے ادب میں ایک اور خامی ہے جس پر بار بار نگاہ جاتی ہے، مزدور اور کسان! ترقی پسند ادب کا مرکز ضرور سمجھا جاتا ہے صنعتی مزدور اور کھیتوں میں کام کرنے والا مزدور لیکن گذشتہ پانچ سال کے تجربات کے بعد لازماً اس نتیجے پر پہنچنا پڑتا ہے کہ ترقی کے بہت سے منازل طے کرنے کے بعد بھی ہماری تحریک کے موجودہ عناصر اپنے مرکزی نصب العین سے بہت دور ہیں، کہنے کو تو ہم یہ کہہ جاتے ہیں کہ ہندوستان اپنے دیہات میں رہتا ہے لیکن جب ہم لکھنے پر آتے ہیں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان دیہات میں نہیں شہروں میں رہتا ہے گذشتہ چند سال میں اُردو نظم اور نثر میں جو مرقعے پیش کئے گئے ہیں اُن میں سے بیشتر شہری زندگی سے متعلق ہیں۔ ان مرقعوں کی ترقی پسندی محل نظر نہیں، ان کے ادب عالیہ ہونے میں بھی کسی کو شبہ نہیں، ان کی سچائی، خلوص و دیانت، فن کاری اور سماجی بغاوت سے بھی ہمیں انکار نہیں، لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جہاں تک ہندوستان کے مزدوروں اور کسانوں کی زندگی کی ترجمانی کا تعلق ہے، جہاں تک اُن کی مسرتوں، اُن کے دُکھ اور درد، اُن کے سوچنے سمجھنے، بات کرنے، اپنے مسائل اور موجودہ مسائل سے بحث کرنے کا تعلق ہے اس کا اک حقیر سا شائبہ ہی ہمارے ادب میں نظر آتا ہے، یہ ادب شہری زندگی کے صبر آزما بحران کا پتہ تو ضرور دیتا ہے لیکن کیا یہ بحران ہماری شہری زندگی تک محدود ہے، کیا ہمارے دیہات میں اس بحران کا وہ کربناک اضطراب اور تشنج موجود نہیں۔ جس کا احساس شہری زندگی میں ہر لحظہ ہمارے ادیبوں کو ہوتا رہتا ہے؟ گذشتہ پانچ سال کے ادب پر نگاہ ڈالئے ایک طرف تو سامنتی ادب کے پرستار اور علمبردار ہیں جو ابھی تک گل و بلبل اور شربت وصل کا رونا روئے جاتے ہیں۔ خیر یہ تو سادھوں اور فقیروں کے مجاور ہیں اس لئے سزاوار نہیں، لیکن ہم لوگ کیوں اپنے بلند بانگ دعووں کے باوجود شہری گلیوں کی موریوں میں گھسے ہوئے ہیں، کیا سماجی عفونت صرف شہروں میں ہے۔ جن میں ہندوستان کی پچیس فیصدی سے زیادہ آبادی نہیں رہتی، اور پھر شہری زندگی کے مسائل کے بیان میں بھی ہم بالعموم صنعتی مزدوروں کو کیوں نظر انداز کر جاتے ہیں؟ لیکن ترقی پسندوں کے نشتر کی دیہات کو ضرورت نہیں؟ پھر ایسا کیوں ہے؟ کہ ہر نظم اور ہر افسانے اور ہر ڈرامے اور ہر طنزیہ اسکیچ میں بار بار اسی زندگی کے خاکے پیش کئے جاتے ہیں۔ اور اپنے

زاویۂ نگاہ کو ایک مرمریں گنبد سے نکال کر دوسرے مرمریں گنبد میں بند کیا جا رہا ہے! شاید اسکی وجہ جواز یہ ہے، کہ بہت سے ادیب شہری سماج کے افراد میں متوسط طبقے کی متعفن فضا میں سانس لیتے ہیں، اور اس لئے اپنی تخلیقات کا خمیر بھی اُس مٹی سے اُٹھاتے ہیں کہ جس سے اُن کا طبقاتی ماحول رچا ہوا ہے۔ یہ صحیح سہی، لیکن اس کے باوجود گنتی کے چند ایسے افراد ضرور باقی رہتے ہیں، جو یا تو خود کسی گاؤں میں رہتے ہیں یا کسی گاؤں کے رہنے والے ہیں، اور اُنہیں یوپی، پنجاب، بہار اور دیگر صوبوں کے مزدوروں اور کسانوں کی زندگی کا مطالعہ اور عملی شعور حاصل ہے، اور کئی بار اُنہوں نے اپنی ژرف نگاہی سے دیہاتی زندگی سے متعلق چند بصیرت افروز انقلابی خاکے بھی تعمیر کئے ہیں۔ اس لئے مجھے یہ باور کرنے میں بھی تامل ہوتا ہے کہ اب اُن کے تجربوں کی کان اس قدر بانجھ ہو گئی ہے کہ اب وہ اس ضمن میں اور کچھ نہیں کہہ سکتے! اور پھر ان ادیبوں کے علاوہ ہمارے ادب کے وہ سردار اور کاہن بھی موجود ہیں جو دن رات صنعتی مزدوروں کے ساتھ رہتے ہیں، اُن کی خاموشی بھی معنی سے خالی نہیں، کیا اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ متوسط طبقے کے ادیب اپنی ترقی پسندی کے باوجود اپنے جماعتی حصار سے بالکل باہر نہیں نکلے، باہر نکلنا ہی نہیں چاہتے، اور بقول سبط حسن ادب میں مزدوروں اور کسانوں کی ترجمانی کے لئے کسی مزدور اور کسان ادیب ہی کو آنا پڑیگا؟ ۔۔۔ نظم میں بھی اکثر مزدور اور کسان کا ذکر اک ایسے اشاراتی اور کنایاتی انداز میں آتا ہے جیسے وہ مٹی کا اک خوبصورت کھلونا ہو جس کا رخ بار بار بدل کر تماشائی دریچے میں رکھا جاتا ہے صرف جمالیاتی زاویہ تبدیل ہوتا ہے، ورنہ وہی رہتا ہے مٹی کا کھلونا جامد، ساکن، غیر متحرک، میرا خیال ہے کہ جب ادبی مؤرخ اس زمانے کی داستان مرتب کریگا، تو شہری زندگی کے متعلق تو اُسے کافی مواد بہم پہنچ جائیگا لیکن اگر وہ تصویر کا دوسرا رُخ جاننے کیلئے یہ معلوم کرنیکی کوشش کریگا کہ اس بحرانی دور میں ہمارے ملک کا مزدور یا کسان کس طرح رہتا تھا، کیا کھاتا تھا کیا پیتا تھا، کھیتوں میں یا کارخانوں میں کس طرح کام کرتا تھا، اُس کے رسم و رواج کیا تھے، اُس کے گیت کون سے تھے، اس کے تیوہار، اُس کے رسم و رواج، اُس کی خوشیاں، اُس کے غم کیا تھے، وہ اپنے ہمسایوں سے کیسے ملتا جلتا تھا، بیاہ شادی کیسے کرتا تھا، شہری زندگی سے اُس کے کیا تعلقات تھے۔ ملکی مسائل پر کس طرح سوچتا تھا، محبت، مذہب، اخلاق، سیاست، انسانیت ان امور کے متعلق اُس کی کیا رائے تھی۔ تو ہمارا ادب اُسے اِس بارے میں بہت کم واقفیت بہم پہنچا سکے گا۔ کیونکہ یہ تمام باتیں تاریخ میں نہیں لکھی جاتیں۔ یہ تو ایک زندہ قوم کا ادبی سرمایہ ہوتی ہیں اور اسکی تکمیل کے فرائض ادب ہی سرانجام دیتے ہیں۔ اِس لئے جب مستقبل کا ادبی مؤرخ اِس زمانے کے ادب کو کھنگالے گا تو بہت ممکن ہے کہ وہ یہ رائے قائم کرے کہ ہندوستان ایک شہر تھا۔ اُس میں ایک طوائف رہتی تھی۔ ایک کالج کی لڑکی جس کا جسم برفاب تھا، اور ایک سرمایہ پرست، ہی

کو گالیاں دینے والا رومانی ادیب' اور بس۔ اس کے سوائے ہندوستان میں اور کچھ نہ تھا! اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم مستقبل کو اپنی قومی زندگی کے متعلق یہ غلط رائے نہ قائم کرنے دیں!

اگر کسی اچھے ناول نگار' افسانہ نویس' ڈرامہ نگار' نقاد یا انشا پرداز کی توصیف مقصود ہو تو بالعموم یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک شاعر ہے' شاعر درحقیقت ادب کی معراج ہوتا ہے' اور اُس کی بہترین روایتوں کا حامل' اُس کا کلام ایک ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں ملک اور قوم کی سچی تصویر نظر آتی ہے' اُس دَور کی تصویر جس میں شاعر پیدا ہوتا ہے اُن تمام صعوبتوں اور حسرتوں کی تصویر جو کسی قوم کی رُوح پر نازل ہوتی ہیں دیگر اصنافِ ادب میں بھی اس تصویر کے مختلف جمالیاتی رُخ پیش ہوتے رہتے ہیں لیکن جو وجدانی تاثر' شدتِ احساس' حُسنِ بیان اور ناز کی شعر کو نصیب ہے' دیگر اصنافِ ادب اور اسالیب بیان کے حصے میں بہت کم آئی ہے اور جب تک کسی ملک یا قوم کا شاعر زندہ ہے۔ اُس وقت تک اُس ملک یا قوم کی عظمت اور اُس کا مستقبل بھی زندہ ہے۔

نئے ادب کی شعری تخلیقات نے بلندی اور ترقی کے بہت سے مدارج ایک جست میں طے کر لئے ہیں اور اُن تمام تخیلات' تصورات اور عزائم کو اُبھرنے کا موقع دیا ہے۔ جو ایک عرصے سے ہماری قوم کے سینے میں موجزن ہیں' اور جسے ٹیگور' اقبال' جوش' پنت اور نذر الاسلام نے عصرِ حاضر کی زبان دی ہے اور جسے اب نئے ادب کے شاعر نت نئے روپ میں ہمارے سامنے لا رہے ہیں' جہاں تک موضوعِ سخن کا تعلق ہے اس شاعری کا داخلی عنصر نئے ادب کی نثر سے موضوعی یگانگت رکھتا ہے' اور ہمارے ادب کے دونوں شعبے نظم اور نثر موضوعی وحدانیت کے ایک ہی نقطے پر مرکوز اور ہم آہنگ نظر آتے ہیں' لیکن جہاں تک ہیئت کا تعلق ہے' ترقی پسند فنکاروں نے اس میں نمایاں تبدیلیاں کی ہیں اور اپنے موضوعات کی انقلابی نوعیت کے پیشِ نظر شعری ہیئت کو بھی ایسے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ جو موضوعِ سخن کا ساتھ دے اور داخلی اور خارجی اعتبار سے اُن کی تخلیقات میں اک مستقل تطابق اور مکمل آہنگ پیدا کرے کیونکہ اس تطابق کے بغیر شعر میں گہرائی اور تاثیر کی شدت بہت کم ہو جاتی ہے' شعری اسلوب کی تبدیلی نظم معرا اور آزاد نظم کی صورت میں جلوہ گر ہوئی ہے جس پر آج کل اس قدر لے دے ہو رہی ہے اور جو عروضیوں اور پرانے نقادوں کی شدید نکتہ چینی کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

غزل کے پرستاروں کی طرف سے بالخصوص اس ضمن میں مختلف اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ "نئی شاعری میں کچا پن ہے (کچے پن کی کہیں تعریف نہیں کی جاتی کہ کیا بلا ہے) صوتی اعتبار سے یہ سمع خراشی ہے' اس میں لَے نہیں۔ ترنم نہیں'

ہم آہنگی نہیں، غنایت نہیں نغمگی نہیں۔ جس طرح تال راگ کے لئے ضروری ہے اسی طرح قافیہ بھی شاعری کی جان ہے، اور قافیے کی صوتی مناسبت قاری کے ذہن پر بار بار وہی وجدانی تاثر پیدا کرتی ہے جو طبلے کی تھاپ گیت میں!" یہ اور اس سے ملتے جلتے دوسرے اعتراضات، اصل علمِ صوت اور سنگیت کے اصولوں سے عدم واقفیت اور جہالت پر مبنی ہیں۔ کیونکہ لَے، ترنم، تال، ہم آہنگی، صوتی مناسبت اور اس قسم کی دیگر اصطلاحیں تمام و کمال اس فن سے اخذ کی گئی ہیں، سب سے پہلے مجھے تال کے بارے میں کچھ کہنا ہے، یہ غلط ہے کہ سنگیت کے لئے تال لازمی ہے، جس طرح شعری اسلوب کی دو صورتیں ہیں۔ پابند اور آزاد، اسی طرح سنگیت کی بھی دو صورتیں ہیں پابند اور آزاد، موخر الذکر کی مثال الاپ ہے، اور اہلِ فن جانتے ہیں کہ الاپ کے لئے جس میں راگ کا مکمل شکوہ موجود ہوتا ہے تال کی مطلق ضرورت نہیں۔ اور اسے بالعموم طبلے کی مدد کے بغیر ادا کیا جاتا ہے۔ اب ترنم کو لیجئے، صوتی اعتبار سے ہر لفظ کا ایک مخصوص ترنم ہوتا ہے اور اس میں شعر اور نثر کی کوئی قید نہیں جس طرح ایک مصرعہ کا ترنم مختلف الفاظ کے مفرد ترنمات کا اجتماعی مرکب ہوتا ہے بعینہٖ ایک نثری جملے کا ترنم ظہور میں آتا ہے، اس میں شعر اور نثر کی تفریق نہیں، چونکہ دونوں میں ترنم ہے اس لئے دونوں بآسانی سنگیت میں گائے جا سکتے ہوں۔ چاہے نظم ہو چاہے نثر، گرامر کی زبان تو الگ رہی اگر آپ مہمل اصوات کا ایک مرکب لیں اور اُسے کسی موسیقار کے حوالے کر دیں تو وہ اُس میں بھی سنگیت کی جیتی جاگتی رُوح بھر دے گا، ہمارے فلمی گیت جو اکثر مہمل ہوتے ہیں اور کلاسکی موسیقی کے بول اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ اس پر بھی بعض نقادوں کو یہ کہنے کی جرأت ہوتی ہے کہ آزاد نظم اور نظم معرّا موسیقی کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ اب لَے کو لیجئے، لَے شعر میں الفاظ کی مخصوص ترتیب اور نغمے میں سروں کی مخصوص ترتیب سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر آپ آزاد نظم اور نظم معرّا کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ان میں الفاظ کی مخصوص ترتیب اور اسلئے لَے بدرجۂ اتم موجود ہے، باقی رہی ہم آہنگی سو اس کے بارے میں یہ عرض ہے کہ ہم آہنگی اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب مختلف سُر اپنی منفرد شخصیتوں کو برقرار رکھتے ہوئے کسی مخصوص ذہنی توجّہ کو پیدا کرنے کے لئے ہم سطح ہو جائیں۔ مغربی موسیقی میں اس کا رواج بہت ہے، لیکن ہندوستانی موسیقی میں یہ طرز ادا قریب قریب معدوم ہے۔ ہم آہنگی کی تخلیق کے لئے تو مقفّٰی شاعری جس میں لَے کی یکسانیت اور صوتی تکرار ہے خاص طور پر ناموزوں ہے، بلکہ اس کی ترویج کے لئے تو آزاد نظم اور نظم معرّا جن میں لَے کا اُتار چڑھاؤ اور صوتی مد و جزر موجود ہے خاص طور پر زرخیز ثابت ہو سکتی ہیں۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ صوتی حسن لَے کی یکسانیت اور صوتی تکرار (غزل) سے ضرور پیدا ہوتا ہے لیکن اس کا تواتر صوتی حسن کی اِک نہایت ہی سادہ

جمالیاتی صورت ہے جس کا بار بار اعادہ زیادہ سمع خراشی کا موجب ہو سکتا ہے۔ صوتی حسن کی زیادہ بہتر اور مؤثر صورتیں (آزاد نظم، نظم معرا) وہ ہیں جن میں اصوات کی ترتیب اور اُن کا مجموعی ترنّم بدلتا رہتا ہے۔ سنگیت میں تال کی ایک سادہ صورت لیجئے، کہروا کے بول ہیں "دھا دھن تا تنک دھن" یا دادرا جس کے بول ہیں "دھا دھن نا دھا تن نا" لیکن یہ ابتدائی اشکال ہیں، زیادہ ترقی یافتہ صورتوں میں یکسانیت اور صوتی تکرار سے بچنے کے علاوہ اجتماعی ترنّم میں بھی زیادہ مدّ و جزر پیدا کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک تال "دِھن دِھن دھاگے ترکٹ تو ناگت تا دھاگے ترکٹ دھن نا دھن" یا پانچ تال کی اسواری جس میں اصوات اور بھی متنوع ہو جاتی ہیں "دھن دھاگ دِھن دھن نا ناکت تا دھن دھن نا دھاگے نا دھا ترکٹ دِھن! یہ مدّ و جزر یہ تبدیلی مقفیٰ شاعری میں ناممکن الحصول ہے۔ کیونکہ اُس میں صوتی تکرار کے علاوہ لَے کی یکسانیت بھی ترنّم کے مختلف نقوش پیدا کرنے والی قوّت کو محدود کر دیتی ہے، اِس اعتبار سے بھی آزاد نظم اور نظم معرّا اسلوبِ شعری کی بہتر اشکال ہیں۔

بعض ثقہ حضرات کو آزاد نظم اور نظمِ معرّا کے ثقافتی پہلو پر اعتراض ہے، اُن کا خیال ہے کہ یہ مغرب کی نقالی ہے، ہماری زبان اور اس کا مشرقی مزاج اور ہماری تہذیب و تمدّن کی قدیم روایات اِس نقّالی کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ مغرب کی نقالی کا طعنہ ہمارے اکثر تنقید نگاروں کا عام شیوہ ہے اور ترقی پسند ادب کا ہر شعبہ اس کا تختۂ مشق ہے، ہمارے اسالیب بیان، ہمارے موضوعات، ہمارا انداز تفکّر، سب کچھ مغربی ادب سے چرایا گیا ہے اور اس میں ہمارے ذاتی جوہر، استعداد، اُپج یا وطنی ماحول کو کوئی تعلّق نہیں، ہمارا افسانہ، ڈرامہ، تنقید، شاعری ہر کاوش ہدف ملامت ہے۔ کیونکہ وہ مغربی ادب کی مرہونِ منّت ہے۔ اوّل تو یہ الزام ہی غلط ہے اور میں اسکی تردید آگے چل کر کرونگا۔ لیکن یہاں مجھے ان حضرات سے صرف یہ کہنا ہے کہ اگر آپ کوٹ پتلون پہن سکتے ہیں، چشمہ لگا سکتے ہیں، فونٹین پن کا استعمال کر سکتے ہیں، ریل گاڑی اور ہوائی جہاز میں سفر کر سکتے ہیں، بیاہ شادی میں انگریزی بینڈ بجا سکتے ہیں، ایلوپیتھک دواؤں کو حلق سے اُتار سکتے ہیں، اگر آپ زندگی کے ادنیٰ ترین سے اعلیٰ ترین شعبے میں تعلیم میں، صنعت میں، معاشیات میں، سیاست میں، مغرب کی نقالی کر سکتے ہیں اور اس پر فخر کر سکتے ہیں اور اگر آپ کی زندگی کا کوئی پہلو اور حیات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں مغرب کا تاثر نہ جھلکتا ہو، تو آپ صرف اپنے ادب ہی کو کیونکر ان تمام امور سے الگ رکھ سکتے ہیں؟ کیا آپ کی بدلتی ہوئی زندگی کے ساتھ ہمارا ادب نہ بدلیگا؟ اور کیا وہی عوامل جو زندگی کے دوسرے شعبوں میں ظاہر ہو رہے ہیں ادب میں محوِ کار نہ ہوں گے؟ کیوں اس وقت جبکہ پانچوں برِّاعظموں کی نسلیں اور اُن کے تمدّن آپس میں گڈمڈ ہو رہے ہیں آپ یہ چاہتے ہیں کہ ادب تاریخی

قوتوں کے بہاؤ کے ساتھ نہ چلے بلکہ ماضی کی رُکی رُکی ٹھہری ہوئی دلدل بن جائے" یہ "واپس چلو" والی تحریک آپ کو ملک کو، ادب کو کیا فائدہ پہنچا سکے گی؟

مگر مجھے تو اِس الزام میں تاریخی شعور کی کمی اور احساسِ کمتری کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے، کیونکہ یہ غلط ہے کہ نظمِ معرّا اور آزاد نظم ہمارے مشرقی مزاج کے خلاف ہیں یا ہماری تہذیب کے کسی پہلو پر حملہ کرتی ہیں۔ مغرب اور مشرق میں پابند اور غیر پابند شعری اسالیب ایک عرصے سے جاری ہیں۔ اِس میں مزاج کی کوئی تفریق نہیں۔ بلکہ غیر مقفّیٰ شعری اسلوب کی ایجاد کا سہرا تو ایک طرح سے مشرق کے سر ہے جس طرح افسانے کی ایجاد کا سہرا ہندوستان کے سر ہے، یہ میں نہیں کہتا، خود مغربی مبصرین کا اندازہ ہے کہ مختصر افسانے کا جنم ہندوستان میں ہوا، "پنچ تنتر" افسانوں کی پہلی کتاب ہے جو کسی زبان میں لکھی گئی، اِس کے بعد "ہتوپدیش"۔ یہ دونوں کتابیں مختصر افسانوں کی اوّلیں کتابیں ہیں .... اور اُن کا ترجمہ مغرب کی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اِسی طرح رگ وید کی نظموں میں جو دنیا کی قدیم ترین الہامی کتاب سمجھی جاتی ہے نظمِ معرّا کے بہترین نمونے ملتے ہیں، اِن نظموں میں وزن ہے لیکن قافیہ نہیں، ویدوں کے علاوہ سنسکرت شاعری کے بہترین نمونے نظمِ معرّا میں ملتے ہیں۔ کالیداس کی بہترین شاعری نظمِ معرّا کی شاعری ہے۔ نظمِ معرّا اور مختصر افسانہ یہ دونوں اصنافِ ادب مغرب نے ہندوستان سے مستعار لی ہیں، اور اگر آج ہم اُس عظیم الشان روایت کے سلسلہ کو جو ہمارے قومی ادبار کے طفیل صدیوں سے ٹوٹ چکا تھا، پھر سے تازہ کرتے ہیں تو بجائے اِس کے کہ ہمیں داد دی جائے اور ہماری کاوشوں کو بنظرِ تحسین دیکھا جائے ہم پر اُلٹا نفرین کے آوازے کسے جاتے ہیں اور مغرب کی نقّالی کے طعنے دیئے جاتے ہیں!

اگر آپ مقفّیٰ شاعری کا تاریخی مطالعہ کریں اور اسے خلا میں رکھ کر نہ جانچیں، بلکہ اس کے عروج و ارتقا کو مختلف قوموں کی زندگی کے دائرے میں رکھ کر اسے اضافی قدروں سے پرکھیں تو آپ پر یہ امر واضح ہو جائے گا کہ مقفّیٰ شاعری کو بالعموم اُن زبانوں میں عروج حاصل ہوا، جب قومیں اپنے عروج کی منزل سے گزر کر دورِ انحطاط کی طرف جا رہی تھیں۔ یا جب اُن کی مزید ترقی کے امکانات ختم ہو چکے تھے، بخلاف اس کے نظمِ معرّا کو اُس زمانے میں عروج حاصل ہوا جب قومیں مہماتی دَور میں سے گزر رہی تھیں، اور عروج کی طرف پرواز کر رہی تھیں اور جب اُنھیں نہ صرف اپنے ارادوں میں بلکہ اپنی زبان میں اور اپنی شاعری میں وسعت، جوش اور لچک کی ضرورت تھی، ضدینی قوتوں نے اُن کے ادب میں وہی چیز پیدا کر دی جس کی اُن کے ذوقِ عمل کو ضرورت تھی یعنی بے قافیہ شاعری!

مثال کے طور پر آپ آریوں کے سنہری زمانے میں رگ وید سے کالیداس کی شاعری تک نظم معرّا کا عروج دیکھیں گے، کہ جو آریوں کے عروج سے تطابق رکھتا ہے۔ اس کے بعد پابند نظم کو زیادہ فروغ حاصل ہوتا ہے ملکہ الزبتھ کے انگلستان میں کہ جب انگریزی قوم ایک عالمگیر سلطنت کی بنیاد رکھ رہی تھی شیکسپیئر پیدا ہوتا ہے جس کی نظمِ معرّا آج بھی بے مثل ہے، پھر ایک وہ زمانہ آتا ہے جب قوم کی ترقی ایک عرصے کے لئے رُک جاتی ہے اور طبائع روایت پرستی کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ اس دَور میں پوپ کی شاعری پروان چڑھتی ہے جس میں ہیروٹیک کپ لٹ کی پریشان کن تال ہے اور جو ہماری غزل سے ایک گونہ مماثلت رکھتی ہے۔ پھر ایک دَور آتا ہے اور انگریزی قوم اپنے لاج کی طرف بڑھتی ہے۔ اس دَور میں شیلے اور کیٹس کی بے قافیہ شاعری بھی اپنی سربلندیوں کو چھو لیتی ہے۔ اِس کے بعد جب انگریزی قوم اپنے اقتدار کی آخری حد کو چھو لیتی ہے اور جب اس سے زیادہ ترقی ممکن نہیں تو ٹینی سن کی شاعری پر پُرزے نکالتی ہے۔ اب دل روایت پسند ہے۔ نظمیں پابند، روح کوٹس ایٹر (Lotus eater) قدیم روما کے عروج میں لاطینی شاعری کے بہترین نمونے غیر پابند نظموں میں ہیں، یہی حال قدیم یونانی شاعری کا ہے۔ جسے آج بھی مغربی ادب کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے، انقلابِ فرانس میں بلکہ اس سے کچھ عرصہ پہلے ہی فرانسیسی شاعر غیر مقفیٰ شاعری میں زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں، اور انقلابِ روس سے نہ صرف اِک دنیا کو نئی زندگی ملتی ہے بلکہ آزاد نظم کو بھی اپنے بہترین شاعر ملتے ہیں۔ اور اس صنف میں غالباً آج بھی میکیاوسکی کا کوئی مثیل نہیں ہے!

بخلاف اس کے ہندوستان میں غزل کو اُس وقت قبولِ عام حاصل ہوا جب مغلوں کا دورِ انحطاط شروع ہو چکا تھا، بالعموم یہی دیکھا گیا ہے کہ مقفیٰ شاعری کو قوم کے ٹھہرے ہوئے، رُکے ہوئے، روایت پرست دَور میں فروغ حاصل ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قوم میں تعیش پسندی بڑھ جاتی ہے، بالخصوص حاکم طبقے میں، تعیش پسند طبقہ اصنافِ سخن میں سے بھی وہی صنف پسند کرتا ہے، جسے سمجھنے کے لئے اور جسے محظوظ ہونے کے لئے زیادہ غور و فکر سے کام نہ لینا پڑے، اور اس کے لئے مقفیٰ شاعری نہایت ہی موزوں ہے کیونکہ اِس میں لَے یعنی بحر کی یکسانیت ہے، قافیہ ہے۔ وہی وزن ہے۔ وہی تال ہے۔ وہی ملتے جُلتے الفاظ، برابر چلے آرہے ہیں، چلئے ذہن کو لَے کے مدوجزر سے نجات ملی، موضوع تو پہلے پِٹا ہوا تھا، نہ سوچو، نہ سمجھو، بس سر دھنتے جاؤ۔ واللہ کمال کر دیا۔ سبحان اللہ کیا ارشاد ہوا ہے!

یہاں پر غالب کی مثال میرے دعوے کی تکذیب نہیں کرتی، تائید کرتی ہے، اگرچہ مقفیٰ شاعری غالب ایسا

شاعر پیدا کر سکتی ہے تو یہ اسلوبِ شعری قابلِ مذمت نہیں، لیکن غالب کو دورِ انحطاط کے شعرا میں شمار کرنا سخت بے انصافی ہوگی۔ غالب کا زمانہ ایک عجیب زمانہ ہے، مغلیہ سلطنت اپنے زوال کے آخری زینے پر ہے، وہ ہندی شمع گل ہو رہی ہے جس کے جاں نثار پروانوں میں بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہان، اورنگ زیب ایسے عظیم بادشاہ شامل ہیں، نئی شہنشاہیت کا غلبہ ملک پر مکمل ہو چکا ہے، پرانا دَور ختم ہو رہا ہے۔ نیا دَور شروع ہو رہا ہے بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ قوم اپنے دورِ انحطاط کی آخری منزل پر پہنچ کر پھر ترقی کی طرف بڑھتی ہے، اور انحطاط کی آخری منزل ترقی کا پہلا زینہ ثابت ہوتی ہے، اور دونوں میں کوئی بُعد نہیں پایا جاتا۔ غالب کا زمانہ ایک ایسا دَور ہے جس میں یہ دونوں متوازی رجحانات صاف صاف نظر آتے ہیں، غدر اس کی ایک اچھی مثال ہے، غدر مٹتے ہوئے دَور کی آخری شکست تھی اور نئی شہنشاہیت کی آخری فتح! اس زمانے میں قوم پستی کے آخری گڑھے میں گر کر پھر اُٹھتی ہے، لوگوں میں اپنے حقوق طلب کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور ان حقوق کی حفاظت کے لئے مدافعت بلکہ مزاحمت کا جذبہ اُبھرتا ہے، غدر کا ردِّ عمل ملکۂ وکٹوریہ کا شاہی اعلان ہے، اس سیاسی پس منظر کی روشنی میں آپ اس دَور کے ادبی کارناموں پر نظر ڈالئے، تو جہاں آپ کو ان دونوں زمانوں کے دائرے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں وہاں وہ معروف ادبی ہستیاں بھی محوِ کار نظر آتی ہیں، جو بظاہر ہم عصر ہیں۔ لیکن دراصل دو مختلف دَور۔ دو مختلف رجحانات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ذوقؔ اور غالبؔ! ذوقؔ پرانے ادبی دَور کی آخری تجلّی ہے، غالب کی شاعری نئے دَور کی پیغامبر ہے، اُس دَور کی کہ جس کے پیامی حالیؔ، سر سیّدؔ اور اقبالؔ ہیں۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ غالب کی شاعری کو اُس کے زمانے میں کوئی نہ سمجھ سکا۔ کیونکہ وہ اُس دَور کی شاعری ہی نہ تھی جو ختم ہو رہا تھا۔ وہ تو اُس روحِ احتجاج کی نقیب تھی جو آج اُن بپھرے ہوئے طوفان کی صورت میں چاروں طرف موجزن ہے، رہا۔ معتقفے شاعری کا معاملہ، سو غالب کو بھی اس کی تنگ دامنی کا اعتراف ہے۔ کچھ اور چاہیئے وسعت...... انحطاط اور احتجاج میں جو تفریق ہے وہی ذوقؔ اور غالبؔ میں ہے۔

اس کی ایک اور مثال لکھنؤ سکول کی تاریخ میں بھی ملتی ہے، جب دلّی اُجڑ گئی، تو ساکنتی ادیبوں نے لکھنؤ، اور بعد میں رامپور کے درباروں میں پناہ لی، یہاں بھی وہی پرانی فضا تھی، ذہنی قدروں سے ناآشنا، بدلتے ہوئے ماحول سے بے حس، سیاسی بحران متلاطم اور مستقبل تاریک، اس زمانے میں ساکنتی ادیبوں نے اپنا سارا غصہ بچارے عشق پر نکالا۔ اور اُسے پیٹ پیٹ کر ادھ مؤا کر دیا۔ خیر یہ دَورِ انحطاط بھی ختم ہوا، اور پھر ایک عرصے کے بعد جو نمودِ سحر ہوتی ہے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہی لکھنؤ سکول ہے، لیکن نہ وہ بے کیف معاملہ بندی ہے، نہ وہ بٹیر بازی، ادھر میں

عوام جمہوریت کے لئے کوشاں ہیں اور ادب میں سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور اُن کے رفقا کار پرانی قدروں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرتے ہیں اور ہندوستان کو اس نئی راہ پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔ غزل سے بھی اب وہ دلچسپی باقی نہیں ہے، اور جوشؔ، ساغرؔ، مجازؔ، سرداؔر، اختؔر کی نظموں میں روحِ احتجاج زمزمہ ریز ہے! انحطاط اور احتجاج میں جو بُعد ہے۔ وہی بُعد پُرانے اور نئے لکھنؤ سکول میں ہے، وہی بُعد پُرانی اور نئی شاعری میں ہے!

اجتماعی حیثیت سے قطع نظر یہ کُلیّہ شخصی حیثیت سے بھی بے حد دلچسپ ہے، شاعر کا ذہن مختلف النوع تجربات اور واردات کا حامل ہوتا ہے اور وہ ان کے بیان کے لئے ایک ہی یا مختلف شعری اسالیب استعمال کرتا ہے اور اس امر کا فیصلہ بالعموم اس کے شعری جوہر کے قدرتی رجحان پر منحصر ہے۔ لیکن پھر بھی یہ اکثر دیکھا گیا ہے۔ کہ جب شاعر کا ذہن جمود، سکون اور روایت پرستی، کی طرف راغب ہوتا ہے، تو وہ اپنے شعری اسلوب میں مقفےٰ شاعری کا پابند ہوتا ہے، اور جب اُس کا ذہن انقلابی قدروں سے متلاطم ہوتا ہے تو وہ عموماً غیر پابند یا کم سے کم پابند اصنافِ سخن کا انتخاب کرتا ہے، چنانچہ سپین کی خانہ جنگی کے ہیجانی دور میں اوڈن، سپنڈر، ڈے لیوس اور دیگر انگریزی شعرا کی بیشتر نظمیں بے قافیہ ہوتی تھیں، لیکن جب وہ پرجوش، امید افزا، ہیجانی دور ختم ہوا اور دل مایوسی، تاریکی اور روایت پرستی کی طرف مائل ہوا، تو نظموں میں پھر قافیوں کی تکرار اُبھرنے لگی۔ ہمارے ہاں اکثر شعرا کی انفرادی کاوشوں میں بھی یہ چیز کئی بار دکھائی دیتی ہے، جب راشد روایت پرست ہوتا ہے تو آزاد شاعری کو ترک کر کے غزل یا سانیٹ کہتا ہے، جب مجاز اور سردار مئے و مستی کے راگ الاپتے ہیں تو بالعموم غزل کہتے ہیں کہ غزل کو یہی ادائیں مرغوب ہیں۔

چند نقادوں نے نئی شاعری اور نئے ادب کو مطعون کرنے کیلئے خدا اور مذہب کو بھی بیچ میں ڈالا ہے اور کہا ہے کہ نظم معرّا اور آزاد نظم کا قانوناً ممنوع قرار دیا جائے کیونکہ نظم معرّا اور آزاد نظم میں خدا کی حمد و ثنا ہو ہی نہیں سکتی شعری اسلوب نے اہرمنی ہوتے ہیں نہ یزدانی، بلکہ محض انسانی، اور جہاں تک نظم معرّا اور آزاد نظم کا تعلق ہے اُنہیں ہر قسم کے جذبات کو ادا کرنے کی قدرت ہے۔ چاہے آپ خدا کی توصیف کیجئے یا اُسکی شکایت کیجئے، رگ وید کی نظمیں ملٹن کی بے قافیہ شاعری اور وٹمین کی دعائیہ آزاد نظمیں اس امر کا بدیہی ثبوت ہیں کہ نظم معرّا اور آزاد نظم خدا اور مذہب کی توصیف سے کبھی خالی نہ تھیں، پابند یا غیر پابند شعری اسالیب کو آپ خدا اور مذہب کے حق میں یا اس کے خلاف دونوں طرح استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر نظم معرّا اور آزاد نظم میں حمدیہ شاعری موجود ہے تو غزل میں خدا اور اسکی خدائی کے خلاف گستاخانہ شکایتیں بھی موجود ہیں۔ پھر کیا غزل کو بھی قانوناً ممنوع قرار

دیا جائے گا؟ خدا اور مذہب کے بارے میں ترقی پسندوں نے ہمیشہ رواداری سے کام لیا ہے، اور جمہور کی رائے کا احترام کرنا سیکھا ہے، اُنہوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ اُن کی تحریر سے کسی شخص کی مذہبی دل آزاری نہ ہو۔ ترقی پسند ادیبوں میں آپ کو بمشکل دو یا تین فیصدی دہریئے ملیں گے، ورنہ یہ لوگ بالعموم راسخ العقیدہ مسلمان ہیں، ہندو ہیں، سکھ ہیں، عیسائی ہیں اور جو لوگ دہریئے بھی ہیں۔ وہ بھی اس حد تک ضرور مذہبی واقع ہوئے ہیں، کہ وہ انسانیت چاہتے ہیں، انسانوں میں اشتراکِ عمل چاہتے ہیں، محبت چاہتے ہیں، خوشی چاہتے ہیں، مساوات چاہتے ہیں، اخوت چاہتے ہیں، بلند اخلاق چاہتے ہیں، انسانوں کیلئے علم چاہتے ہیں، کام چاہتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خلقِ خدا کا بھلا چاہتے ہیں۔ اُن کے اصول وہ ہیں جو بالعموم تمام مذاہب میں مشترک ہیں۔ اس لئے بھی یہ لوگ مذہب کی مخالفت نہیں کرتے، ہاں وہ اوہام کی مخالفت ضرور کرتے ہیں۔ اُن تمام افراد یا اداروں کی مخالفت بھی ضرور کرتے ہیں جو مذہب کے نام پر، سرمایہ پرستوں کے خدا کا واسطہ دیکر جمہور کو دھوکا دے کر اپنا اُلّو سیدھا کرنا چاہتے ہیں، ایسے افراد یا اداروں کی ہمیشہ مخالفت ہوتی رہے گی، اور نئے ادیبوں کو اس کا علم ہے کہ اس سلسلے میں اُنہیں عوام کی اور ہر مذہب کے سچے پیرو کی ہمدردی حاصل ہے!

نئے ادب میں بلاشبہ طربیہ عناصر کی کمی ہے، اس کی شاعری نشاطیہ نہیں، اس کے نثری کارنامے مسرت آگیں نہیں، بلکہ اک مغموم تابندگی کے مظہر ہیں، اسے پڑھ کر قاری کو بسا اوقات کوفت ہونے لگتی ہے اور جب وہ مکروہاتِ دنیا سے اُکتا کر اِک نئی دنیا کی تلاش میں ان تحریروں کا مطالعہ کرتا ہے تو یہ ادب اُسے پھر اُسی دنیا میں گھسیٹ لاتا ہے۔ اور اسے اپنے گردوپیش کے ماحول پر غور کرنے کیلئے مجبور کرتا ہے۔ اور اُسکے فراری جذبات کو کاری ضرب لگاتا ہے۔ یہ تمام الزامات اگر یہ الزامات ہیں بالکل صحیح ہیں اور انکی بنیادی صداقت سے ہمیں انکار نہیں، اسکی وجہِ جواز صرف یہ ہے۔ کہ جبتک دنیا کی خوشیاں اور اس کے آرام اک قلیل طبقے تک محدود رہیں گے اور انسانوں کی آبادی کا بیشتر حصّہ ان سے محروم رہیگا، نیا ادب بھی اس کمی کو محسوس کرتا رہیگا اور بزمِ طرب و نشاط سے محروم رہیگا۔ اور ہر لحظہ اس محزون محرومی کیطرف آپکو توجہ دلاتا رہیگا۔ کیونکہ نیا ادب مرمریں محل کی پیداوار نہیں، یہ ادب تو اس خندق کی آنکھ ہے جو اس مرمریں محل کے چاروں طرف کھنچی ہوئی ہے جو اس محل سے باہر، اس خندق کے پار وسیع میدانوں اور وادیوں کے اندر چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں میں رہنے والے عام انسانوں کو اس محل کے اندر آنے سے روکتی ہے، اور جس میں اس محل کا سارا کوڑا کرکٹ گرتا رہتا ہے، اسی لئے تو اس کی سانس متعفن ہے، اس کا لباس غلیظ ہے، اور اس کی پیشانی پر کیچڑ لگی ہوئی ہے، یہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے۔ ہمارا ادب وہی کہتا ہے، لیکن اگر آپ نئے ادب کا بنظرِ غائر مطالعہ کریں گے، تو آپ محسوس کریں گے کہ یہ آنکھ محض یاس و نکبت

کے مناظر نہیں دیکھتی، محض افلاس وادبار کی گھٹاؤں کا نظارہ نہیں کرتی، بلکہ ان تاریک گھٹاؤں کے پرے اُفق پر اُس چاندی کی لکیر کو بھی دیکھ رہی ہے جو زندگی کے لئے اِک نئی راہ ہے، اک نئی مشعلِ ہدایت ہے جو انسانی دکھوں کو کم کرتی ہے، اور کائنات میں پہلی بار اجتماعی مسرّت کی بنیاد رکھتی ہے، اور انسان کے دل اور اُس کی حیات کی اہرامی تاریکی میں تاروں کی جگمگاتی ہوئی افشاں چُن دیتی ہے!

پونا۔ ۱۹۴۲ء

کرشن چندر

منزلیں طے کر چکا ہے آفتابِ فکرِ نو
آج اگر روحِ قدامت ظلمت افشاں ہے تو کیا؟

(جوش)

جوشؔ ملیح آبادی

نئی حمد

آہ! اے فرزندِ آدم۔ نامراد و ناتمام
اے خدائی کے اسیر اے شہریاری کے غلام
شہریاری تیرہ دل ہے اور خدائی بے نیاز
کس توقع پر اُٹھائے جائیں ان دونوں کے ناز
اغنیا بے حس، خدا غافل، حکومت پُر دُخل،
بن پڑے تجھ سے تو ان تینوں کے پھندے سے نکل
چاک کر دے اس طلسمِ زشت کے پردے کو چاک
ابنِ آدم یہ نئی تثلیث بھی ہے خوفناک
فرش پر ہمدرد ہے کوئی نہ ہمدم عرش پر
اپنی ہمدردی پہ خود مائل ہو اے نوعِ بشر

سنگ پاروں کی حقیقت کیا ہے سوئے گوہر نہ دیکھ
ناخدا کیسا خدا کی سمت بھی مڑ کر نہ دیکھ

کر بھی دے معزول ان اربابِ عزّ و جاہ کو
آسمانوں پر خدا کو اور زمیں پر شاہ کو

عصمت چغتائی

پیشہ

مجھے معلوم تھا وہ سوٹبا سو طوائف ہیں۔ وہ سُرخ مصنوعی بال چُست کپڑے اور دن رات مردوں کے ٹھٹ۔ ناچ گانے اور موٹے مہین قہقہے۔ مجھے اپنے کمرے میں بیٹھے بٹھائے جھکولا کرتے تھے۔ ہم عورتیں بڑے سی بڑے پہلوانوں کو چت کر سکتی ہیں پر جب طوائف سے ٹکّر ہوتی ہے تو ساری نسوانیت اپنا سا منہ لیکر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماں لوری کے ساتھ ساتھ بچے کے دل میں یہ بات چپکا دیتی ہے کہ طوائف اژدہا ہے۔ سانپ ہے! کیا کچھ ہے!

اور یہی بچپن کی نفرت اب تک خون کے ذرّے ذرّے میں ناچ رہی ہے۔ ویسے ہزاروں عورتیں گذر جائیں پتہ نہیں چلتا لیکن طوائف کو سونگھ کر ہرن کی طرح بھڑک جاتی ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ یہ خوشبو پہلی دفعہ میں نے بہت بچپن میں سونگھی تھی۔ بھڑائچ میں سیّد میاں کے مزار پر جمعرات کو طوائفوں کا جھمگھٹا ہوتا۔ اللہ کے پیارے بھی اس متبرک دن کچھ زیادہ ہی آجاتے۔ ایک دن ایک پکّی سی طوائف نے مجھے نہ جانے کس جذبہ کے ماتحت گود میں اُٹھالیا! وہ اُس کے

پھسلنے کپڑے اور مخصوص خوشبو میں بسا ہوا سینہ! میں جلدی سے اُس کی گود سے مچل آئی۔

اُس دن مجھے سب نے خوب تھو تھو کر کے چھیڑا کہ ہے بچاری کو رنڈی نے چھو لیا اور میں بھی اُس ہتک کے احساس سے دیر تک روتی رہی۔ پھر ایک دن میری ایک پھوپھی آئیں اور انہوں نے مجھے پیار کیا تو وہی پھسلتے ہوئے ریشمی کپڑے اور مہکتا ہوا سینہ! نہ جانے کیوں میں فوراً مچل کر بھاگ آئی۔ میرا اندازہ ٹھیک نکلا اور میری رنگین پھوپھی مشکل سے مہینہ بھر رہی ہونگی کہ دس بچوں کے باپ میرے ابا جان اُن پر بُری طرح عاشق ہو گئے۔ میری اماں بچاری بجھ کر رہ گئیں۔ بھلا پان بیڑی کی دکان کے سامنے کوئی شاندار ہوٹل کھول دے تو بچاری دکان کا جوبن کے دن کا؟ خیر ٹونے ٹوٹکے ہوئے تب جا کر کہیں اُن کے گردوں میں درد اُٹھا اور وہ بھاگیں۔ ہاں تو میرا مطلب یہ ہے کہ ہم عورتیں طوائفوں کو سونگھ کر ہی کھٹک جاتی ہیں۔ بقول کسے اُن کا ٹھسّا دیکھ کر حفاظتی دیواریں کھڑی کرنے کو دل چاہتا ہے۔ وہ کوٹھے سے اُتر رہی تھیں اور میں چڑھ رہی تھی کہ میں نے اُنہیں سونگھ لیا۔ اے ہے یہ میں کہاں آ گئی؟ کیا کہے گی دنیا؟ میرے محکمہ والے کیا کہیں گے؟ ایک سے ایک بدمزاج بھرا پڑا ہے۔ محلہ والیوں سے زیادہ یہ محکمہ والے ایسی ویسی باتوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔

عید کا دن تھا۔ غریبی میں کیسی عید اور کیسا محرم۔ کپڑے بھی نہ بدلے لیٹی اخبار دیکھتی رہی۔ پڑوسن کے یہاں چار بجے سے برتن کھڑک رہے تھے۔ ان بچاریوں کو نیاز نذر کی بڑی فکر پڑی رہتی۔ بستر پر لیٹی ناشتہ کر رہی تھی کہ دروازہ کھٹکھٹایا اور قبل اس کے کہ میں سنبھلوں وہ آن دھمکیں!

عام طور پر کسے معلوم رہتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ اور میری عمر میں یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی طوائف دندناتی چلی آئی ہو۔ لہذا میں گھبرا کر رہ گئی۔

"اے ہے" میں نے کہا۔ کہیں تم ناشتہ نہ کر چکو —— کیا لشتم پشتم ستوئیاں بگھاری ہیں —" وہ اپنے چُست کپڑوں میں سے پھنکاریں۔ کمبخت کو یہ بھی سوچنے کی فرصت نہ تھی۔

کہ تنگ کپڑے پہننے کے دن کبھی کے جا چکے تھے اور خمیرے آٹے کو تسموں سے کسنے سے نہایت ناہموار سطح ہو جاتی ہے۔

"میں صبح کے وقت میٹھا نہیں کھاتی۔" میں نے غرور سے گرہستن بننے کی کوشش کی۔

"اُوئی آج عید کے دن بھی میٹھا نہیں —— بھئی نہیں ہماری قسم تھوڑی سی ضرور چکھو ——" وہ نہایت بے تکلفی سے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

یا اللہ! کیا یہ مجھے بھی طوائف سمجھ کر تبرک کے ذریعے میرے گناہ دھونے آئی تھی۔ اب یہ کیسے بتاؤں کہ میں قطعی نیک اور پارسا ہوں۔ اور پھر قسم! اُوہ معبود یہ تو وہی اس کے ہزاروں عاشقوں کی چھوڑی ہوئی قسم تھی جو یہ میرے حلق میں ٹھونس رہی ہیں! میں جل اُٹھی۔ لیکن جب وہ بے حیائی سے مصر ہی ہو گئیں تو میں نے دو چمچے چکھ لئے۔

"باورچی نے کہا کہ یہ بیوی مسلمان ہیں —— بس میرا جی ملنے کو پھڑک رہا تھا.... مگر تم تو سارا دن غائب رہتی ہو ——" کسی نے اُنہیں پکارا اور وہ چلی گئیں۔

میں نے دو چمچے اور کھائے! یا خدا! جی چاہا حلق میں اُنگلی ڈال کر قے کر دوں۔ یہ مجھے کیا ہو گیا تھا میں طوائف کی کمائی کھا رہی تھی۔ عصمت فروشی کی جمع کی ہوئی گھناؤنی دولت۔ فاحشہ بدکار کا پیسہ؟

مگر پھر میرے دل میں نہایت بے شرمی کے باغیانہ خیالات ناچنے لگے۔ یہ رنڈی کا پیسہ بھی تو اپنے باپ دادا ہی کا پیسہ ہے۔ میرے ایک چچا تھے جنہوں نے تین معقول بیس تیس ہزار روپیہ رنڈی بازی میں اُڑا دیا تھا۔ اس سے مجھے کیا کہ میری چچی رنڈی کون تھی۔ اِن لال بالوں والی ہی کی کوئی بہن بھانجی ہو گی میں نے اور شوق سے سوئیاں کھانی شروع کیں۔ جیسے میں پھنکا ہوا مال سمیٹ رہی تھی۔ مجھے ایک قسم کا اطمینان سا ہو رہا تھا۔ میں ایک امیر کو کچھ تھوڑا سا غریب بنا رہی تھی۔ ایک چمچہ اور لیا اور میرا منہ کیوڑہ اور میوہ میں گھلی ہوئی سوئیوں سے بھر گیا۔ ایک بڑا سا سالم پستہ میری ڈاڑھ کے نیچے کچ سے آگیا۔ چکنائی کی ننھی ننھی بوندیں منہ میں پھُدکنے لگیں

جیسے میں نے کسی موٹے سے بلئے کو چبا ڈالا۔ مگر فوراً ہی مجھے اُس کی چربی کے خیال سے اُبکائی آ گئی۔ مجھے وہی اطمینان محسوس ہو رہا تھا جو انگریزی کپڑے جلاتے وقت بلوائیوں کو ہوتا ہے ہماری انتقام پسند آنکھیں اُن خالی خولی کپڑوں میں اپنی مرضی کے موافق تخیلی جسم کو دیکھ کر سکون محسوس کرتی ہیں۔

میں نے سرہانے کی میز سے میٹرک کے امتحان کی کاپیاں اُٹھا کر دیکھنا شروع کیں کیسی عید اور کیسی بقر عید۔ ابھی تین سو کاپیاں اور دیکھنا تھیں مگر میرا دماغ جب بھٹکنا شروع کر دیتا ہے تو ہزار گھیرو، پکڑ میں نہیں آتا۔ جل کر میں نے کئی بدقسمتوں کو فیل کر دیا۔ پھر کاپیاں دُور پھینک کر انگڑائیاں لینے لگی۔ یہاں کی آب و ہوا بھی کیا عجیب ہے جیسے بڑے سے گیلے تولیے میں فضا لپٹی اونگھ رہی ہے۔ تھکی تھکی نیند اعضا بھاری اور پھسلنے جیسے کسی نے سریش لگا کر ہلکا سا سکھا دیا ہو۔ ایک جھنجھلایا ہوا سرور سا ——— اور پھر پڑوسن کے یہاں سے قہقہوں کے گرم گرم بھبکے!

بدنصیب! مجھے پڑوسن پر رحم آنے لگا۔ ممکن ہے غریب اپنا جوہرِ عصمت لٹانے پر مجبور ہو گئی ہو۔ شاید کسی ظالم نے اُس کی عزّت لوٹ لی ہو اور پھر وہ کھسیا کر سرِ بازار بکھیرنے لگی۔ اور مجھے اُس پر پیار سا آ گیا۔ جب کبھی ہم سب بچّے امّاں سے کوئی کھانے پینے کی چیز جھپٹنے لگتے تو وہ بھی کھسیا کر توکرا کا توکرا پٹخ دیتی تھیں ——— کہ "لونا مرادو! بھوکو! ——— آپ مر دگے ———!"

لیکن ہمیشہ نیک خیال کے ساتھ بدخیال ضرور میرے دماغ میں رینگ آیا کرتا ہے۔ اور جو نہی بچارا نیک خیال اُونگھا بد نے پھن اُٹھایا۔ یقیناً یہ تو جان بوجھ کر شوقیہ طوائف بنی ہو گی۔ سستی کے مارے اور دنیا کا کچھ کام نہ ہو سکا۔ مزے سے یہ پیشہ اختیار کر لیا؟ بھلا پڑوسن سے کیا سلائی ہوتی یا چکی پستی۔ تنو جھمیلے ہیں دنیا کے اور پیشوں میں ——— میاں بیوی بچّے ساس نند، تو ئیں بھلا کون بھگتے ——— بھلا یہ جوبن قائم رہتا جو پڑوسن کے بھی دو چار ساس نندیں ہوتیں ——— توبہ کیجئے!

ایک دن جیسے ہی فلیٹ پر پہنچی پڑوسن کے یہاں کسی کے چیخنے چلانے کی آوازیں آئیں

سارے دن کی تھکن، اُس پر گھڑی بھر کو چین نہیں۔ سکول سے آکر جبتک کئی گھنٹے مردے کیطرح نہ پڑے رہو تھکن نہیں اُترتی معلوم ہوتا ہے کلاس میں لڑکیوں نے بھیجے کو گنّے کی گنڈیری کی طرح مزے لے لیکر چبایا اور تھوک دیا۔ بڑی مشکلوں سے اس چوسی ہوئی گنڈیری کو تازہ کیجیے صبح پھر وہ نکیلے دانتوں کے گھسّے! سال میں ۲۶۰ دن یہی عمل جاری رکھئے۔ اُس کے بعد... اس کے بعد پھر وہی چوُسی ہوئی گنڈیری کا بھوگ۔

دروازہ کھُلا اور وہ ایڑیاں ٹھمکاتی ہوئی چلی آئیں۔ آتے ہی گرجیں۔

"میں تو عاجز آگئی ہوں۔ نگار سے ——— اللہ جانتا ہے ایسی ہی کیا اسکول کی پڑھائی کہ ناس لگ گیا ———"

اُدہو! تو گویا رنڈیوں کی لڑکیوں کے بھی ناس اس قدر ذی حس ہوتے ہیں کہ مرسکیں۔ خوب تو آپ بھی چلیں اعتراض کرنے!"

"تو کیوں بھیجتی ہیں اسکول ——— اُٹھا لیجئے۔"

"اُوئی اُٹھالوں؟ ——— لو اور سُنو ——— اے بی آجکل بے پڑھی لکھّی کو کون پوچھتا ہے۔ آجکل تو بس گٹ پٹ کرتی میم چاہیئے۔"

یہ مجھے آج معلوم ہؤا کہ اس پیشے میں بھی تعلیم یافتہ ہونے کی ضرورت ہے شیکسپیئر اور ورڈس ورتھ کے حوالوں کی بھی ضرورت پڑتی ہیں! "بات کیا ہوئی ———"

"اے وہ میں نے کہا بیٹی نگار آج کھڑا پاجامہ پہن لو ——— کہ نہیں ——— جو بات ہے نہیں ——— بس وہ موئی فراخیں چڑھالو ———"

میں نے کہا "تم سمجھاؤ تو شاید مان جائے۔ بات یہ ہے کہ کچھ لوگ دلّی سے آرہے ہیں۔" انہوں نے رازدارانہ انداز میں کہا اور میرا جی چاہا کہ اُنکا لال چقندر جیسا منہ کھسوٹ لوں۔ جی؟ یعنی میں سمجھاؤں؟ خوب تو گویا مجھے بی۔ ٹی میں رنڈیوں کی لڑکیوں کو پیشہ کے ہتھکنڈے ہی سکھائے گئے تھے۔ اب بھلا بتایئے یہ کیسے سکھاؤں کہ بھئی دلّی والوں کے لئے پاجامہ پہنو۔ کلکتہ والوں کیلئے

ساڑھی اور لاہور والے شلوار پسند کرتے ہیں۔ خوب! اور دوسرے مجھے یہ نگار کی بالنی سر سے بُری لگتی تھی۔ یعنی یہ کیا۔ یہ ہندو مسلم اتحاد یا فساد کا نمونہ ہے یا کیا؟ بڑے بڑے لیڈر چت ہو گئے اور یہاں ایک محترمہ کی جدّت پسندی نے ہندو مسلم سب کو گڈ مڈ کر کے رکھ دیا۔ مگر یہ میری عادت ہے کہ میں ہمیشہ ہر شخص کو مجبور سمجھ لیتی ہوں۔ شاید لال بالوں والی سیٹھانی بھی مجبور ہی ہو گئی ہوں۔ گڈ مڈ میں یاد نہ رہا ہو اور بجائے کسی کی حق تلفی کرنے کے انہوں نے دونوں ہی کا خیال رکھا —— خیر!

"تم کبھی ہماری طرف نہیں آتیں ——" اُنہوں نے ڈھٹائی سے کہا —— قبل اس کے کہ میں روکھا جواب دوں بولیں: "نگار نے نئے توڑے سیکھے ہیں ——"

اگر مجھے کسی وقت زنڈی پر پیار آتا ہے تو اُس وقت جبکہ وہ ناچ رہی ہو۔ اس وقت مجھے عین میں اس محنتی مزدور کی طرح معلوم ہوتی ہے جو پیٹ کی خاطر سرمایہ داری کے کولہو میں بیل کی طرح جتا ہوا ہو۔ یا جیسے کوئی گھر گرہستن چکّی پیس رہی ہو۔ رقص کرنا مذاق نہیں بوٹی بوٹی ہل جاتی ہے۔ جیسے دس سیر اناج پیس لیا۔ مگر مجھے طوائف کی زندگی کے دوسرے رُخ سے گھن اس لئے نہیں کہ وہ کچھ مختلف ہے بالکل نہیں —— بلکہ —— یا کچھ ضرورت سے زیادہ مشکل ہے —— یہ بات نہیں —— بلکہ یونہیں۔

دوسرے دن میں ہمت کر کے سیٹھانی کے فلیٹ میں چلی ہی گئی۔ کہ دیکھوں اندر سے ان لوگوں کے گھر کیسے ہوتے ہیں۔ اُفوہ بس یہ سمجھ لیجئے کسی چھوٹے موٹے راجہ یا وزیر کا گھر —— قدآدم تصویریں —— برہنہ عورتوں کے مجسّمے —— یہ طوائفیں، ننگی عورتوں کی تصویریں بھلا کیوں اپنے گھر میں رکھتی ہیں —— بھلا اِس سے کیا فائدہ —— سیٹھانی تو شاید اپنے جسم کی بھیانک سلوٹوں کو سڈول مجسّموں کی آڑ میں رکھنا چاہتی ہے —— ہوگا کوئی گُر اِن لوگوں کا! نگار مجھے دیکھ کر ایسے شرمائی گویا ابھی انڈا کھٹک کر باہر نکلی ہے اور بڑی دیر تک نخرے کرنے کے بعد آئی۔ سیٹھانی نے ڈانٹا تو خیر ریکارڈ لگا کر ناچنے لگی

یہ رنڈیاں! اُف میں نے تو سُنا تھا کہ ان کے جسموں کو گھن لگ جاتا ہے مگر سیٹھانی تو لوہے کی لاٹھ رکھی تھیں اور اولاد تو خدا کی پناہ ـــ کیا پھرتیلا لوچدار جسم ۔ جیسے ناگن انگڑائیاں لے رہی ہے ۔ جب کلائی پر کلائی کی گرہ باندھ کر وہ پنجوں سے توڑے لیتی تو اس کی ننھی ننھی ٹھوکروں سے ساری دنیا ہلکورے لینے لگی یہ میرا دل لرز اُٹھا ۔ اُف یہ ناگن نہ جانے کتنوں کو ڈسے گی ۔ نہ جانے کتنے شکار تھیلے میں ٹھونسے گی ۔ ویسے تو عورت دوسری عورت سے وقت بے وقت جل ہی جاتی ہے مگر طوائف سے تو خدا کی پناہ ـــ! عورت تو اپنا حصّہ یعنی ایک مرد لے کر بازار سے ہٹ جاتی ہے ۔ مگر طوائف سے تو چھٹکارا نہیں ۔ جیسے دُکان سے اناج لیتے وقت عوام تو حسب ضرورت لیکر ہٹ جاتے ہیں مگر خاص لوگ بھر بھر بورے تہ خانوں کے کلیجے میں اُتار دیتے ہیں ۔ نتیجہ؟ ـــ اگر اکنومکس پڑھی ہے تو بس سمجھ لیجئے اناج کی کمی! تو یہ ہماری جنگ جو طوائفوں سے چلی آرہی ہے ۔ یہ بھی مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ ہے ۔ دکھ جھیلیں بی فاختہ اور کوّے میوہ کھائیں ۔ کہتے ہیں ایک دن ایسا دہکتا ہوا آئے گا ۔ کہ سارے مزدور سرمایہ داروں کو پیس کر پھینک دیں گے اور اُن کا سارا سرمایہ چھین لیں گے شاید عورتیں بھی اسی طرح حملہ کر کے ایک دن طوائفوں کا "سرمایہ" چھین لیں! شاید!

شام ہوئی تو گاہک آنے لگے ـــ مارے شرم کے میں سکڑی ایک طرف کو بیٹھی رہی کہ موقع ملے تو اُڑوں کہیں یہ مجھے بھی ان میں سے ایک نہ سمجھ لیں ۔ اور یہی ہوا کہ ایک بُجھے ہوئے سے ایڈیٹر صاحب اُنہوں نے میرے سر چپکا دئے ۔ کمبخت میں کچھ بول ہی نہ سکی اور اُس نے میرا سودا بھی کر دیا!

تھوڑی سی دیر میں پورا ہال بھر گیا ـــ رنگین عورتیں اور عیاش مرد ، زور زور کے قہقہے چلنے لگے ۔ ایک کونے میں چار چھ نے بیٹھ کر پینا اور جُوا شروع کر دیا ۔ دوسری طرف نگار گھیرے میں ادھر سے اُدھر جھپک رہی تھی ۔ اُس پر لوگوں کی خاص توجہ تھی ۔ ایک ادھیڑ سا مرد تو اُسے گود میں گھسیٹے لیتا تھا ۔ اور وہ ہنس ہنس کر اُنہیں مار رہی تھی ۔

مگر سماں تو سیٹھانی نے باندھ رکھا تھا۔ گہرے رنگ کے بھڑکدار کپڑے جو دن کو بے تکے لگ رہے تھے اس وقت بہار دے رہے تھے۔ پاؤڈر سُرخی سے تیس جیسی چو بتی کی دُلھن دو چار کمسن لڑکوں میں گھری ہوئی نازک نازک چہلیں کر رہی تھیں۔ اس وقت بلا کی کمسن اور حسین معلوم ہو رہی تھیں۔ میں متحیر بیٹھی تھی کہ جوانی عمر سے ہوتی ہے یا اداؤں سے۔

اور ادھر وہ ایڈیٹر صاحب بیٹھے مجھے چبا رہے تھے۔ انتہائی ترقی پسندانہ باتیں اور اس خوبصورتی سے کہ میں ہکلا ہکلا کے رہ جاؤں۔ اُنکی پوری توجہ اُن برہنہ تصویروں کی طرف تھی جو میرے بہت ہی قریب ٹنگی تھیں۔ بلکہ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے ہی جسم پر چپکی ہوئی ہیں۔ بار بار وہ اُنگلیوں سے تصویروں کے خطوط چھُو کر اُن کے حُسن و قبح پر بحث کر رہے تھے جس کے جواب میں مجھے گھبرا کر اپنے بٹوے میں کوئی نہایت ہی ضروری چیز ڈھونڈنا پڑتی تھی گھوم پھر کر وہ عورتوں کے سینوں کے اُوق مسئلہ پر آ جاتے تھے اور آنکھوں میں میٹھی میٹھی نمی پیدا کر کے اپنے سُوکھے ہاتھوں سے سانچے ڈھال کر تشریح کر رہے تھے۔ باوجود اس قدر ڈھیٹ ہونے کے کئی دفعہ مجھے قالین کے نقش و نگار گھورنے پڑے ہر جنبش پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے جسم کو آٹے کی طرح خوب پیروں سے کھوند کر بھیانک سا پتلا بناتے ہیں پھر بگاڑ دیتے ہیں۔ اُنہیں مجھے اس طرح نچوڑنے میں کچھ مزہ آ رہا تھا کیونکہ وہ برابر مسکرا رہے تھے۔ جل کر کئی دفعہ جی میں آیا کہ اُن کے بھی کسی حصہ جسم کا ایسا مذاق بناؤں کہ ایک دفعہ تو غلیظ مسکراہٹ سے بھری آنکھ بھی جھینپ جائے۔ مگر تہذیب نے زبان پکڑ لی۔

موقع پا کر میں کھسکی اپنے کمرے کی طرف۔ گیلری میں ایک فوجی نوجوان نگار کو بری طرح بھنبوڑ رہا تھا اور وہ اُدن اُدن کر کے اُسے گھسوٹ رہی تھی۔

پلنگ پر لیٹ کر نہ تو نیند ہی آئی اور نہ ہی کچھ کام ہو سکا۔ دوسرے دن انسپکٹریس آنے والی تھی۔ مجھے اُس کو رجھانے کے لئے سو سو بناؤ کرنا تھے۔ سبق مؤثر ہو۔ انداز گفتگو

مرعوب کن لباس۔ مدبّرانہ اور چال ڈھال میں نرمی آمیز دبدبہ ـــــ جماعت کی توجہ۔ بورڈ کا استعمال ـــــ سوال وجواب کی اہمیت ـــــ میرے معزز پیشے کے شریفانہ گُر! لیٹے لیٹے میں یونہی ورزش کرنے لگی۔ پھر ایک دم مجھے خیال آیا جو کوئی مجھے اس طرح دیکھ لے تو کسی کی موجودگی کے خیال سے مجھے ایک دم تنہائی کا شدید احساس ہونے لگا۔ میں کتنی اکیلی ہوں سوائے اُن قہقہوں کے جو مہیب چٹانوں کی طرح سیٹھانی کے فلیٹ سے لڑھک لڑھک میرے دماغ سے ٹکرا رہے تھے۔ گھنگروں کی جھنکار اور تالیوں کی آوازیں ایکبارگی میرے جسم میں رینگ کہ ہزاروں نبضوں کی طرح پھڑپھڑانے لگیں۔ اور پھریری نے دماغ میں کروٹیں لینا شروع کیں ....

اگر ان کروٹوں کا ایک رُخ بھی کسی کو دکھائی دے جائے تو ـــــ نہ جانے کیا ہو۔ میں اسی خوف سے لرزا کرتی ہوں۔ مثلاً یہی کہ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے سیٹھانی بن سنور کر اپنے گاہکوں کو پیٹ کی خاطر لبھاتی ہیں ـــــ میں بھی کیل کانٹے سے دُرست ہو کر اپنے گاہکوں کے دربار میں جاتی ہوں۔ فرق اتنا ہے کہ میری عقل ـــــ وہی چُوسی ہوئی گنڈیری۔ اور سیٹھانی ـــــ یعنی مکمل رس کا گھڑا ـــــ میں دماغ بیچتی ہوں، سیٹھانی جسم! اور میرے دماغ کا مول سیکنڈ ہینڈ ٹائر کے برابر یعنی ستّر روپیہ اور سیٹھانی اپنی ایک انگڑائی میں اتنا کما لیتی ہے۔ کہ میرے ابّا حکومتِ برطانیہ کے اعلیٰ افسر ہونے کے باوجود ساری عمر میں نہ کما سکے! ہم دونوں ہی بازار میں اپنے اپنے خوانچے لگائے بیٹھی ہیں۔ مال مختلف مگر مقصد وہی۔ میرے مرجھائے ہوئے دماغ کی حیثیت اُن کے وسیع جسم کے آگے ایسی ہی ہے جیسے پان بیڑی کی دکان کے آگے کرکٹ کلب۔ یقیناً میرا سودا بُرا رہا۔ اور میں جلنے لگی اپنے تخیّل سے بھڑکائی ہوئی آگ میں۔ لوگوں کو طوائفوں پر رحم آتا ہے اُن کے سُدھار کی فکریں ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ غائب ہو جائیں ـــــ نہیں بلکہ جو بُری گت سے ہیں اُن کے دن پھر جائیں۔ اُن کے میلے کپڑے زرق برق ہو جائیں ـــــ سڑے بسے گندی نالیوں کے پاس جو مکان ہیں۔ وہ

"میرین ڈرائیو" پر پہونچ جائیں۔ گاہک آئیں مگر نہ اننے کہ اُن کا جی مَیلا ہو جائے۔ اور یہاں تنخواہ کا گریڈ ہر سال گر جائے کچھ پروا نہیں۔ طالب علموں یا دوسرے لفظوں میں دوزخ کے ڈھولوں کی تعداد دُگنی ہو جائے۔ ہیڈ معلمہ چوس ڈالے دفتر کے کلرک بھنبوڑ ڈالیں کمیٹی کے ممبر ڈکار جائیں —— کچھ پروا نہیں۔ استانیاں بچوں کے دماغ بنا رہی ہیں تو طوائفیں لاوارثوں کے دل کی ٹھنڈک —— دونوں ہی اپنا اپنا کام کر رہی ہیں —— پھر —— پھر یہ کیوں؟

جب رات بھر اپنی دماغی کشتی لڑی ہو تو انسپکٹرس کے سامنے کیا ناز و ادا چلیں۔ نتیجہ یہ کہ اس سال جو مستقل ہونے کی امیدیں تھیں رخصت! جو مسلسل روح فرسائی کا ارمان تھا ختم! اُف جس نے اپنی زندگی ہی قوم پر قربان ہونے کے لئے وقف کر دی ہو..... وہ..... مگر قوم ان ادہ مری گایوں سے گھن کھا چکی ہے —— یہ بیمار بکریاں —— ان سے قوم کو قے آتی ہے!

دوسرے دن سیٹھانی پھر آن پہونچیں —— اور مجھے ایسے نصیحت کرنے لگیں کہ کوئی میں بھی اُن کے پڑوس کی ہوں اور اندھا دھند زندگی گذار رہی ہوں ——

مٹاپے ہے بس ہر وقت پڑھنا —— اللہ مارا دماغ بھی ہل جاتا ہوگا ——"

میں منمنا کر چپ ہو رہی۔

"دیکھو تو کیا شکل نکل آئی ہے ——" انہوں نے رحم کھانا شروع کیا اور میرے دل میں بغاوت کا بھوت ناچا۔ یہ مجھے کیوں چھیڑتی ہیں خواہ مخواہ۔ یا اللہ یہ میں کہاں آگئی؟ اُوپر سے تو یہ عمارت بالکل شریفوں کے رہنے کی معلوم ہوتی ہے۔ بورڈ پر نام بھی شریفوں جیسے ہیں۔ مس کوٹینو —— مس واکر —— مسز عبداللہ —— مس رشید —— مسز

"وہ حمید صاحب تم سے پھر ملنے کو کہتے تھے ——" یہ وہی ایڈیٹر صاحب تھے! —— ارے تو کیا اس نے واقعی مجھ سے پیشہ کرانے کا پکا فیصلہ کر لیا؟ یعنی اپنے گاہکوں میں سے مریل مریل چھانٹ کر مجھے دینی جائے گی۔

"بھئی آج تمہیں ضرور سینما لیکر جاؤں گی ——" وہ اِٹھلائیں۔

"مگر مجھے تو —" واضح رہے کہ میرا پیشہ باعزّت ہونے کے علاوہ کافی محنت طلب ہے۔

"ارے ہٹاؤ بھی نہیں تو ہر وقت کام ہی رہتا ہے۔ حمید صاحب تمہارے لئے خاص طور پر پاس لائے ہیں اور تم ہو کہ ٹال رہی ہو — ارے ابھی تو ہنسنے بولنے کی عمر ہے —"

یا مولیٰ! — تو اب میرا مہذب پیشہ ختم اور یہ "ہنسنے بولنے" کا پیشہ شروع؟ —

توبہ اگر میری اماں بچاری کو معلوم ہو تو کیا حال ہو اُن کا — کہ اُن کی نیک بیٹی کو بہکایا جا رہا ہے اور یہاں تو سودے بھی ہو گئے، آج پاس آ رہے ہیں کل بنارسی ساڑھی پرسوں ہیرے کے بندے اور اترسوں وہ خود معہ اپنے مصوّرانہ خیالات کے۔ اور وہ پھر اُن کے وہ کھردرے سوکھے ہاتھوں سے سانچے بنا بنا کہ...... اللہ!

میں نے رکھائی سے انکار کر دیا اور وہ مضمحل سی بڑبڑاتی چلی گئیں۔

"توبہ ایسا بھی کیا — جبھی تو کہتے ہیں اتنا پڑھانا لکھانا بھی اچھا نہیں لڑکیوں کا —"

جی ہاں! کیوں نہیں — پڑھ لکھ کر کریں گی ہی کیا — آپ کا لطیف پیشہ سلامت رہے کیا ضرورت ہے کہ دماغ پچّی کرے کوئی؟ میری سمجھ میں نہ آیا کہ باوجود اتنی بدمزاجی کے مجھ میں کیا دلچسپی تھی جو بار بار پڑوسن آتی تھیں۔!

میں کاپیاں درست کرنے لگی۔ یا خدا یہ فیل ہونے والے بھی جان جان کر جلاتے ہیں۔ جی چاہتا ہے صفر سے بھی کوئی ذلیل تعداد ہو تو وہ نکال کر دوں انہیں۔ مریں کمبخت جی چاہا جو فیل نہیں ہوئیں ان کو بھی فیل کر دوں — تاکہ سب کی سب سیٹھانی کی طرح تباہی کے غار میں گر پڑیں۔

پھر ایک دم سے میں نے سوچا نہیں — یہ تو نہایت عجیب سزا ہو گی — بہتر یہی ہے کہ میں انہیں اپنی طرح قوم کی خدمت کے لئے باہمت اور محنتی استانیاں بنا دوں — تاکہ — تاکہ — وہ بھی......

آگے سوچنے کی طاقت زنگھیا کر رہ گئی۔

سیٹھانی اور نگار ہنستی کھلکھلاتی حمید صاحب اور دو چار دوسرے کھنکتے ہوئے عاشقوں کے ساتھ

سینما گئیں۔ جب وہ آئیں تب بھی میں جاگ رہی تھی۔ جہاں غنودگی آئی اور عفریتوں نے دانت نکال کر حملہ کیا۔ بھلا اس طرح کون کام کر سکتا ہے۔ دو چار دن اور رہی رنڈی کے پڑوس میں تو نہ جانے کیا ہو۔ میرے خیالات دن بدن اُلجھتے جا رہے تھے۔ خود اپنے ضمیر سے بات کرتے ڈر لگتا تھا کہ جانے کمبخت کیا بول اُٹھے۔

میں سر پکڑے پلنگ پر بیٹھی رہی — تھکی ہاری سیٹھانی سو گئی تھی — فلیٹ پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چند واہیات خیالات دل میں جھانکے۔ ذرا ڈھیل دی تو ریلے کا ریلا ٹوٹ پڑا — قہقہے پر قہقہہ میرے دماغ میں سے اُبلنے لگا مگر میرا چہرہ نہ ہنسا۔ ..... عزت۔ پاکبازی ...... گندے انڈے کی طرح پوٹے کے نیچے دبائے بیٹھے رہو ..... تو کیا اسمیں سے سُرخاب نکلے گا؟ اور پھر تماشا یہ کہ کوئی بھی اس گندے انڈے کی سیوا کا پھل نہیں دیتا — قوم کو ذرا بھی احساس نہیں ..... کہ ایک دیوی یوں پارسائی کا ٹپارہ اٹھائے۔ تو بہ جی چاہا اُٹھا کر بیچ سڑک پر ایسی جگہ پھوڑ دوں کہ ہر آنے جانے والا غلاظت سے لتھڑ جائے۔ یہ مجھے کیا ہو رہا تھا — یہ سب اُس رنڈی کے پڑوس میں رہنے سے ہوا! مجھے فوراً اپنی سہیلی بنّیا یاد آ گئی! اُف بنیا کتنی حسین اور چلبلی تھی! اور وہ پھر مسلسل نو سال پڑھاتی رہی ..... اور پھر ایک دن بوکھلا کر اُس نے ایک غلیظ بوڑھے سے شادی کر لی ..... وہ تو کہتی تھی کہ اُس کی قومی خدمات کو دیکھ کر اُس پر عاشق ہو گئی تھی۔ وہ سولہ برس جیل کاٹ کر آیا تھا۔ اور کسی زمانہ میں حسین بھی تھا۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ بنیا قوم کی خدمت کی آڑ لے رہی ہے۔ جیسے سیٹھانی برہنہ تصویروں کی آڑ لیتی ہے۔ دراصل بھوک میں کواڑ پاپڑ ہو جاتے ہیں۔

میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ فلیٹ بدل دونگی۔ ورنہ جوہر بے بہا کیچڑ میں جا پڑے گا۔ اور وہ دولت جس کے پیچھے مشرقی عورت جان دے دیتی ہے مٹی میں مل جائے گی۔ دنیا میں عورت کے پاس یہ عصمت ہی تو ایک شے ہے جسے کوئی پیٹ کی خاطر لٹاتی ہے تو کوئی اُس کی خاطر جان لٹا دیتی ہے لے دے کے یہی ایک ترپ کا اکّہ ہے جو ہر داؤں پہ مار سکتی ہے۔

تھک ہار کر خیالات میں الجھی سونے کی کوشش کرنے لگی۔

صبح اُٹھ کر میں جب نیچے جانے لگی تو سیٹھانی پھل والے سے کھڑی اُلجھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر غیروں کی طرح منہ پھیر لیا۔ فخر سے میرا سر اُونچا ہو گیا۔ آخر کو اسے معلوم ہو ہی گیا کہ میں شریف ہوں ---- اور وہ بازار کی جنس!

اس کے دو چار دن کے بعد کا ذکر ہے کہ میرے ماموں زاد بھائی اور اُن کی بیوی آئے ---- جب سے میں نے یہ فلیٹ لیا تھا میں ڈر رہی تھی کہ وہ شاید یہ سُن کر چراغ پا ہوں کہ میں ایسے پڑوس میں رہتی ہوں جیسے ہی وہ آئے سیٹھانی کے فلیٹ سے قہقہے بڑے بڑے چٹانوں کی طرح لڑھک لڑھک کر گرنے لگے ---- میں نے اُٹھ کر نفرت سے دروازہ بھیڑ دیا۔

"کمبخت ہر وقت بدتمیزیاں ہوتی رہتی ہیں ----"

"کہاں؟"

"یہاں ---- کمبخت ایک طوائف رہتی ہے ---- ہر وقت ٹھٹ لگے رہتے ہیں۔"

"طوائف؟ ---- یہاں؟ ---- مگر یہ تو نگار کی آواز تھی ----" وہ چونکے۔

"ہاں ---- آپ جانتے ہیں انہیں ----؟" میں نے معنی خیز نظروں سے اُنکی بیوی کو دیکھا۔

"ہاں ہاں بھئی ---- ارے تم نہیں ملیں ان سے ---- میں نے نگار کے ٹانسلز کا اپریشن کیا تھا ---- ارے یہ تو بڑے خاندانی لوگ ہیں ----"

"یہ ---- یہ ---- سیٹھانی ----"

"ہاں بھئی ---- سیٹھ عبداللہ کی بیوی ---- سر عبدالکریم کے خاندان میں سے ہیں ---- اور دلّی کی ہیں انکی بیوی ---- چشتیوں کے خاندان کی ہیں ---- اور ---- رضیہ کی خالہ لگتی ہیں ---- "ممانی"۔ رضیہ بولیں اور میں حیرت زدہ ان عبرتناک زلزلوں کو چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ سُن رہ گئی جیسے میں نے کسی مقدس کتاب میں ٹھوکر ماردی ہو ---- اور کفارہ؟ ---- کفارہ میرے امکان سے باہر ہو۔

"تو ---- تو ---- وہ کوئی دوسرا فلیٹ ہوگا ----" میں نے ہکلا کر کہا۔

اختر اورینوی

تاریک سائے

رات کا وقت تھا۔ چاند کی گیارھویں تاریخ۔ قصبہ کی پرانی خانقاہ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ بڑے شکستہ حال پھاٹک سے لیکر صدر نشیں تک بھانت بھانت کے لوگ قوّالی سننے کے لئے آنکھیں لگائے گوش بر آواز بیٹھے تھے۔ پھاٹک کے سامنے مسجد کے قریب چھتنار مگر گھنیرے برگد کے درخت کے نیچے چھوہارے، مٹھائیاں، ریوڑیاں، مکھانے اور پھولوں کے ہار بیچنے والے اپنا سودا فروخت کرنے کو ہانک پکار لگا رہے تھے۔ لڑکے شور کرتے ہوئے مٹھائیاں خریدنے میں منہمک تھے۔ خانقاہ کو آنے والی گلیوں سے گذر کر جوق در جوق رنگین لباس عورتیں مسلسل باتیں کرتی ہوئی تیز تیز خانقاہ کی حویلی میں داخل ہو رہی تھیں۔ ہارمونیم کی ریں ریں پیں پیں اور طبلہ کی بے ڈھنگی تھاپ اور ٹھوکے سنائی دینے لگے تھے۔ رفتہ رفتہ گلیاں عورتوں سے خالی ہوتے ہوئے سنسان ہو گئیں۔ عُرس میں شریک ہونے والے "مخلص" نوجوان بھی اپنے اپنے "مورچوں" سے ہٹ گئے۔ قصباتی اور گرد و نواح کے دیہاتی، سب لوگ خانقاہ کے احاطے میں جمع ہو گئے۔ حویلی کی ڈیوڑھی سے ملی ہوئی دیوار کے سایہ میں عورتیں، جوان لڑکیاں اور ننھے بچے بچیاں بھی

ہجوم کئے ہوئے شریکِ محفل تھیں۔ پردہ کا انتظام اتنا ضرور تھا کہ مستورات کی طرف گیس بتّی نہیں لگائی گئی تھی اور شامیانے کے اُس مردانہ پہلو کو بھی اندھیرا اندھیرا ہی چھوڑ دیا گیا تھا جو نسائی سرحد سے ملا ہوا تھا۔

خاص خاص اہلِ حلقہ آچکے تھے۔ بوڑھے گدی نشین بھی تقدّس و تمکنت کے ساتھ آئے اور گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھ گئے۔ مگر قصبے کے دو رئیسوں کا انتظار تھا جن کی آپس کی چشمک اُنہیں سب سے بڑا بننے کے لئے سب سے دیر میں آنے پر مجبور کر رہی تھی۔ مجمع کُنمنا رہا تھا، قوّال اور سازندے کسمسا رہے تھے اور گدی نشین اپنی اگلی ریاست کو یاد کر کے کباب سیخ ہوئے جاتے تھے۔ پر انتظار لازمی تھا۔ ورنہ عُرس کا خرچ کیسے چلتا۔

چھوٹے سرکار نے کہلا بھیجا کہ قوّالی شروع کی جائے۔ وہ درگاہ پر فاتحہ پڑھ کر حاضر ہوتے ہیں۔ بڑے سرکار یہ دریافت کر کے اپنے بنگلے پر سے چل چکے تھے کہ چھوٹے سرکار جا چکے ہیں۔ اور ہُوا یہ کہ بڑے سرکار خانقاہ میں پہلے پہنچ گئے اور اس کے بعد چھوٹے سرکار مسکراتے ہوئے داخل ہوئے۔ محفل جاگ اُٹھی اور مجلسِ سمع شروع ہو گئی۔ مگر بڑے سرکار پژمردہ رہے ....

خواجہ پیا موری رنگ دے چوندریا رنگا دے چوندریا

عیدو چوٹہ پہارے اور شاہ رنجور حسین کو اس پر خوب حال آیا۔ شاہ رنجور پہلے دونوں ہاتھوں سے چٹکی بجانے لگے۔ جب گت اور تیز ہوئی تو مٹھیاں کھولتے اور بند کرتے۔ قوّال آہنگ کو اور تیز کر دیتا۔ شاہ رنجور یک دم "ہُو" کا نعرہ لگا کر کھڑے ہو جاتے۔ سامعین بھی اُن کے گرد حلقہ بنا کر اُٹھ کھڑے ہوتے۔ قوّال اور سازندے بھی استادہ ہو جاتے۔ شاہ رنجور اب دونوں ہاتھوں سے سینہ کوبی کرتے اور وزن کے ساتھ فضا میں انہیں ہر سمت مختلف زاویوں میں پھیلاتے اور سکوڑتے۔ "رنگ دے چوندریا، رنگا دے چوندریا.... رنگا دے چوندریا.... رنگا دے چوندریا...." نغمہ کی روانی اور حدّت بڑھتی جاتی اور ہم آہنگی

کے ساتھ شاہ رنجور کی حرکتیں یہاں تک کہ شاہ صاحب اُسی تال پر رقص کرنے لگے۔ مجمع میں شور مچ گیا۔ حویلی کی جانب عورتوں اور مردوں کی سرحدیں خلط ملط ہونے لگیں اور سجادہ نشین کے چھوٹے صاحبزادے نے امن قائم کرنے کے لئے سب سے پہلے اُس محاذ کا رُخ کیا۔ لونڈوں کو ڈانٹا، لڑکیوں کے کاندھے پکڑ پکڑ کر پیچھے ہٹایا اور حفظِ ماتقدم کے خیال سے جب تک اہلِ عرفان کو حال آتا رہا وہیں تکلیف فرما کر کھڑے رہے۔

عشقیہ اُردو غزلوں پر قصبہ کی نوجوان لڑکیاں سرگوشیاں کرنے لگتیں۔ کوئی کسی کو گدگدا دیتا۔ کہیں سے قلقاریوں کی آواز آتی اور کسی جانب سے دبی ہوئی ہنسی کے بلبلے چھوٹتے۔

"تو وہ گُلِ خوبی ہے اے جلوۂ جانانہ
ہر گُل ہے ترا بلبل، ہر شمع ہے پروانہ"

قوّال یہ غزل گا رہا تھا۔ نورا نے فخرن کی چٹکی لی اور کہنے لگی۔

"تمہارے پروانے کہاں ہیں؟"

فخرن نے جواب دیا.... "ہم کیا بہن! بھری محفل میں گیس بتّی کی طرح تو تم چمکتی ہو۔"

نورا در اصل یہی باتیں کہلوا کر زینن کو جلانا چاہتی تھی جو پاس ہی کھڑی تھی۔ زینن گداز بدن کی خوبصورت لڑکی تھی، مگر نورا جیسی شوخ چنچل نہیں۔ نورا بھی خوش رُو تھی اور ہر بھلی صورت لڑکی سے جلتی تھی۔ اگر نورا کو یہ پتہ چل جاتا کہ فلاں لڑکی سے فلاں لڑکا دلچسپی رکھتا ہے تو وہ اپنی ساری ادائیں اس بات پر صرف کر دیتی کہ اُس لڑکی کو شکست دے کر دلچسپی کا مرکز خود بن جائے۔ نورا نے کتنے نوجوانوں سے رومال، سینٹ، پاؤڈر اور اسی قسم کے اور چڑھاوے وصول لے تھے۔ زینن۔ فخرن، نورا اور دوسری لڑکیاں چہل کرتی رہیں مگر فہمیدہ خاموشی سے ایک طرف بیٹھی بڑی یکسوئی سے قوّالی سنتی رہی۔ وہ ایک سپاٹ سی لڑکی تھی۔ تندرست، سیاہی مائل سانولی، چوڑی ناک والی، گھامڑ اور کم سخن۔ بڑی بوڑھیاں اُسے پسند کرتی تھیں۔ کیونکہ وہ اپنے شباب میں بھی اُنہیں نا کردہ گناہوں کی حسرت اور کردہ گناہوں کی یاد دلا کر آتش زیر پا

نہیں کرتی تھی۔ مگر نوجوان اور سیماب وش لڑکیاں اُس سے بالکل بے توجہی برتتی تھیں۔ فہمیدہ کسمپرسی اور بے التفاتی کے سبب صفحۂ ہستی پر ایک نقطۂ مجہول ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی جوانی ایک گلوگیر سوال تھی، جس کا اب تک اُسے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ اُس کی بھابیاں بھی اُس سے مذاق تک نہیں کرتی تھیں۔ کوئی لڑکی اُسے شرارتاً بھی کسی لڑکے سے منسوب نہیں کرتی تھی۔

اس قوالی کی محفل میں بھی فہمیدہ کچھوے کی طرح اپنے خول میں سُکڑی رہی۔ بھٹس، الگ تھلگ مگر بیزار اور بھُبل کی آگ کی مانند سُلگتی ہوئی۔ وہ خوش باش، چنچل لڑکیوں کو دیکھتی اور کُڑھتی رہی۔ فہمیدہ نورا سے بالکل مختلف تھی۔ نورا بھرا بھادوں تھی تو فہمیدہ سوکھا جیٹھ۔ مگر جس طرح رات کے دل میں دن کا پیار ہوتا ہے۔ اسی طرح نورا فہمیدہ کے لئے معیارِ تمنا تھی......

۵

به حیرتم که عجب تیرِ بے کمان زدی
درونِ سینۂ ما زخم بے نشان زدی

قوّال نے اب فارسی چیزیں شروع کی تھیں۔ عید دچوڑ بہارا، شاہ رنجور، کلّو نانبائی منشی کرامت اور فرخ سائیں، سب کہنہ مشقوں کو دھوم دھام سے حال آنے لگا۔ مجمع کا مجمع استادہ تھا اور رقص و نغمہ کا کورس اس آزادی کے ساتھ شروع ہوا تھا کہ ہر حرکت اپنی جگہ پر نرالی اور بے جوڑ تھی۔ عالمِ لاہوت و ناسوت اور ملکوت و جبروت سب گڈمڈ ہو کر نیرنگِ تماشہ بن گئے تھے (اس مجلس میں شاہِ رنجور کے علاوہ منشی کرامت اور گنبد والے سائیں خاص چیز تھے)

منشی کرامت دوزانو ہو کر قعودِ نماز کی حالت میں سجادہ نشین کی طرف رُخ کر کے بیٹھے تھے۔ گدّی کی رُوحانی برکت یہ تھی کہ انہیں فارسی نہ جانتے ہوئے بھی صرف فارسی غزلوں ہی پر حال آیا کرتا تھا۔ ع درونِ سینۂ ما..... بس 'سینہ' کا لفظ آتے ہی اپنا بایاں ہاتھ انہوں نے اپنے دل پر رکھ دیا۔ اور پھر "ہو" کہہ کر سکتہ میں آ گئے۔ تھوڑی دیر میں دونوں ہاتھ سینہ

پر رکھ لیئے نشست وہی رہی۔ یک بہ یک کمر سے وہ یوں جھکے کہ بیٹھے بیٹھے کوئی شے تلاش کر رہے ہوں۔ گردن بہت آگے بڑھ گئی، سینہ فرش کی سطح سے مل گیا، پاؤں مڑے کے مڑے رہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب منشی جی قلابازی کھائیں گے۔ مگر بجائے اس کے وہ سینے کو فرش سے اس طرح ملنے لگے جیسے ذبح کی ہوئی بط تڑپ رہی ہو۔ راگ کی آنچ تیز ہوتے ہی انہوں نے دونوں ہاتھوں کو سر کے آگے فرش پر یوں پھیلا دیا جیسے اب پانی میں چھلانگ لگا کر تیرنے والے ہوں۔ کمر سے نیچے دو زانو ہیں، اوپر کا جسم مشین کی طرح دائیں بائیں لوٹ پوٹ ہو رہا ہے۔ "ہُو ہُو" کی آوازیں آ رہی ہیں۔ لحظہ بہ لحظہ حرکت تیز ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اسی بیٹھک اور جھکاؤ کے ساتھ پھدکتے ہوئے حلقہ کے چاروں طرف رقصِ بسمل کرنے لگے۔

فرخ سائیں نے ایک جست لگائی اور حلقہ کے عین وسط میں سگنل کے کھمبے کی طرح کھڑے ہو گئے۔ گردن، سر، چہرہ، داہنا ہاتھ اور شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اشارہ کناں۔ بایاں ہاتھ داہنے سے زاویہ قائمہ بناتا ہوا بوڑھے سجادہ نشین کی طرف پھیلا ہوا تھا اور ایک انگلی بھی راہِ طریقت کا پتہ بتلا رہی تھی۔ اسی عالمِ جذب و حیرت میں وہ پہروں کھڑے رہے اور ان کے گرد "جوجٹو" کے کرتب دکھلائے جاتے رہے۔ مجمع کبھی اٹھتا اور کبھی بیٹھتا تھا۔ جب کسی کو بحرانی طور پر حال آتا تو قوال، سازندے اور سارا مجمع اسے حلقہ میں لیکر استاد ہو جاتا۔ محفل میں گڑبڑ سی مچ جاتی۔ تماشہ کے شوقین ایک دوسرے کی گردن اور کاندھوں پر چڑھے جاتے۔ پچھتے دار رنگ برنگی ساریاں، چکنی لگے ہوئے شلوکے، اور خود نما جوانیاں شوقِ تماشہ اور جوشِ نمائش میں اپنے قرینوں سے ہٹ کر حلقہ کی طرف دھنسی پڑتیں۔ بڑی بوڑھیاں ڈانٹ بتائیں اور موقعہ شناس نوجوان فصیل کی طرح راہ روک لیتے تو سیلاب ذرا تھمتا

فہمیدہ عام زندگی کی ان موجوں کو اٹھ اٹھ کر بکھرتے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ اپنی زندگی کی اندھیری کوٹھڑی کو پلٹ کر دیکھنے لگتی۔ دن دن بھر گھر میں بیٹھے رہنا کام کرنا اور پلنگ کی

قبر میں پڑ رہنا۔ کوئی اسے چھیڑتا بھی تو نہ تھا۔ چھوٹے بھائی بہن اسے دِق بھی نہ کرتے تھے۔ وہ نورا کو دیکھتی کہ اس کے بھائی بہن اُس سے لپٹے رہتے ہیں۔ کوئی اُسے چپت مار کر بھاگ جاتا کسی کو وہ ایک دھول لگاتی ہے۔ کوئی اس کی پیٹھ پر آکر لد جاتا ہے تو نورا اُسے پلٹ کر گود میں لے لیتی اور چاخ چاخ اس کے بوسے لینے لگتی ہے۔ محلّے کے بچے تک اُس سے شوخ تھے اور نورا سب کے ساتھ کھیل میں دوڑی دوڑی پھرتی تھی۔ کبھی آنکھ مچولی، کبھی ڈینگی پانی، کبھی کھٹوا چوری اور گاہے تار کا ٹو تر کن کا ٹو۔ آج دیکھو تو پہیلیاں بجھائی جا رہی ہیں، اور کل ہے کہ نورا بیچ پلنگ پر چت لیٹی ہوئی ہے۔ اپنے بھائی بہن اور پرائے لڑکے پھڑکے اس کے گرد گھنگرو کی طرح گھیرا ڈالے ہوئے اُسے مل دل رہے ہیں۔ نورا بیچ بیچ میں زور سے یونہی چیخ پڑتی، نام کا احتجاج کرتی اور خود کسی کے گال مل دیتی، کسی کے کان اُمیٹھتی اور کسی کی ناک ہلا دیتی۔ اور پھر دیکھو تو اپنے دونوں مڑے ہوئے پاؤں پر کسی لڑکے کو بٹھائے "گھگھو امیری لدا چاول کی ڈھیری" کا جھولا جھلا رہی ہے اور "نئی دیوار اُٹھے پرانی دیوار گرے" کی صدا لگاتے ہوئے وہ لڑکے کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی ٹانگیں اونچا اُٹھا لیتی، پھر اُس کے ہاتھ چھوڑ دیتی۔ وہ ڈھب سے اُس کی گود میں لُڑھک آتا اور نورا اُسے چمٹا کر زور زور سے ہنسنے لگتی۔ . . . . . اور بیچاری فہمیدہ! اُسے تو ہر کس و ناکس نیک، بے زبان، سخن شنو، ہنسنی سمجھتا تھا۔ وہ چاہتی بھی کہ کسی سے لڑ پڑے، کسی کی بات نہ مانے، بچّوں کو پیٹ پاٹ دے، بڑی بوڑھیوں سے دیدہ دلیری کے ساتھ منہ لگی باتیں کرتی چلی جائے، سکڑ سکڑا کر حیادار بنی نہ بیٹھی رہے آنچل، سر، سینہ و شانہ کی بالکل پروا نہ کرے، دروازے پر جا کر کھڑی ہو، دریچے سے جھانکتی رہے مگر وہ ایسا کر نہیں پاتی تھی۔ اس کے دل کی انجان گہرائیوں سے سرکشی کے بہت سے مبہم تاریک سائے اُبھرتے مگر کوئی سایہ بھی سرپھرا بھوت بن کر اُس کے سر پر سوار نہ ہوتا۔ اُسکی نس نس اور رگ رگ میں حرکت و عمل کی لہریں اُٹھ اُٹھ کر بے طوفان بنے پسپا ہو جاتیں۔ اور فہمیدہ کڑھتی رہتی، سلگتی رہتی، بیزار، نڈھال، اپنے آپ سے اُکتائی ہوئی۔ وہ چڑچڑی

ہونے کی بھی قدرت نہیں رکھتی تھی۔ کڑوی کسیلی دلچسپیوں کے ساتھ کارواں در کارواں رواں دواں تھے۔ اُسے اپنے گھر میں محلے کی عورتوں سے دوسروں کے شکوے شکایت، لڑائی جھگڑوں کے قصے، جگ ہنسائی کی کہانیاں، بے حیائیوں کے چرچے، رُسوائیوں کی داستانیں سُننے میں بڑا مزا آتا تھا۔ اس کی ماں چچی اور دادی کے سامنے محلے والیاں یا رشتہ دار عورتیں اکثر اس طرح کی غیبتیں لے بیٹھتی تھیں اور وہ چُپ چاپ، گول مٹول بنی، آنچل سنبھالے، بے حِس سی، الگ تھلگ ساری باتیں سنتی رہتی تھی۔ اس کا جی چاہتا کہ ان باتوں میں حصّہ لے لوگوں سے کُرید کُرید کر پوچھے، بڑوں سے نہ سہی، اپنی ہم عمر جوان لڑکیوں ہی سے سہی۔ مگر اُس سے بن نہ پڑتی اور وہ خاموشی کے ساتھ ان واقعات سے حریصانہ دلچسپی لیتی رہتی۔ کبھی کبھی کچھ دھندلے نقطے اس کے دل کے اندر اُبھرنے کی سعیٔ رائگاں کرتے۔ وہ یہ سوچنا چاہتی کہ نورا کی طرح اس کے چرچے ہوں، زینت کی مانند لوگ اُس پر اُنگلیاں اٹھائیں اور یہ سب کچھ اس لئے کہ چند رنگین رومال اور ایک دو سینٹ کی شیشیاں اس کے پاس کسی ذریعہ سے آگئی ہوں۔ اب اس "کسی" کے متعلق اُس کا تصوّر واضح ہونے سے ڈرتا تھا......

محفلِ حال وقال ہوتی رہی۔ فہمیدہ نوجوان لڑکیوں کی چہل پہل دیکھ دیکھ کر کبھی کُڑھتی اور کبھی اپنی اور دوسروں کی زندگی کے بارے میں سوچنے لگتی۔ کبھی اہلِ حال کی حرکتوں میں اُسے بڑا لطف آنے لگتا، مزاحیہ انبساط نہیں بلکہ سنجیدہ اور گہری مسرّت۔ اس کے جذبات دل کی فسردہ اور منجمد تاریکیوں سے نکل کر صاحبانِ حال کی جست وخیز سے ہم آہنگ ہو جاتے اور پُرشور رقص کرنے لگتے۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ بھی دوسری نوجوان لڑکیوں کی طرح صفِ اوّل میں جا کھڑی ہو اور اُس انقلابی لمحے سے اپنی زندگی کا دھارا ہی بدل دے...
مجلس سماع اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔ قوّال امیر خسرو کی غزل گا رہا تھا۔

۵

خلق مے گوئید کہ خسرو بُت پرستی می کند
آرے آرے می کنم با خلق کار و بار نیست

شاہ زنجور نے بوڑھے سجادہ نشین کا ہاتھ پکڑ کر اُنہیں حلقۂ حال میں کھینچ لیا اور سینہ بہ سینہ ہو کر دونوں رقص و وجد میں مشغول ہو گئے۔ دوسرے کہنہ مشق اور نو آموز بھی اس عجیب و غریب قماش رقص کے بنانے میں مدد دے رہے تھے

مجمع کا مجمع پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ عورتوں اور مردوں کی ملتنا نزع سرحد میں بڑی گڑبڑ مچی۔ نورا، زینبؔ، فخرنؔ اور دوسری لڑکیوں نے آخری تماشہ کو جی بھر دیکھنے کے شوق میں سجادہ نشین کے چھوٹے صاحبزادے ہاشم کی روک تھام اور پکڑ دھکڑ کی بھی پروانہ کی اور جہاں تک بڑھ سکتی تھیں شامیانے میں بڑھتی چلی گئیں۔ فہمیدہ کے من میں بھی موج اُٹھی۔ ہاشم کے بھرے بھرے بازوؤں سے چھو جانے کے لئے اُس کا پہلو بھی تڑپ اُٹھا۔ اُس کے مضبوط پنجوں سے ہلائے جانے کے لئے فہمیدہ کے شانے بھی آمادۂ پرواز چکورہ کی طرح لرزاں ہوئے۔ مگر وہ اپنی جگہ سے اُٹھ نہ سکی۔ اُس کے پاؤں میں من من بھر کی زنجیریں پڑ گئیں۔ محفل ختم ہو گئی اور وہ ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح بجھی ہوئی بیٹھی رہی۔

بالو کے ٹیلے کے نیچے دریا کے کنارے پُرانی درگاہ کی چہار دیواری کی اینٹیں دُور دُور تک بکھری ہوئی تھیں۔ ایک عظیم الشان پیپل کا پیڑ درگاہ کے دروازے پر پاسبانی کر رہا تھا۔ پچھم طرف دریا کا دھارا چاندنی میں ملفوف ہو کر اتنی دھیمی چال سے چل رہا تھا کہ روانی کے احساس کی جگہ سکون و قرار کا تھپک دینے والا سرد پیدا ہوتا تھا۔ زندگی کی ابدیت میں ٹوٹی ہوئی قبریں، شکستہ حال گنبد، رخنہ رخنہ دیواریں اُس کی وسعت و تسلسل کا محض ایک سنجیدہ رُخ معلوم ہوتی تھیں اور بس۔ اُن میں مغمومی کا کوئی پہلو نمایاں نہیں تھا۔ درگاہ کے پورب جانب ٹنگھر کی دکانیں نصب کی گئی تھیں۔ قصابانی ہوٹل والوں، حلوائیوں، بزازوں،

چوڑیہاروں، پرچون فروشوں نے اپنی اپنی منڈلی الگ جمائی تھی۔ چاروں طرف بالو کے ٹیلے کے ڈھلوان پر اور ساحل کے میدان میں عورتوں اور مردوں کی ٹولیاں لگی ہوئی تھیں۔ دُور دُور گاؤں سے آئی ہوئی بیل گاڑیاں اِدھر اُدھر سرڈالے کھڑی تھیں۔ کہیں عورتیں بیل گاڑی پر بانس کی کماچیوں سے مڑھے ہوئے پردوں سے جھانک رہی تھیں۔ کہیں لڑکے گاڑی کے پچھلے حصّہ سے لٹکے ہوئے جھول رہے تھے۔ کہیں مرد اور عورتیں اپنے محمل کے سائے میں بیٹھے کھانے پینے اور باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ سفید، خوبصورت تنومند بیل بالو پر چاندنی میں بیٹھے پاگر کرتے اور کبھی کبھی اپنی گردنوں کے گھنگروؤں اور کوڑیوں سے نرم سی جھنکار پیدا کرتے ہوئے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ دوکانوں میں خرید و فروخت بھی ہو رہی تھی۔ بعض دوکانداروں نے گیس بتی جلا رکھی تھی۔ سب سے زیادہ بھیڑ بھاڑ چوڑیوں کی دوکان پر تھی۔ وہاں رنگ و نور کا تنوع منظر کی عام سادگی کے مقابل نہایت ہی نظر نواز طور پر نمایاں تھا۔ رنگ برنگی چوڑیوں کے ساتھ رنگا رنگ ساڑیوں اور کرتیوں کی چھوٹ اور نوخیز سانولے، صندلیں، گلنار چہروں کی دمک، آرزو انگیز بہار پیدا کر رہی تھی۔ قصبے کے نوجوان لڑکے رنگین قمیصیں، طرحدار لُنگیاں پہنے مٹرگشت کرتے ہوئے دیہاتیوں پر پھبتیاں کس کس کر لڑکیوں کو گھور رہے تھے۔ دیہاتی لڑکے چمکدار لاٹھیوں میں تیل لگائے اور گلابی یا زرد پگڑیاں پہنے گاؤں کی لڑکیوں کو چوڑیاں پہنوا یا مٹھائیاں خرید وا رہے تھے یا محض پاسبانی کا فرض انجام دے رہے تھے۔

جب آدھی رات کو سائیوں کا غول نعرے لگاتے ہوئے شاہ صاحب کو قدیمی خاندانی خرقہ پہنا کر خانقاہ سے درگاہ لایا تو خلقت درگاہ کی طرف ٹوٹ پڑی۔ قوّال، سازندے اور اکثر تماشہ بین اُٹھ کر درگاہ آ گئے۔ مرد درگاہ کے وسیع صحن میں جمع ہو گئے اور عورتیں نیچی شکستہ چہار دیواری کے گرد اگرد جھومر کی طرح کھڑی ہو گئیں۔

نورا، فخرالنّ، زینبؔ اور دوسری لڑکیاں بھی خانقاہ سے نکل کر بسنتی کا چکر کاٹتی ہوئی

بالو کے ٹیلے پر ہو کر درگاہ کی طرف آئیں۔ کنارے کنارے سے عرس کے میلہ کا تماشا دیکھتی ہوئی گذریں اور درگاہ کے قریب ایک چھوٹے سے مقبرہ کی آڑ میں بیٹھ کر انہوں نے رشتہ کے چھوٹے لڑکوں کی وساطت سے مٹھائیاں منگوائیں، چوڑیاں خریدیں، ہوٹل کی چائے پی۔ خوب خوب چہلیں کیں، ٹیلے کے ڈھلوان پر دوڑیں، فضا میں ابلتی ہوئی ہنسیاں بکھیریں اور قہقہوں کے خم لنڈھائے۔ قصبے کی اور عورتیں آہستہ آہستہ اپنے اپنے گھروں میں کچھ رک رک کر بعد میں آئیں تب کہیں ان چنچل کماریوں کی رنگ رلیوں پر اوس پڑی۔ فہمیدہ بھی ان ہی عورتوں کے ساتھ آئی۔ سب میلے کا تماشا دیکھتی ہوئی درگاہ کی چار دیواری کی پچھم جانب پہنچ گئیں اور قوالی سننے لگیں۔ مخدوم صاحب کی قبر پر سبز چادر چڑھی ہوئی تھی اور اس پر پھولوں کے لانبے لانبے ہار۔ ہر جانب لوبان دانیوں میں لوبان اور اگر کی بتیاں جل رہی تھیں اوپر ایک شامیانہ سا تنا ہوا تھا اور اس میں رنگین قمقمے اور قندیلیں آویزاں اور تابناک تھیں۔ درگاہ میں قوالی دھوم دھام سے شروع ہوئی۔ سب لوگ محو تھے۔

نورا کی شہرت بڑے اور چھوٹے سرکار کے نونہالوں تک پہنچ چکی تھی اور اب کے چند صاحبزادگان عرس کی تقریب سے فائدہ اٹھا کر نورا کو جی بھر دیکھنا چاہتے تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ قوالی کی گرماگرمی میں نورا کے چھوٹے بھائی کے ذریعہ اسے کسی بہانے دریا کی ریت پر بلا یا جائے۔ بڑی بوڑھیوں نے انہیں منڈلاتے دیکھ لیا تھا اور ایک مبہم خوف کے سبب حفظ ما تقدم کے طور پر نورا کی ماں اسے رہ رہ کے آواز دیتی تھی تاکہ وہ دور نہ جا پڑے۔ مگر نورا تو تھرکتا ہوا پارہ تھی۔ ابھی اس جانب ہے اور ابھی اس طرف۔ بڑی اور چھوٹی حویلی کی فیشن ایبل لڑکیوں سے ملنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ جب دیکھو گھوم پھر کر ان کے پاس پہنچی ہوئی ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ایوب اور افضال کے بارے میں یہ پڑھی لکھی لڑکیاں بھی اسے چھیڑیں۔

فہمیدہ چار دیواری سے لگی قوالی سننے سے زیادہ مجمع کی گھما گھمی کو دیکھ رہی تھی اس کی

خاموش، تنہا، بے حرکت، سرد زندگی اس شور، اس اجتماع، اس رقص و وجد، اس گرما گرمی کو شدّت سے محسوس کر رہی تھی۔ جیسے کسی غار میں پانی تیزی سے بہتا ہوا داخل ہوتے ہوتے گرداب پیدا کر دے، ویسے ہی اس کے دل کے عمق میں عُرس کے میلہ کے سارے تاثرات بڑی روانی اور تکمیل کے ساتھ داخل ہو کر اس کے خیالات کو چکرا رہے تھے۔ وہ قصبے کی شوخ و شنگ لڑکیوں سے الگ تھلگ تھی۔ نورا، زینی، فخری یہ سب زندگی کے دھارے کا ایک حصّہ بن کر حیات کے اجزا کو محسوس کر رہی تھیں۔ مگر فہمیدہ ساحل پہ بیٹھی محوِ تماشہ تھی۔ اُسے زندگی کے ٹکڑے ٹکڑے کا بھی احساس تھا اور بھرپور مجموعی مکمل زندگی کا بھی اس کی ہر حس بیدار تھی۔ وہ مجمع کو صرف آنکھوں ہی سے محسوس نہیں کر رہی تھی۔ بلکہ اپنے کانوں، اپنی ناک، اپنی جلد کے ہر مسام، اور اپنے چونکے ہوئے بدن کے اعصاب کے ہر کنارے سے۔ فہمیدہ کے سامنے زندگی زیادہ آشکار ہو کر شاید اُس کی آرزوؤں کے لہو رلانے کا خون بہا پیش کر رہی تھی۔ فہمیدہ خبر اور بے خبری کے عالم میں عجیب تجربے سے گذر رہی تھی، جہاں یاس یا آس کی جگہ محض احساس ہوتا ہے۔

بندھو یہ خبر لایا کہ بڑے اور چھوٹے سرکار کے صاحبزادگان کی نیت آج اچھی نہیں عورتوں کو غیر واضح سا احساس تو پہلے سے تھا۔ اب وہ اور چوکنا ہو گئیں۔ ہر بوڑھی مرغی نے اپنے نوجوان چھول کا جائزہ ذرا احتیاط سے لیا اور پَر نکالتی ہوئی بلبلوں کو پاس سمیٹ لیا گیا بندھو نے بھی نگہبانی کے لئے اپنی خدمات رضاکارانہ پیش کر دیں اور بڑی بوڑھیوں کی پسندیدگی کے ساتھ اُس نے ایک چھوٹا سا ڈنڈا کاندھے پر رکھ کر پہرا دینا شروع کر دیا۔

بندھو تھنگنا سا تھا۔ اس کی عمر اٹھارہ سے بالا ہو گئی ہو گی۔ مگر اپنے ناٹے پن کی وجہ سے یہ عورتوں کی قلمرو میں باریاب تھا اور اُن کے قانون کے مطابق نابالغ۔ عورتیں اُسے کارآمد احمق اور لڑکے اُسے دلنواز بدھو سمجھتے تھے۔ لڑکیاں عموماً اُس سے چڑتی تھیں۔ اُس کا سر چھوٹا سا تھا۔ اُس پر انگریزی بال۔ بے وجہ نہایت بدنما معلوم ہوتے تھے۔ اُس کے ہاتھ بے جوڑ

طور پر لانبے تھے اور بے ڈھنگے انداز میں اس کے بہت ہی چوڑے شانوں سے جھولتے رہتے تھے۔ وہ یوں چلتا تھا، جیسے پھُدک رہا ہو۔ اُس کی آواز اُس کے قد اور اس کی عام ہیئت سے بہت زیادہ شاندار ہونے کی وجہ سے مضحکہ انگیز معلوم ہوتی تھی۔ ہر بات اور ہر کام میں دخل دینے کی اُسے لَت تھی۔ وہ اپنے کو بہت باخبر اور ہوشیار سمجھتا تھا۔ مردوں کے درمیان وہ پھل پھول نہ سکا، لڑکوں نے کبھی اس کی بیل منڈھے چڑھنے نہ دی تو آخر کار اُس نے اپنی شخصیت کے اظہار کے لئے زنانخانہ کو چُنا۔ عورتیں فطرتاً مروت پسند ہوتی ہیں وہاں وہ گوارا کر لیا گیا اور اپنی مختلف کارکردگی کے سہارے بڑی بوڑھیوں میں نہایت سر سبز ہوا۔ اس کی ایک بہت بڑی خواہش تھی کہ لڑکیاں اُس سے دلچسپی لیں مگر یہ ارمان نہ نکلا۔ وہ نیا نیا اپنے کو نوجوان لڑکیوں کا سرپرست سمجھنے لگا تھا۔ جب حُسن کی بھیک نہ ملے تو پھر آدمی سندرتا کے خزانہ کا سانپ بن جاتا ہے۔ جب رند بننا ناممکن ہو تو محتسب بن کر انتقام کی آگ بجھائی جاتی ہے۔ لڑکیوں کے سلسلے میں بندھو جاسوس، سراغ رساں، نکتہ چین، مخبر، چغلخور، معلم اخلاق اور خدمتگار کے فرائض انجام دیتا تھا۔ بعض حاسد لڑکیاں اور ناکامیاب لڑکے بندھو کی خدمات بڑی خوشامد سے حاصل کیا کرتے تھے۔ اس وقت بندھو کو اپنی اہم شخصیت کا شدید احساس ہوتا اور اس کی باچھیں کھل جاتیں۔ وہ کامیاب رقیبوں کے پیچھے اس طرح پڑتا کہ پھر محبت کی سلطنت میں انہیں کہیں پناہ کی جگہ نہ ملتی۔ وہ زنانخانوں میں لڑکیوں کے چھوٹے چھوٹے کام بھی کیا کرتا تھا۔ مثلاً بازار سے رنگ، سوئی دھاگا وغیرہ لا دینا۔ بساطن یا چوڑیہارنی کو بُلا لانا، ڈربے سے انڈے اٹھانا۔ لڑکیاں نفرت کرنے کے باوجود اُس سے خوب کام لیتی تھیں اور کبھی کبھار کوئی لڑکی محض کام لینے کے لئے اُس سے ملکے سے التفات کا برتاؤ بھی کر لیتی تھی۔ اُس وقت میاں بندھو جنت میں ہوتے تھے اور ایسی چند سطحی نوازشیں اُسے اکثر مغالطہ میں مبتلا کرنے کو کافی ہوتی تھیں۔ وہ تو بڑی بوڑھیوں میں ہر دلعزیز ہونے کے سبب اُس کی زیبا و نازیبا حرکتیں لڑکیاں اُسے جھڑک وڑک کر

برداشت کرلیتی تھیں ورنہ بندھو کو مغالطوں کی کڑی قیمت ادا کرنی پڑتی۔ وہ قصبہ کے گھروں کے لئے بہت کارآمد تھا۔ اس کا اور کوئی کام نہ تھا سوائے بیگاری کے کام کے۔ اپنے گھر کے لئے نکھٹو اور ہر گھر کے لئے بے دانے گھاس کا ٹٹو۔

ہاں تو بندھو نے درگاہ کی چار دیواری کے گرد چوکیداری کرنی شروع کر دی۔ اُس کا ڈر نہیں رسوائی کا ڈر، نظر بازوں کی ناکامی اور بندھو کی کامیابی کا ضامن تھا۔ اور لڑکیاں تو محتاط ہو گئیں مگر نورا اُسے جلا جلا کر خوب ہنستی اور اُچکے لگاتی رہی۔ جو لڑکے گھات میں تھے خون کے گھونٹ پی پی کر رہ گئے۔

فہمیدہ کمہار کے پجاوے کی طرح احساس کی آگ سے سلگ رہی تھی۔ اچانک اُس کا جی چاہا کہ وہ بھی 'یا ہُو' کا نعرہ لگا کر حال لانے لگے اور اہلِ جنون سے چمٹ چمٹ کر خوب خوب رقص کرے۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس شدید خواہش کی رَو میں بہہ جائے گی۔ اُس نے چونک کر اپنے ارادے سے اس جذبہ کو سنبھالا اور آنچل میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ اُس نے شامیانے کی طرف منہ پھیر کر ریتیلے ساحل پہ لوٹتی ہوئی چاندنی کو دیکھا اور پھر بَل کھاتے ہوئے دریا کے سیمیں دھارے کو جو قصبہ کے گرد یوں حمائل تھا جیسے نورا کی گوری گردن کے گرد رو پہلے سینہ پر پڑی ہوئی حمیل۔ اس کے دل میں کسک سی پیدا ہوئی۔ اُس نے اپنی ہستی کو درد و الم کی موج بن بن کر چاندنی میں گھلتی ہوئی سی محسوس کیا۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ مر جائے اور لوگ اس کی قبر پہ آکر وجد و حال کریں۔ سجادہ نشین کا لڑکا ہاشم اس کی قبر پہ سبز چادر چڑھائے اور قبر سے لپٹ کر خوب رُوئے۔ اُسے مر جانے کے خیال میں عجیب سا سرور حاصل ہوا۔ وہ عالمِ خیال میں عرس کے سارے ہنگاموں سے بیگانہ ہو گئی۔ اُس نے چاندنی میں کفن کی سرسراہٹ محسوس کی اور ہر سو پھیلی ہوئی کافور کی بُو۔ چاند کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے اُس نے سوچا کہ نورا کا چہرہ چاند کی طرح ہے بالکل چاند۔ شاید نورا آسمان کی دیوی ہے۔ فہمیدہ نے تصوّر کیا کہ نورا مر گئی اور اُسے سفید کفن میں لپیٹ دیا گیا۔ اُس کی

نظر قصبہ کے قبرستان کی طرف غیر شعوری طور پر جا پڑی۔ درگاہ سے اوپر عید گاہ کی سفید دیوار کے سایہ میں۔ اُس نے دیکھا۔ وہ اور نور آ ایک ہی قبر میں لیٹی ہوئی ہیں۔ نور آ آنکھ بند کئے مسکرا رہی ہے۔ مگر سرد و ساکن اور وہ خود گرم و مضطرب ......

چاند یک بیک پچھم جانب دریا کی کھلی ہوئی آغوش میں ڈوبتا ہوا معلوم ہوا۔ دریا نے ایک سسکی لی۔ ساحل کی طرف ہوائیں سائیں سائیں چلنے لگیں۔ درگاہ کے سامنے پیپل کے عظیم الشان درخت پر بسیرا لینے والے پرندے بھی چونک اُٹھے، پھڑپھڑائے اور کسی نامعلوم تحریک کے اثر سے بولنے لگے۔

تاریک سائے پورب کی طرف پھیلتے پھیلتے لامحدود ہو گئے۔ صبح دور کہیں سانس لینے لگی تھی۔ مغربی اُفق ڈوبتے ہوئے چاند کی زرد ملگجی روشنی میں نڈھال سا معلوم ہوتا تھا۔ حال و قال کی بزم فسردہ ہو چکی تھی۔ قندیلیں ٹمٹما رہی تھیں اور لوبان دانیوں میں سے نکلتے ہوئے دھوئیں کا آخری پیچ پرواز کرتی ہوئی روح کی طرح وسیع فضا میں تحلیل ہو کر گم ہو گیا۔ لوگ جا رہے تھے۔ دور ریل گاڑیوں کی ٹن ٹن کی آوازیں آ رہی تھیں۔ درگاہ میں صرف چند عورتیں رہ گئی تھیں اور دو مرد۔ ایک ہاشم اور دوسرا بندھو۔ پریشان زلف عورتوں پر شیخ سدو یا مختلف قسم کے جن اور عفریت بھر رہے تھے۔

مخدوم صاحب کے مزار پر یہ آسیب زدہ عورتیں جھوم رہی تھیں۔ اور مسلسل آنکھیں نکال نکال کر بکتی جھکتی جا رہی تھیں۔ ہاشم اپنے نسلی کرامات کے زور پر عورتوں کے سر سے بھوت اتار رہا تھا۔ عورتوں کی خدمت کے جذبہ کے ماتحت بندھو بھی اُن لڑکیوں کی پکڑ دھکڑ میں مشغول تھا جن کے سر پر پُرشور جن سوار تھے۔ ایک بازو کوئی رشتہ دار عورت پکڑتی تو دوسرا بازو بندھو۔ بال پریشان، آنچل ساری کی سلوٹوں میں اُلجھا ہوا اور ساری پھر پیراہن جانے پر آمادہ۔ شکوکہ کے شانے مسکے ہوئے اور گریبان قہقہہ زن۔

فہمیدہ نے اس منظر آخریں کو دیکھا اور ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ گدی نشین کا لڑکا ہاشم

پچھاڑ کھاتی ہوئی لڑکیاں، جلتے ہوئے فلیتے، ورد اور منتر، اُلجھے ہوئے بال، بازوؤں کی گرفت، بے حجاب سینے اور بندھو سب نے مل کر اس کے دماغ کی انجان گلیوں کی کھڑکیاں کھول دیں۔ یہ گلیاں حوّا کی نسل پر بیتی ہوئی انگنت تاریک صدیوں تک پھیل گئیں۔ ان کے اندر غیر واضح خواہشوں کے بھوت، پیاسی روحیں اور منچلے جن جاگ اُٹھے اور ازلی عورت اپنے اندھیرے مقبرے سے نکل کر بال پریشان کئے عُریاں دَوڑنے لگی . . . .

نورا، زینی، فخرن سب لڑکیاں فہمیدہ کے پیچھے کھڑی ہوئی اس کی محویّت اور اس کے دل کے اندر چھپے ہوئے تاریک سایوں کا تماشہ کر رہی تھیں۔ عورتیں ایسے آنکھے پوشیدہ بھیدوں کو کہی ہوئی باتوں سے زیادہ صاف طور پر پا لیتی ہیں۔ چوڑیوں کی جھنک سے فہمیدہ چونکی تو سب نے معنی خیز قہقہہ لگایا اور وہ عرق عرق ہو گئی۔ مشرق کی پیشانی گلابی ہو رہی تھی، درختوں کے سایے سپیدۂ سحر میں گھُل کر غائب ہو چکے تھے اور پتوں پر شبنم کے قطرے چمک رہے تھے۔

"میاں فہیم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔" شاہ رنجور نے اپنی بیوی سے کہا۔

"کیا ہوا؟" بیوی نے سوال کیا۔

"اور کیا ہوتا! اب شرافت کا نام ہی نام رہ گیا ہے۔ یلنشی کرامت اپنی بیٹی نورا کو زہر کیوں نہیں دے دیتے۔ حرّافہ ہے وہ قطّامہ!"

"اچھا تو اب مردوں میں بھی اس کے چرچے ہونے لگے۔ منگلو کی ماں تو پہلے سے کہتی تھی کہ رات کی رات ترکاری والی باڑی میں قدموں کی چاپ سُنائی دیتی ہے اور ایک دو دفعہ اُس نے لیموں اور امرود کے درختوں کے پیچھے سفید کپڑے پہنے کسی کو غائب ہوتے دیکھا ہے"

"ائیں! اُس نے؟ منگلو کی ماں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا؟"

"کیوں تم حیرت زدہ کیوں ہو گئے۔ وہ تو مسکرا مسکرا کر سرگوشی میں کہنے لگی کہ وہ پہچانتی

بھی ہے اُسے۔"

"اچھا! پہچانتی بھی ہے۔" شاہ رنجور نے حیرت اور سوال کے دوگونہ جذبہ سے متاثر ہو کر کہا۔

"ہاں وہی بڑے میاں کا خاندان ۔بغلی گھونسہ۔آستین کے سانپ۔"

پھر میاں بیوی نے سرگوشی میں باتیں شروع کیں جسے فہمیدہ نے سُنا نہیں۔ اور ماں باپ کی اس گفتگو سے اس کے اندر بے چین سی کرید پیدا ہوئی۔ وہ دوسری کوٹھڑی میں لیٹی ہوئی بہشتی زیور پڑھ رہی تھی۔

ہوا یہ تھا کہ نورا نے بہت زیادہ آگے پاؤں نکال دیئے تھے۔ تانک جھانک کرتے ہوئے بستی کے کئی لوگوں نے اُسے دیکھ لیا تھا اور ایک دفعہ تو بدھو نے دروازے پر منشی کرامت ہی کو اس وقت لا کھڑا کیا تھا۔ جب نورا کواڑ سے لگی تحمل سے باتیں کر رہی تھی۔ جو نیم کے نیچے گلی میں کھڑا ہوا تھا۔ منشی کرامت نے دروازے کو مستقل طور پر بند کروا کے اُس میں کانٹیاں جڑوا دی تھیں۔

بڑی بوڑھیاں کہتی تھیں کہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ آج کی لڑکیاں تو دیدہ دلیر اور بے حیا ہیں۔ نورا تو نورا عرس کے میلہ کے بعد بدھو نے بہنوں کے راز آشکار کر دیئے تھے۔ زینت فخرن، اور کئی لڑکیوں کے خطوط پکڑے گئے تھے۔ اسکول میں پڑھنے والے لونڈے سینما کے سبق کو قصبات آ کر دُہراتے ہیں اور اکثر محلے ٹولے میں آموختہ پڑھتے ہیں۔

شاہ رنجور کے گھر میں اکثر ایسی تاریخی مجلسیں برپا ہوتی تھیں۔ جن میں گھر گھرانوں کے حال ماضی اور مستقبل پر تبصرہ ہوتا تھا۔ آج کی بے حیا کنواریوں سے بات چلتی تو گذشتہ زمانوں پر سے بھی پردہ اُٹھتا۔ محبوب لڑکیوں کا اپنے چاہنے والوں کو دودھ ملیدہ کھلانا، قیمتی تحفے دینا عین دوپہرے میں حجلۂ عروسی سے نکل کر حبیبوں کے گلے کا ہار ہونا۔ ناشاد عاشقوں کا محبوب کی رخصتی کے وقت بیل گاڑی کے نیچے لٹک کر میلوں محمل لیلے سے پیوستہ چلے جانا۔ اور

آج وہ محبوب لڑکیاں، نانیاں اور دادیاں تھیں یا بھرے گھر کی باوقار مائیں۔ غرض اسی قسم کی قومی روائتیں زندہ رکھی جاتی تھیں اور گاہے گاہے داغہائے سینہ کو تازہ رکھنے کے لئے اس دفترِ پارینہ کی تشہیر کی جاتی تھی۔ فہمیدہ بیٹھی گھُنّی کی طرح قصبہ کی رومانی تاریخ کو سنتی اور حیرت کرتی کہ "آج" "کل" سے زیادہ آگے ہے یا "کل" ہی "آج" سے زیادہ جرأتِ رندانہ رکھنے والا تھا۔ وہ بھی قصبہ کی تاریخ کا ایک نمایاں باب بن جانا چاہتی تھی مگر اُسے راستہ نہیں ملتا تھا۔ اس کی افتادِ طبع کا پتھر اس کے سینہ سے اُٹھ نہیں پاتا تھا۔ اور یہ حیادشرم کی ٹھیکہ دار عورتیں ماضی کی بے حیائیوں کے تذکرے کر کر کے اپنے منہ کی پھونکوں سے شرم وحیا کے چراغ گُل کرتی اور لاج کی مہندی کا رنگ اُڑاتی رہیں ......

چین اور ہندوستان کی مردم شماری ممکن مگر فضائے بسیط کے جنوں، بھوتوں، عفریتوں چڑیلوں، چھنوں، راکسوں اور شیخ سددؤں کا شمار ناممکن۔ اور پھر ان کی قسمیں۔ نوری وناری، خاکی وبادی، دریائی وصحرائی، کوہستانی دبیابانی، مسلمان اور کافر۔ کون جانے ان غیر مخلوقوں کو اب پاکستانی اور نا پاکستانی تقسیم کے ماتحت بھی آنا پڑے۔

عُرس کے بعد طرح طرح کے جن اور بھانت بھانت کی روحیں کنواری نوجوان لڑکیوں اور بیزار بہوؤں پر سوار ہونے لگے۔ قصبے اور اطراف کے گاؤں میں سجّادہ نشین کے لڑکے شاہ ہاشم کی خوب پریکٹس چمکی۔ وہ اپنی خاندانی کرامات کے سہارے بہت سے نازک کاندھوں کا بوجھ ہلکا کرتے رہے۔ قصبے کے اندر جب ایسے مواقع پیدا ہوتے تو فہمیدہ ضرور تماشا دیکھنے چلی جاتی تھی اور بندھو بھی دستگیری کے لئے موجود ہوتا۔

کچھ دنوں کے بعد قصبہ میں چرچا شروع ہوا کہ فہمیدہ پر جنّوں کا شہزادہ بھرنے لگا ہے۔

شریفے والی نانی نے کہا ــــ "جب یہ لوگ کبھی آئیں تو سامنے کھڑا ہونا اچھا نہیں ایک کی گئی دوسرے کے سر آجاتی ہے۔ فہمو جھاڑ پھونک کے وقت بہت کھڑی رہتی تھی۔"

بلّی والی بوآ نسے سامی بھرتے ہوئے کہا ــــ "سچ کہتی ہو خالہ۔ ان کے سایہ سے بھی دور رہنا چاہئے"
لڑکیوں کو حیرت تھی کہ فہمیدہ پر جنوں کا شاہزادہ کیسے عاشق ہوگیا۔ سبھوں نے اپنے دل میں رقابت سی محسوس کی۔ اگر فہمیدہ کے سامنے اس جلن کا اظہار کیا جاتا تو اُسے بیحد تسکین ہوتی۔ جب کسی کو کچھ دے کر خوش ہونے کی توفیق نہ ہو تو پھر لوگوں کو جلا کر یا اُن کو خفیف بنا کر مسرّت ہوتی ہے۔ اُدھر سب لڑکیوں نے اس بات پر بہت زور دینا شروع کیا کہ فہمیدہ تو نہایت بدصورت لدّھڑ سی لڑکی ہے۔ کوئی بُری کالی سی رُوح اس پر ریجھ سکتی ہو تو ہو، جنوں کے شہزادے کی کھاٹ کاٹی گئی ہے جو اس پر فریفتہ ہو۔ ان کا خیال تھا کہ فہمیدہ نیک سی ماٹھوس لڑکی جھوٹ تو کیا نقل کر سکتی ہے۔ ہاں کوئی بڑا اپاٹیا بھوت اس کے سر پہ سوار ہو کر اپنی بڑائی کرتا ہے۔

مگر فہمیدہ بھرنے کے وقت جب کھیلتی تو اُسی بلند بانگ انداز میں اس وقت وہ اس فرّاٹے سے شین قاف اور میں تو اُڑاتی کہ بس منہ دیکھتے رہ جائے......

"میں جِنوّں کا شاہزادہ ہوں۔ یہ لڑکی امرود کے نیچے آنگن میں نہا رہی تھی۔ میرا تخت اُوپر بادل میں گذر رہا تھا۔ میں نے اُسے دیکھا اور ہزار جان سے اس پر عاشق ہوگیا۔ میں مسلمان ہوں اور مخدوم صاحب کی عزّت کرتا ہوں۔ شاہ ہاشم اُن کی اولاد ہیں۔ میں اُن کی بھی عزّت کروں گا۔ وہ آئیں، مجھ سے باتیں کریں۔ لڑائی کرنے سے کیا فائدہ۔ اور اگر وہ زور آزمائی کرنا چاہیں تو کر دیکھیں۔ مجھے وہ اُتار نہیں سکتے۔"

پہلے پہل جب شاہ ہاشم کو بلایا گیا تو شاہ صاحب نے فہمیدہ کو پٹک کر چت گرانا چاہا۔ جنوں کا شہزادہ بہت طاقتور تھا۔ درد وظیفہ سے کام نہیں چلا۔ بہت سے آزمودہ عمل بیکار ثابت ہوئے۔ پتڑ کا پٹکی بھی دیر تک ہوتی رہی۔ بندھو اور شاہ ہاشم نے مل کر آخرش جن کو فہمیدہ سمیت چت کر لیا اور اُسے دیر تک دابے رہے۔ فہمیدہ آنکھیں بند کئے کچھ دیر تو پڑی رہی اور پھر اچانک آنکھ کھولتے ہوئے اُس نے بندھو کو ٹپک دیا اور شاہ ہاشم پر یہ کہتے ہوئے ٹوٹی۔

"میں نماز پڑھنے چلا گیا تھا۔ تم نے مجھے چت نہیں کیا۔ اب آؤ!"

ایک کشتی پھر ہوئی۔ برابر کی بازی رہی۔ یک بیک فہمیدہ نڈھال پڑ گئی۔ جنوں کے شہزادہ نے "السلام علیکم" کہا اور رخصت ہو گیا۔

شاہ ہاشم اور جنوں کے شاہزادے میں صلح ہو گئی۔ اب یہ ہوتا کہ فہمیدہ پر سایہ پڑا اور نوجوان شاہ صاحب بلا لئے گئے۔ دیر تک صوفیانہ اشعار ایک دوسرے کو سنائے جاتے۔ عشق و معرفت کی باتیں ہوتیں اور رخصت ہوتے وقت جنوں کا شاہزادہ شاہ ہاشم سے گلے مل مل کر جاتا۔ قصبے کے عقیدت مند کہتے۔

"بہت قابل جن ہے۔ کیسے اچھے اچھے اشعار یاد ہیں اسے۔ فہمو کو تو بات تک کرنے کا شعور نہیں۔"

اوّل تو شاہ رنجور غریب آدمی تھے اور دوئم یہ کہ یہ جن نرالا تھا۔ شاہ ہاشم کو جھاڑ پھونک کے پیسے نہیں ملتے تھے۔ رفتہ رفتہ شاہ ہاشم صرف جن کو سلام کہلا بھیجتے۔ بندھو کے ذریعہ یہ سلام کلام ہوتا اور شاہ صاحب خود آنے سے کتراتے۔ ایسے موقعہ پر فہمیدہ پر جن خوب بھرتا اور گھر میں وہ اودھم مچتی کہ بندھو کی پکڑ دھکڑ سے بھی جن رام نہیں ہوتا۔ جب کئی بار ایسا طوفان آتا تو پھر شاہ رنجور ہاشم کی خوشامد برآمد کر کے اسے لے آتے۔ جن خوب شکوے شکایت کرتا اور فراقیہ اشعار پڑھتا۔ نورا اور زیبن نے ایک دفعہ یہ محسوس کیا کہ جنوں کے شہزادہ کو وہ سب اشعار یاد ہیں جو ان لڑکیوں کو قوالوں سے سن سن کر یا لڑکوں سے خط و کتابت کرتے ہوئے یاد ہو گئے تھے اور وہ انہیں گاہے گاہے چھپ چھپا کر ترنم سے گایا کرتی تھیں۔

بندھو کو لڑکیوں پر ہمیشہ شبہ رہتا تھا۔ وہ فہمیدہ کے شہزادے کو کچھ سمجھنے سا لگا۔ مگر وہ یہ کفر بکے کس طرح کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ اُس نے درپردہ یہ کوشش شروع کی کہ وہ خود جنوں کا شہزادہ بن جائے۔ وہ روز فہمیدہ کے پاس جا جا کر اپنی تمناؤں کا اظہار کرنے لگا۔ آج تک اتنے کھلے طور پر اُس نے کسی لڑکی کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا تھا اور یہ فہمیدہ کے لئے بھی نیا

تجربہ تھا۔ اُسے خوشی، بہت خوشی محسوس ہوتی۔ عورت کی حسِ تسکین پاتی۔ مگر عورت کی نظر تشنہ ہی رہتی اور اس کے دل کی چند نئی کھلی ہوئی کھڑکیوں میں نورِ مسرّت کی کرنیں بسیرا نہ لیتیں۔ وہ تو اپنے شہزادہ کو ڈھونڈتی تھی۔ وہ خود بدصورت تھی، کالی تھی، بھدّی تھی۔ مگر اس کا دل اس کے حسین شہزادہ کا تخت تھا۔ وہ بندھو کی گفتگو سُن کر ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتی اور اس کی آنکھیں اس طرح چمکنے لگتیں کہ اب اس پر جن آیا۔ بندھو سمجھتا کہ آہِ سرد اُسی کے لئے کھینچی جا رہی ہے اور فہمیدہ بندھو کو شاید اس لئے گوارا کرتی تھی کہ وہ اس کے شہزادہ کو بلایا کرتا تھا یا شاید اس لئے کہ اس کی حسِ محبّت کی جھوٹی تسکین ہوتی تھی۔

بندھو کا مغالطہ ایک دفعہ اس طرح رونما ہوا کہ اُس نے ایک سُرخ سا رومال فہمیدہ کو تحفتاً دینے کی ٹھانی۔ یہ رومال اُسے اپنی ایک خالہ سے بس ابھی ابھی ملا تھا اور اُسے عجلت تھی کہ کسی طرح یہ فہمیدہ تک پہنچ ہی جائے۔ حُسنِ اتفاق سے اُسی روز فہمیدہ پر جنّوں کا شہزادہ آیا اور بندھو شاہ ہاشم کو لے کر فہمیدہ کے یہاں بن بلائے پہنچ گیا۔ یوں تو بندھو اکثر فہمیدہ کے سامنے اظہارِ محبت کیا کرتا تھا مگر پہلا تحفہ پیش کرنے میں اُسے حجاب محسوس ہو رہا تھا۔ آج تک کسی لڑکی کو تحفہ دینے کی سعادت اُسے نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اُس کے دل میں مسرّت کے بلبلے ٹوٹ رہے تھے۔ اُس نے بہت سوچ سوچ کر تجویز یہ نکالی کہ جھاڑ پھونک اور پکڑ دھکڑ کے وقت وہ کسی طرح رومال فہمیدہ کی کمر میں لٹکا دے اور اُس نے یہی کیا۔

فہمیدہ نے کئی بار شاہ ہاشم کے نام خط لکھے اور ہر دفعہ خط کو کئی کئی بار پڑھ کر پھاڑ ڈالا وہ لاکھ عزم کرتی مگر وہ ہوش میں ایسا اقدام کرنے سے قاصر تھی۔ وہ اپنی کوٹھڑی میں چپ چاپ پڑی پڑی سوچتی رہتی تھی۔ وہ اپنے دل کی راکھ کریدتی اور اُس کے اندر سے چنگاریاں نکل نکل کر پھر خاکستر بنتی جاتیں۔ وہ جب بھی خط لکھتی تو یہ جان بوجھ کر لکھتی کہ خط بھیجنے کے لئے نہیں لکھا جا رہا ہے بلکہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہوا کے دوش پہ اُڑ جانے کے لئے۔ مگر وہ پھر بھی لکھتی محض خط لکھنے کے لئے لکھتی۔ بس جھوٹ موٹ کا خط اُسے ہاشم کے نام خط لکھنے میں بہت لطف آتا اور

وہ لکھتی رہتی۔ رفتہ رفتہ وہ زیادہ سے زیادہ خط لکھنے لگی۔ خط لکھنے کے علاوہ اب فہمیدہ کا ایک اور مشغلہ ہو گیا۔ اُس نے سمجھا کہ اُس کے بھاگ جاگ گئے ہیں۔ ہاشم نے ہی اُسے سُرخ رومال تحفے میں دیا ہے۔ اُس نے اپنے بکس کی نچلی سطح پر رُومال کو بہت محفوظ طور پر رکھا اور روزانہ اپنا بکس کھول کر اُسے نکالتی اور دیر تک محویت کے عالم میں اُسے دیکھتی رہتی۔

ایک دفعہ فہمیدہ اسی طرح رومال دیکھنے میں محو تھی کہ نورا اس کی کوٹھری میں ہنستی ہوئی آنکلی اور کہنے لگی۔

"سُنتی ہو فہمو! بندھو سب سے کہتا پھرتا ہے کہ تم اُسے چاہتی ہو اور اُس نے تم کو ایک لال سا رومال تحفہ دیا ہے۔ فخرن کہتی ہے کہ بندھو کے ہاتھ میں ایک لال سا رومال اُس روز تھا جس پر طاؤس کی تصویر بنی ہوئی ہے۔"

فہمیدہ کے ہاتھ سے رومال گر گیا۔

نورا نے پھر کہا "نہیں، تم کا رومال لئے ہو گے! تم نیک، بے زبان، سادہ سی لڑکی۔ اور بندھوا ابھی رومال تم کو کاہے دیتا! دیتا تو ہم سب کو دیتا۔ وضو کے پانی سے کوئی ہولی کھیلے گا بھلا۔ بندھوا کو کوئی نہ ملا تو فہمو کا نام جھوٹ کا لگا دے لگا۔ ہم تو یہی فخرن کو کہا۔"

فہمیدہ نے اپنے دل میں سخت اذیت محسوس کی۔ وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ بہت سے ملول و حزیں خیالات اس کے گرد منڈلانے لگے۔ تاریک سایوں کی طرح۔

سامنے سے فخرن آ رہی تھی۔ نورا نے ہنستے ہوئے آواز دی "فخرن! آؤ نا! دیکھو فہمو بیچاری کو۔"

فہمیدہ نورا کی ہنسی برداشت نہ کر سکی۔ وہ زمین پر گر گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں کھنچنے لگے۔ اُس پر تشنجی کیفیت طاری ہوئی اور وہ چیخنے لگی۔

نورا بھاگی۔ اُس نے سمجھا بس اب فہمیدہ پر بھوت بھرنے لگا۔ اور شاید اب کے سچ مچ فہمیدہ کے لیے حقیقت کی تلخی دُور کرنے جنّوں کا شہزادہ آ گیا تھا۔

سعادت حسن منٹو

مُوتری

کانگریس ہاؤس اور جناح ہال سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک پیشاب گاہ ہے جسے بمبئی میں "مُوتری" کہتے ہیں۔ آس پاس کے محلوں کی ساری غلاظت اس تعفن بھری کوٹھڑی کے باہر ڈھیریوں کی صورت میں پڑی رہتی ہے اس قدر بدبو ہوتی ہے۔ کہ آدمیوں کو ناک پر رومال رکھ کر بازار سے گذرنا پڑتا ہے۔

اِس موتری میں ایک دفعہ اُسے مجبوراً جانا پڑا — پیشاب کرنے کے لئے۔ ناک پر رومال رکھ کر، سانس بند کر کے، وہ بدبوؤں کے اس مسکن میں داخل ہُوا۔ فرش پر غلاظت بُلبُلے بن بن کر پھٹ رہی تھی —— دیواروں پر انسانوں کے اعضائے تناسل کی مہیب تصویریں بنی تھیں۔ —— سامنے کوئلے کے ساتھ کسی نے یہ سیاہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

"مسلمانوں کی بہن کا پاکستان مارا"

ان الفاظ نے بدبُو کی شِدت اور بھی زیادہ کردی۔ وُہ جلدی جلدی باہر نکل آیا۔

جناح ہال اور کانگریس ہاؤس دونوں پر گورنمنٹ کا قبضہ ہے۔ لیکن تھوڑے ہی

فاصلے پر جو موتری ہے۔ اسی طرح آزاد ہے۔ اپنی غلاظتیں اور عفونتیں پھیلانے کے لئے ـــــ آس پاس کے محلوں کا کوڑا کرکٹ اب کچھ زیادہ ہی ڈھیریوں کی صورت میں باہر پڑا دکھائی دیتا ہے۔

ایکبار پھر اُسے مجبوراً اس موتری میں جانا پڑا انتظار ہے۔ کہ پیشاب کرنے کیلئے۔ ناک پر رومال رکھ کر اور سانس بند کر کے وہ بدبوؤں کے اس گھر میں داخل ہوا ـــــ فرش پر پتلے پاخانے کی پپڑیاں جم رہی تھیں۔ دیواروں پر انسان کے اولاد پیدا کرنیوالے اعضا کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا ـــــ "مسلمانوں کی بہن کا پاکستان مارا" کے نیچے کسی نے موٹی پنسل سے یہ گھناؤنے الفاظ تحریر کئے ہوئے تھے۔

"ہندوؤں کی ماں کا اکھنڈ ہندوستان مارا"

اس تحریر نے موتری کی بدبو میں ایک تیزابی کیفیت پیدا کر دی ـــــ وہ جلدی جلدی باہر نکل آیا۔

مہاتما گاندھی کی غیر مشروط رہائی ہو گئی۔ جناح کو پنجاب میں شکست ہوئی ـــــ جناح ہال اور کانگرس ہاؤس دونوں کو نہ شکست ہوئی نہ رہائی۔ ان پر گورنمنٹ کا اور اس کے تھوڑے ہی فاصلے پر جو موتری ہے اس پر بدبو کا قبضہ بدستور جاری ہے ـــــ آس پاس کے محلوں کا کوڑا کرکٹ اب ایک ڈھیر کی صورت میں باہر پڑا رہتا ہے۔

تیسری بار پھر اُسے اس موتری میں جانا پڑا ـــــ پیشاب کرنے کیلئے نہیں ـــــ ناک پر رومال رکھ کر اور سانس بند کر کے وہ غلاظتوں کی اس کوٹھڑی میں داخل ہوا ـــــ فرش پر کیڑے چل رہے تھے۔ دیواروں پر انسان کے شرمناک حصّوں کی نقاشی کرنے کے لئے اب کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی ـــــ "مسلمانوں کی بہن کا پاکستان مارا" اور "ہندوؤں کی ماں کا اکھنڈ ہندوستان مارا" کے الفاظ مدھم پڑ گئے تھے۔ مگر ان کے نیچے سفید چاک سے لکھے ہوئے یہ الفاظ اُبھر رہے تھے۔

"دونوں کی ماں کا ہندوستان مارا"

ان الفاظ نے ایک لحظے کیلئے موتری کی بدبو غائب کر دی ـــــ وہ جب آہستہ آہستہ باہر نکلا تو اُسے یوں لگا۔ کہ اُسے بدبوؤں کے اس گھر میں ایک بے نام سی مہک آئی تھی ـــــ صرف ایک لحظے کیلئے

جوشؔ (ملیح آبادی)

ارتقاء

رنگ و بو کا یہ ستارہ جسمیں ہے یہ ریل پیل — زندگی کا جس میں کھیلا جا رہا ہے کب سے کھیل
یہ کرہ، یہ آب و گل کی کارگاہِ ہست و بود — قبل از پیدائش تاریخ ہے جس کا وجود
رقص میں کب سے ہے یہ رقّاصۂ جادو ادا — ذہن میں آتا نہیں اندازہ ماہ و سال کا
عمر کیا ہے اس تماشا گاہِ ابر و باد کی — غور کرتے وقت رُک جاتی ہے سانس اعداد کی
یہ مہ و خورشید یہ سیّارگانِ ہفتمیں — اور انہیں کے ساتھ یہ گردندہ و غلطاں زمیں
ایک ہی جھلے میں رقصاں تھے یہ سب آتش جمال — جن کے گرد اگرد تھا لرزندہ اک شعلوں کا جال
گرمیٔ انداز سے لیکن یہ بزمِ اتفاق — پل میں برہم ہو گئی کچھ یوں پھُنکا صورِ فراق
شعلہ رُو تارے جُدا ہو کر پرافشاں ہو گئے — پھُول گلدستے میں جتنے تھے پریشاں ہو گئے
اور پریشاں ہو کے تڑپے پیچ و خم کھانے لگے — گردِ مہرِ ناز پر در ناچنے گانے لگے
مہر کا زورِ کشش یوں زلف چھٹکانے لگا — کوکبوں کا جذبۂ رم رقص فرمانے لگا
اور ہمارا یہ ستارہ بھی بہ شوقِ آب و گل — بن گیا دوشِ خلا پر اک وجودِ مستقل

الاماں والحفیظ اس دورِ آتش کا سماں — آگ تھی صرف آگ، پانی کا نہ تھا نام و نشاں
ارض تھی بحرِ خلا میں ایک انگاروں کی ناؤ — ایک آتش بار مجمع ایک وحشتناک الاؤ
ایک ہیبتناک بھٹی تھی خلا کے درمیاں — شعلۂ جنباں و آتش پرور و دوزخ فشاں
پنجۂ آتش سے خود اپنا گریباں پھاڑتی — گونجتی، ہلتی، دہکتی، ہونکتی، چنگھاڑتی

دھواں، دھن دھن، گھم گھما دھڑ دھڑ، دناشوں، ہائیں ہائیں
سنسناہٹ، دھڑدھڑاہٹ، گھڑگھڑاہٹ، شائیں شائیں

الاماں! یہ سخت آوازیں تھیں اور ارضِ سقیم — سنگ ریزے تھے عقیر اور خاک پارے تھے عقیم
یورشِ حدت سے حالت تھی چٹانوں کی تباہ — سینۂ گیتی سے اُٹھتے تھے بخاراتِ سیاہ
دھات کے پگھلے ہوئے انبار تھے بہتے ہوئے — آگ سے لوہا تھا پانی اور پتھر موم تھے
یہ زمیں تھی نامِ دوزخ ہر نفس جپتی ہوئی — کانپتی، جلتی، دہکتی، کھولتی، تپتی ہوئی
گونجتی اسٹیم، سنّاتی ہوئی چنگاریاں — کپکپی، جھٹکے، دھماکے، زلزلے، شعلے، دھواں
پتھروں کی برہمی، پگھلی ہوئی گندھک کا جوش — آتشیں لاوے کے فوارے چٹانوں کا خروش
کانپتے شعلوں کی لرزش لپلپاتی لَو کا رَم — سرخ انگاروں کی ہلچل تند آنچوں کا اُدھم
کھولتے اجزائے گیتی کی بھیانک سسکیاں — دُور تک اک ہول پرور جنبشِ دُود و دُخاں
اور اس دُود و دُخاں سے باہزاراں التہاب — سُرخ کرنوں کو جھکا کر ناز افشاں آفتاب
وجد کرتا گرم برچھوں سے زمیں کو پاٹ کر — سینۂ گیتی کو شعلوں کی زباں سے چاٹ کر
چیختی، بھُنتی، اُبلتی، گونجتی، گلتی رہی — یوں ہی لاکھوں سال بیچاری زمیں جلتی رہی
سُست گامی کی بدولت ٹھوکریں کھاتی رہی — وقت کی لاانتہا وسعت میں چکراتی رہی
تب ہوا پیدا مزاجِ نار میں کچھ اعتدال — مائلِ نرمی ہوا عفریتِ آتش کا جلال
اور پھر آہستہ آہستہ نئے آہنگ سے — پھوٹ نکلے کھولتے سوتے بطونِ سنگ سے
جن سے پھوٹا چشمۂ گرمِ فلزاتِ خوش آب — آگئی روئے زمیں پر اک انوکھی آب و تاب

خود کو آبِ تیرہ کی رفتار میں کھونے لگے، پستیوں میں سرخ ذرّے تہ نشیں ہونے لگے
رفتہ رفتہ سینۂ گیتی میں دل بننے لگا آب کا گاڑھا پسینہ سازِ گل بننے لگا
اور پھر اسٹیم سے ٹھنڈی ہوائیں مَس ہوئیں سنسناتے پتھروں پر بوندیاں بجنے لگیں،
آب و آتش میں بہم سرگوشیاں ہونے لگیں بوندیوں کی گود میں چنگاریاں سونے لگیں،
اور تدریجاً یونہی گھٹتی رہی بے مہر آگ ہنس کے پھر باراں کی جانب موڑ دی قدرت نے باگ
باگ مڑتے ہی گھٹائیں بال بکھرانے لگیں شادیانوں کی صدائیں چرخ سے آنے لگیں
بدلیاں تپتی چٹانوں کو ہوا دینے لگیں، دل کشی سے ندیاں انگڑائیاں لینے لگیں
اِک طرحِ نو بصد ناز و ادا پڑنے لگی تیرہ غاروں میں سمندر کی بنا پڑنے لگی
ہو گیا فطرت کا دل فرطِ خوشی سے باغ باغ بن گیا گردوں رقیق القلب گیتی تر دماغ
ابر لہرانے لگے، ٹھنڈی ہوا چلنے لگی پیکرِ گیتی میں نبضِ مدعا چلنے لگی
گنگناتے پیچ و خم کھاتے ہوئے دھارے چلے آگ کے سینے پہ پانی کے خنک آرے چلے
اور موجِ بادِ باراں ہو گئی مشغولِ کار اِس کو کاٹا، اُس کو چھانٹا، اُس کو رگڑا بار بار
جَم کے دھاتوں کو خراشا معدنوں کو پھوڑ کر سنگ ریزوں کو تراشا پتھروں کو توڑ کر
سطح پر لا کر جمایا جو ہرِ صد زشت و خوب سخت چیزوں کا برادہ، نرم اشیا کا رُبوب
دھوم سے مالِ غنیمت جمع کرنے کے لئے بستیوں کی سمت طوفانی وڑیڑے چل پڑے
معدنی ذرّات سے بھرنے لگی جیبِ زمیں معرضِ تخلیق میں آنے لگی خاکِ مبیں
مدتوں دنیا رہی آشفتہ حال و سینہ چاک تب کہیں جا کر فراہم ہو سکے اسبابِ خاک
اور پھر بحرِ حیات آور نے آ کر جوش میں نوعروسِ خاکداں کو لے لیا آغوش میں
تشنہ کامی کو بالآخر جامِ کوثر مل گیا بحر کیا پایا، عروسِ خاک کو بَر مل گیا،
اور پھر آئیں بلائیں کارواں در کارواں برف باری، زلزلے، سیلاب، صرصر، آندھیاں
برف گرتی تھی بلائے آسمانی کی طرح اور برس پڑتی تھی بعض اوقات پانی کی طرح

تخ کے تودوں کی بندھی رہتی تھی میدانوں میں باڑ — یوں گرجتی تھیں گھٹائیں، چیخ اُٹھتے تھے پہاڑ
ہونکتے چشمے گرا کرتے تھے پیہم دھائیں دھائیں — برق رو جھکڑ چلا کرتے تھے دن بھر سائیں سائیں
ایسی گرتی تھیں چٹانوں پر کڑک کر بجلیاں — سُرخ لَو بن کر نکل پڑتی تھی پتھر کی زباں
تند خو طوفان آتے تھے اور اتنے متّصل — کانپتا رہتا تھا نومولود کہساروں کا دل
ژالہ باری کے دھماکے تھے چٹانوں پر مہیب — بولتے تھے ہر قدم پر شاہِ طوفاں کے نقیب
قربتِ خورشید اُدھر تھی اک بلائے بے اماں — اور ادھر بپھرے عناصر کی جنوں انگیزیاں
ہر نفس اک زلزلہ، اک سیل اک طوفان تھا۔ — اِک گرج، اک گونج، اِک ہنگامہ، اک ہیجان تھا
الغرض دنیا نہ جب خوش تھی نہ اب آرام میں — پہلے بھٹی میں تھی مضطر، اب بھنور کے دام میں
کم سنی اور کم سنی میں یہ بلائیں ہولناک — آگ سے کل نیم جاں تھی، آج پانی سے ہلاک
ایک تھے دکھیا زمیں کے واسطے قہر و کرم — کل تھے اگنی کے مظالم، آج اندر کے ستم
الغرض ناہید اور مریخ دونوں سخت تھے — کل تو اس کا قہر تھا اور آج اس کے عربدے
اپنا طوفانی سفینہ الغرض کھینچتی رہی — ارض قرنوں، کروٹوں پر کروٹیں لیتی رہی

صبر لیکن مدّتوں کے بعد کام آ ہی گیا — تیرہ شب کو روزِ روشن کا پیام آ ہی گیا
آرزوِ دل کی بر آئی سینکڑوں قرنوں کے بعد — رُک گئیں طوفاں کی نبضیں، تھم گئی آوازِ رعد
آب و آتش کو سمویا وقت کی رفتار نے — سانس لی راحت کی پہلی مرتبہ سنسار نے
عارضِ مشکیں کی تلاش میں تزلزل کھو گیا — دیو جنبش نے کمر کھولی، تلاطم سو گیا
ہو گئے طوفاں گزیدہ بحر و بر شاداں بحال — یوں عناصر میں ہوا پیدا نمایاں اعتدال
مژدۂ ہستی لئے موجِ صبا آنے لگی۔ — قلزموں نے ارغنوں چھیڑا زمیں گانے لگی
اور پھر اک دلفریب و دلنشیں انداز سے — خاک سے پودوں نے سر اپنے نکالے ناز سے
اور پھر سبزے کی جنبش سے زمیں لہرا گئی — اس ستارے کی مَسیں بھیگیں جوانی آ گئی

اور پھر کچھ تھم کے اُٹھی ایک موجِ سرخوشی
خاک نے انگڑائی لیکر اپنے جوڑے کو چھوا
زندگی کی طرفہ جنبش سے ملی روحِ جمود
کونپلیں بن بن کے پھوٹے خاکداں کے ولولے
کاہ کی نبضیں بھی زیرِ کہکشاں چلنے لگیں
دہر کے تاریک گوشے تک منوّر ہوگئے
زندگی کیا دولتِ بیدار ادراک جو اس
زندگی، موجِ شعور و جستجوئے دانش زندگی
خسروِ گردونِ گرداں شاہ گیتی زندگی
شعلہ پرور، شعلہ پیکر، شعلہ افشاں زندگی
اِس ستارے کی امنگوں کی روانی زندگی
منتشر تاریخِ دنیا کی مؤلف زندگی
زندگی، سالارِ بحر و بر، اسیرِ برق و باد
میرِ عالم فاتحِ پیدا و پنہاں زندگی،
الغرض اب زندگی کا کارواں چلنے لگا
ابتداً بحر میں چلتا رہا، بڑھتا رہا
بحر سے نکلا تو بحرِ بے کراں بن کر چلا
جتنا قدرت نے شکست و ریخت کا منتر پڑھا
ہر نفس، ہر آن بامِ اوج پر چڑھتی گئی
اور بالآخر ہر طرف تھی زندگی ہی زندگی،
کتنے قرنوں میں بڑھا یہ کاروانِ زندگی

قلزموں میں زندگی کی اوّلیں جنبش ہوئی
آئی سطحِ بحر سے میلاد خوانی کی صدا
اوّلیں مضراب سے لرزاں ہوا تارِ وجود
مچھلیوں کی شکل میں ابھرے ارادے بحر کے
پانیوں پر سانس لیتی کشتیاں چلنے لگیں
زندگی کی سانس سے جھونکے معطّر ہوگئے
زندگی آواز، اشارہ، گیت، آگاہی، قیاس
سیلِ احساسات، طوفاں گاہ جنبشِ زندگی
زندگی، تابندگی، رقصندگی، رخشندگی،
پُرفشاں، جنباں، رواں، جولاں، غزلخواں زندگی
تند و طوفانی عناصر کی روانی زندگی
دین کے رنگیں صحائف کی مصنّف زندگی
دہر کا دل، خاک کی معراج، فطرت کی مراد
کردگارِ انبیاء، خلّاقِ یزداں زندگی،
اور نئی شکلوں، نئے اجسام میں ڈھلنے لگا
اور پھر آہستہ آہستہ زمیں پہ آگیا
پاؤں رکھتے ہی زمیں پر آسماں بن کر چلا
زندگی کا فاتحانہ عزم اتنا ہی بڑھا
جس قدر قدرت سے یہ لڑتی گئی بڑھتی گئی
مچھلیاں، حشرات، طائر، چارپائے، آدمی
سانس اکھڑ جاتی ہے اس تفسیر سے تاریخ کی

سوچ تو، کس منزلِ طوفاں سے آئی ہے حیات کتنی موتوں کو کچل کر مسکرائی ہے حیات
کتنی لاتعداد زنجیروں کو ہے توڑے ہوئے اور کلائی کتنے طوفانوں کی ہے موڑے ہوئے
کتنی تاریکی کے اندر پائی ہے راہِ نجات کتنے میداں تھے جہاں گر گر کے اُٹھی ہے حیات
کتنی اندھی طاقتوں سے کس قدر دکھ پائے ہیں کس قدر سفاک قدرت کے طمانچے کھائے ہیں
ابتدائی منزلوں کی بے پروبالی کو دیکھ قہر افگن مادّے کی ہمتِ عالی کو دیکھ
قدرتِ جبّار کا بھی خشک ہوتا ہے لہو ! مادّے کے فاتحانہ ولولوں کے رُوبرو

رُوح کے دھوکے میں عاقل کو نہ آنا چاہیئے
مادّے کے سامنے گردن جھکانا چاہیئے

ن-م راشد

پہلی کرن

کوئی مجھ کو دورِ زمان و مکاں سے نکلنے کی صورت بتا دو،
کوئی یہ سجھا دو کہ حاصل ہے کیا ہستئ رائیگاں سے ؟
کہ غیروں کی تہذیب کی استواری کی خاطر
عبث بن رہا ہے ہمارا لہو مومیائی !
میں اُس قوم کا فرد ہوں جس کے حصے میں محنت ہی محنت ہے نانِ شبینہ نہیں ہے
اور اس پر بھی یہ قوم دلشاد ہے شوکت پاستاں سے
اور اب بھی ہے امید فردا کسی ساحرِ بے نشاں سے !
مری جان، شب و روز کی اس مشقت سے تنگ آ گیا ہوں
میں اس خشت کوبی سے اکتا گیا ہوں
کہاں ہیں وہ دنیا کی تزئین کی آرزوئیں
جنہوں نے تجھے مجھ سے وابستہ تر کر دیا تھا ؟

تری چھاتیوں کی جوئے شیر کیوں زہر کا اک سمندر نہ بن جائے،
جسے پی کے سو جائے ننھی سی یہ جاں
جو اک چھپکلی بن کے چمٹی ہوئی ہے ترے سینۂ مہرباں سے
جو واقف نہیں تیرے دردِ نہاں سے؟
اسے بھی تو ذلت کی پابندگی کے لئے آلۂ کار بننا پڑے گا
بہت ہے کہ ہم اپنے آبا کی آسودہ کوشی کی پاداش ہیں آج بے دست و پا ہیں
اس آئندہ نسلوں کی زنجیرِ پا کو تو ہم توڑ ڈالیں!

مگر اے مری تیرہ راتوں کی ساتھی
یہ شہنائیاں سن رہی ہو؟
یہ شاید کسی نے مسرت کی پہلی کرن دیکھ پائی!
نہیں، اس دریچے کے باہر تو جھانکو
خدا کا جنازہ لئے جا رہے ہیں فرشتے
اُسی ساحرِ بے نشاں کا
جو مغرب کا آقا ہے مشرق کا آقا نہیں ہے!
یہ انساں کی برتری کے نئے دور کے شادیانے ہیں سُن لو
یہی ہے نئے دور کا پرتو اولیں بھی
اُٹھو اور ہم بھی زمانے کی تازہ ولادت کے اس جشن میں مل کے دھومیں مچائیں
شعاعوں کے طوفان میں بے محابا نہائیں!

ن م راشد

سرگوشیاں

"پھر آج شام گاہ سرِ رہگزر اسے
دیکھا ہے اس کے دوشِ حسیں پہ جھکے ہوئے!"
"یار دوہ ہرزہ گرد
ہے کسبِ روزگار میں اپنا شریکِ کار،
راتوں کو اس کی راہگذاروں پہ گردشیں
اور میکدوں میں چھپ کے مے آشامئ طویل
رسوائیوں کی کوئی زمانے میں حد بھی ہے!"
"یہ غصّہ رائیگاں ہے ہمیں تو ہے یہ گلہ
وارفتہ کیوں اسی کے لئے ہے وہ عشوہ ساز
کیوں اتنی دلکشی بھی خدا نے نہ دی ہمیں
تسخیر اس کا خندۂ بیباک کر سکیں؟"

"اب تو کسی نوید کا امکان ہی نہیں
جب اس کا ول کی آرزوؤں کے حصول تک،
ایک اپنے یارِ غار سے ہے ربطِ شرمناک
اک رشتۂ ذلیل!"
"یہ اس کی شاطری ہے کہ 'زلفِ عجم' کا دام؟"
"کچھ بھی ہو اس میں شائبہ شاعری نہیں
برسوں کا ایک ترسا ہوا شخص جان کر
پہچانتی ہے دور سے عورت کی بو اسے"
"اور کر رہا ہے اس کا نصیبہ بھی یاوری!"
"اِس رشکِ بے بسی سے میرے دوست فائدہ؟
ہے کچھ تو اپنا زور گریباں کے چاک پر
حاصل نہیں ہے ہم کو اگر وہ شرابِ ناب
تو بام و در کی شہر میں کوئی کمی نہیں
دو 'پول' ایک پیکرِ یخ بستہ ایک رات"

تصدّق حسین خالد

حُسنِ قبول

گرج رہا ہے سیہ مست، پیل پیکر ابر
اُداس کوہ کی چوٹی پہ ایک تنہا پیڑ
اُٹھا رہا ہے سوئے آسماں وہ تنہا شاخ
سرک رہی ہے ابھی جس میں زندگی کی نمی
بڑھا ہو جیسے کسی بے نوا کا مفلس ہاتھ
ہجومِ یاس میں اک آخری دُعا کے لئے

برس، محیطِ کرم! ایک بار اور برس
بس ایک بار مجھے اور پھول لانے دے
تڑپ رہا ہے ابھی مجھ میں سازِ برگِ نمو
یہ میری کلیاں، یہ پتّے ابھی تو زندہ ہیں

اُتر، اُتر میرے دامن پہ پھول برسا دے"

مچل کے ابر کے پردوں سے بے حجاب آیا
دُعائے نیم شبی کا مگر جواب آیا
شرار برق کا ہیجان
پیڑ ــــ طور بدست
زفرق تا بقدم ایک پھُول
حُسن قبول ــــ

CC-0 Kashmir Research Institute. Digitized by eGangotri

فیض احمد فیض

اے دلِ بیتاب ٹھہر!

تیرگی ہے کہ اُمنڈتی ہی چلی آتی ہے — شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی — دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے

رات کا گرم لہو اور بھی بہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بیتاب ٹھہر

ابھی زنجیر چھنکتی ہے پسِ پردہ ساز — مطلق الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی
ساغرِ ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں — لغزشِ پا میں ہے پابندئ آداب ابھی

اپنے دیوانوں کو دیوانہ تو بن لینے دو
اپنے میخانوں کو میخانہ تو بن لینے دو
جلد یہ سطوتِ اسباب بھی اُٹھ جائے گی
یہ گرانبارئ آداب بھی اُٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہی، چھنکتی ہی رہے

میراجی

"اخلاق" کے نام

گھر سے ہر شام رنگیلے رسیا
بن سنور کر جو نکلتے ہیں تو اُن کی نظریں
راہ میں جاتے ہر اک دامن سے
یُوں اُلجھتی ہیں کہ گویا وہی دامن اُن کو
عکسِ افلاک نظر آتا ہو،
اور پھر چلتے ہوئے، بڑھتے ہوئے، راہ میں ہر شے کا تماشا کرتے،
اِک قدم رکتے ہوئے، رکتے ہی چل دیتے ہیں ——
"یہ تو کچھ ٹھیک نہیں۔"
آگے پہنچے تو یہ دیکھا کہ وہی کل کی رات
آج پھر رات بنی بیٹھی ہے
آج پھر دُور سے کہتی ہے کہ آؤ، آؤ،

یہ اندھیرا ہی سہارا دے گا،
"یہ بھی اب ٹھیک نہیں"
نِت نیا روپ اندھیرے میں سمٹتا جائے
"واہ، کیا بات ہے۔ یہ تان اچھوتی تو نہیں، دھن بھی پُرانی ہو گی
پھر بھی دیکھیں تو سہی"
دیکھتے دیکھتے ہر رات گذر جاتی ہے۔
دیکھنے والے کو معلوم نہیں
جھُوٹ اِک بار جواں ہوتا ہے
بند ہوتا ہُوا دروازہ، لُبھاتا ہُوا بستر ـــــ دونوں
ایک ہی بار مچلتی ہوئی آنکھوں میں جھلک اُٹھتے ہیں
دوسری بار کی فرصت ہی نہیں ہے اُن کو
"دیکھو یہ سر سے دوپٹہ سرکا"
"اُف! یہ زُلفوں سے اُلجھتی ہوئی بالی، توبہ!"
بڑھتے بازو اُنہیں پھر تھام لیا کرتے ہیں
بڑھنے والے کو یہ معلوم نہیں
جھُوٹ اِک بار جواں ہوتا ہے
بڑھنے والا تو بڑھا جاتا ہے، رُکتا نہیں، تاریکی میں
دن کا اِک بھید بھی ظاہر نہیں ہوتا، لیکن
دن کا ہر بھید ہے للچاتی ہوئی رات کا جادو، اس کو
کئی پھُسلانے کے، بہکانے کے ڈھب آتے ہیں
"اُوئی دیکھو تو، ذرا چین سے بیٹھو، تم بھی

"کیسے بے صبر ہو، تم نے شاید
"کبھی یہ ہاتھ، یہ چہرہ، یہ اُلجھتی ہوئی بالی، یہ مرے سر سے سرکتا ہُوا رنگین دوپٹہ نہیں دیکھا جب ہی!"
دیکھنے والا نگاہوں سے یہ کہتا ہے کہ ہاں ہاں، میں نے
کبھی دیکھا ہی نہیں،
اور وہ کہتی ہیں کہ جب ہی! جب ہی! . . . . .
اور یہ جھُوٹ بھی اِک لمحہ جواں رہتا ہے،
اور وہ ہاتھ، وہ چہرہ ــــ کوئی پوچھے کہ یہ کب سے، تو ابھی، آج، ابھی،
اور یہ جھُوٹ بھی اِک لمحہ جواں رہتا ہے،
سچ تو اک پیرِ خمیدہ ہے، وہ دروازے کے باہر، تنہا،
سوچتے سوچتے سو جاتا ہے،
(جانے کیا سوچ کے سو جاتا ہے؟)
اور جب رات کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے متوالے رنگیلے رسیا
گھر کو چلتے ہیں تو سچ چونک اُٹھا کرتا ہے اور پُوچھتا ہے
"کل بھی آپ آئیں گے؟ ــــ آئیں گے، ــــ ضرور!"
بند ہوتا ہُوا دروازہ، پکار اُٹھتا ہے
جھُوٹ! ــــ لیکن اُسے سُنتا ہی نہیں کوئی کبھی
اور یہ جھُوٹ بھی اک لمحہ جواں رہتا ہے۔

ڈاکٹر محمد الدین تاثیر

دوراہا

ریل گاڑی پہ یہ گھمسان، الٰہی توبہ! -
نہ مروت، نہ تکلف، نہ تبسم، نہ ادا !
یونہی اک غیر شعوری سی خشونت کا خروش !——
بے ارادہ ہے تو کیا، غیر شعوری ہے تو کیا
یہ نئے دَور کے احساس غلامی کا ظہور
انتقامانہ تحکم کی نمود !——
خانہ جنگی ہی سہی
اس میں اک اظہارِ بغاوت بھی تو ہے
یونہی یونہی سہی
اِک شائبۂ دادِ شجاعت بھی تو ہے
——(چاک تو کرتا ہوں میں اپنا گریباں ہی سہی)

کلبلاتی ہوئی مخلوق کی اِس دلدل میں
سینہ تانے ہوئے کچھ لوگ بڑھے جاتے ہیں
خوب پھنکارتے، پھن پھیلائے! ___
لوگ؟ وہ لوگ۔۔۔۔ کالانعام نہیں
جن کو ٹھکرائے ہوئے جاتے ہیں
یہ لوگ ___ بڑے صاحب لوگ! ___
یہ جو حکّام ہمارے ہیں یہ حکّام نہیں
جو ہمیں سے ہیں مگر ہم میں نہیں
یہ جو بندوں کے ہیں آقا مگر آقا کے غلام
___ باوفا ہوں تو ہوں بے دام نہیں ___!
___ (تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہُوا تھا)

اِن پہ دُنیا کی ہر اک راہ کشادہ ہے مگر
آج اک سنگِ گراں حائل ہے۔
کہ اُٹھائے نہ اُٹھے اور ہلائے نہ ہلے
دوسرے درجے کے دروازے میں
اِن کے آقاؤں کا اک فرد ___ فرنگی گورا۔
باہیں پھیلائے ہوئے، راستہ روکے ہے کھڑا
(کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگن عشق)
سیٹیاں بجنے لگیں ___ خدمتِ سرکار بجالانا ہے
اِدھر کا وہی خود سنگِ رہ منزل ہے؟ ___

زندگی آ گئی دوراہے پر

——— دیر کیوں کرتے ہو، بھاگو بھاگو

دوڑ کر بھڑ کے ڈربے میں گھسو

اپنے ہم جنس غلاموں میں ملو

زندگی آ گئی دوراہے پر! ———

سیّد احتشام حسین

افسانہ اور حقیقت

حقیقت اور افسانہ کا تضاد ادب کی دنیا میں مدتوں تک اتنی اہمیت کا حامل رہا ہے کہ اس سے فکر و خیال کی راہیں بدل گئی ہیں۔ لفظ افسانہ جھوٹ کا اور حقیقت سچ کا مترادف سمجھا گیا ہے اور اگرچہ یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ جھوٹ کی بنیاد بھی کسی سچ ہی پر رکھی جاتی ہے لیکن انسانی ذہن نے اپنی آسودگی کے لئے ہزاروں سال تک افسانوی ادب کو حقیقت سے دور ہی رکھنے کی کوشش کی یہاں تک کہ نہ صرف ادب میں بلکہ ذہنوں میں بھی افسانہ اور حقیقت کے لئے الگ الگ خانے بن گئے۔ افسانہ غیر واقعی، سطحی، ناپائیدار اور ہلکے خیالات کا آئینہ دار بنا اور حقیقت میں اُن افعال اور اقوال کا شمار ہونے لگا جن میں گہرائی، واقعیت، ازلیت اور سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ اس طرح افسانہ اور حقیقت کے درمیان بعد المشرقین کی سی کیفیت پیدا ہو گئی جن کا ایک جگہ اجتماع غیر منطقی اور محال معلوم ہونے لگا یہی نہیں بلکہ نفسیاتی طور پر افسانے کے لئے نفرت اور حقیقت کے لئے عزت کے جذبے دلوں میں بیدار ہوئے سنجیدہ کتابیں پڑھنے والوں اور عالمانہ اندازِ نظر کے حامیوں نے افسانے کے لئے نفرت اور حقیقت کے لئے عزت کے جذبے دلوں میں بیدار کئے سنجیدہ کتابیں پڑھنے

والوں اور عالمانہ اندازِ نظر کے حامیوں نے افسانے کو اپنے مطالعہ میں جگہ نہ دی بلکہ اسے تخلیقی ادب کا ایک حصہ سمجھتے ہوئے بھی قابلِ اعتنا نہ خیال کیا۔ لیکن کیا واقعی افسانہ اور حقیقت میں بہت زیادہ بُعد ہے؟ کیا افسانہ میں حقیقت کی جستجو بیکار ہے؟ کیا حقیقت افسانہ کی طرح دلچسپ نہیں؟ اور سب سے زیادہ غور طلب یہ مسئلہ ہے کہ حقیقت کہہ کر کیا مراد لیا جاتا ہے اور کیا مراد لیا جانا چاہیئے؟

ابتدائی دورِ تمدن سے اسوقت تک کے اہم افسانوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان سوالوں کے جواب آسانی سے مل سکتے ہیں، یہی نہیں بلکہ یہ بھی معلوم ہوگا کہ دورِ جدید میں افسانہ کا کیا مفہوم ہے افسانویت اور حقیقت میں کیا تعلق ہے اور وہ افسانے جو حقیقت کے حکیمانہ مفہوم میں حقیقت پر مبنی نہیں ہیں، افسانوی ادب میں اُنکی کیا جگہ ہے۔ افسانے میں حقیقت کی تلاش ایک ایسا موضوع بحث ہے جس پر غور کرنے کے لئے اخلاقیات، نفسیات، حیاتیات، معاشرت اور معاشیات سبھی سے مدد لینے کی ضرورت ہوگی کیونکہ دیکھنے میں تو یہ سوال سیدھا سادا نظر آتا ہے کہ افسانہ نگار کو افسانے کے لئے مواد کہاں سے ملتا ہے لیکن فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِس میں انفرادیت اور اجتماعیت، حقیقت اور عینیت، خارجیت اور داخلیت کے ساتھ ساتھ خیال کی پیدائش کے مسئلہ پر بھی بحث کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ خیال کہاں سے پیدا ہوتا ہے اور کہاں سے اپنے لئے مواد حاصل کرتا ہے؟ کیا خیال مادّہ سے بے نیاز ہے اور خود بخود پیدا ہو جاتا ہے؟ اگر اس کا جواب یہ ہے کہ خیال کا تعلق مادّہ سے نہیں ہے تو پھر خیال کی حقیقت کیا ہے اور اگر جواب اثبات میں ہے یعنی خیال تو مادّہ ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ چاہے قوتِ متخیلہ اُس میں کتنی ہی رنگ آمیزی کرلے تو پھر فلسفۂ مادیت کا اہم مبحث ہمارے سامنے آتا ہے جو یہ بتاتا ہے کہ پہلے مادّی وجود ہے پھر شعور، ادراک اور عمل۔ اس لئے شعور، عمل اور خیال کی حیثیت بھی مادّی ہے یوں جب خیال مادّہ کا عکس ہوگا تو پھر خیال میں کسی نہ کسی شکل میں حقیقت ضرور موجود ہوگی خواہ وہ اچھی صورت میں پیش کی گئی ہو خواہ بُری میں، نفی میں ظاہر کی گئی ہو یا اثبات میں، حقیقت کا ادراک صحیح ہو یا غلط، حقیقت میں طبقاتی شعور کی جھلک ہو یا نہ ہو حقیقت کو اُس کے سماجی متعلقات سے الگ کر لیا گیا ہو یا صحیح رشتہ میں پیش کیا گیا ہو یہ سب کچھ ممکن ہے لیکن مادّے کی دھندلی پرچھائیں کے بغیر حقیر سے حقیر

افسانے کی بھی تخلیق ممکن نہیں۔

اب کوئی شخص بڑی آسانی کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ جب ہر افسانے میں حقیقت کی جھلک ضرور ملتی ہے تو پھر اس سوال کو اتنی اہمیت دینے سے کچھ فائدہ ہی نہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ حقیقت کا لفظ فلسفہ میں ایک مخصوص تاریخ رکھتا ہے اور مختلف قسم کے فلسفیوں نے اسے اتنے مختلف مفاہیم میں استعمال کیا ہے کہ وہ مبہم مفہوم بھی ہمارے ذہن میں الجھ جاتا ہے جو ہم جانتے ہیں اور جسے ہر وقت استعمال کرتے رہتے ہیں۔ ادب میں بھی حقیقت کی جستجو اسی فلسفیانہ کرید کا نتیجہ ہے۔ وہ لوگ جو ادب کو انسان کے اسی شعور کا نتیجہ سمجھتے ہیں جس کی کرنوں میں سے فلسفہ بھی روشنی کی ایک کرن ہے ان کیلئے حقیقت ایک ایسی وحدت کی صورت اختیار کر لیتی ہے کہ اسے فلسفہ، سیاسیات، سائنس اور ادب ہر ایک میں ایک مخصوص نظام کے ماتحت ہی عمل پیرا دیکھا جا سکتا ہے اور یہ مخصوص نظام ان مادی روابط کا آفریدہ ہوتا ہے جو ایک طرف تو بہت سی مادی شکلوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ دوسری طرف جذباتی اور روحانی سربلندیاں ہیں جنہیں معنوی عروج سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اسلئے حقیقت کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش میں ان مادی روابط اور ان کے اثرات اور نتائج کا مطالعہ بھی ہو جائے گا۔ جن کی جستجو ہر دور میں کی گئی ہے۔ بعض لوگوں کے لئے یہ حقیقت اس صداقت کا نام ہے۔ جسے افلاطون اور اس کے ہم مشربوں نے خیر، حسن اور صداقت کے صفاتِ ثلاثہ میں سے ایک ضروری صفت قرار دیا تھا۔ بعض لوگوں کے خیال میں یہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ بعض فلسفی تو افلاطون کی اس تصوریت اور عینیت کے لئے بھی حقیقت کا لفظ استعمال کرتے ہیں جسے ڈاکٹر اقبال نے جو خود تصوریت سے قریب تھے "اعیان نامشہود" کہا تھا۔ بہرحال اس لفظ کے کسی مقررہ معنی تک ذہن کی رسائی اسی حالت میں ہو سکتی ہے جب ہم اس کے استعمال کرنے والے کے مقصد اور فلسفۂ حیات سے واقف ہوں۔ ایسے تمام الفاظ تجریدی حیثیت سے ہمیں ہمیشہ مابعد الطبیعیاتی دنیا میں پہنچا دیں گے اس لئے ان کو استعمال ہی کر کے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ مخصوص مادی رشتہ میں حقیقت کے مخصوص معنی نکلتے ہیں۔

خالص فلسفیانہ موشگافیوں سے ہٹ کر جن لوگوں نے محض ادبی حیثیت سے اس لفظ پر نظر ڈالی ہے

انہوں نے بھی حقیقت کو ان مادّی رشتوں میں سمجھا ہے جن سے اُن کے وجدان اور ذوق کی تخلیق ہوتی تھی۔ ڈاکٹر آئنسن نے اس لفظ پر بحث کرتے ہوئے اس کی ادبی حیثیت کے متعلق یہ جملے لکھے ہیں "آرٹ (یا فن) میں حقیقت کے معنی یہ ہیں کہ کسی شئے میں پائے جانے والے توافق و جمال کے عناصر کو عمداً نظر انداز کرنا اور کریہہ چیزوں کو بیان کرنا یا حقیر و ذلیل جزئیات کی تفصیل پیش کرنا یا اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ انفرادی اور جزئی اجزا پر بہت زیادہ زور دینا اور انواع اور کلی نمونوں کو نظر انداز کر کے جزئی تفصیلات میں منہمک ہو جانا۔ لیکن فن و ادب میں حقیقت کے نہایت صحیح معنی یہ ہیں کہ واقعات کا جیسے بھی کہ وہ ہیں اعادہ کیا جائے بغیر اُن کی اس طرح توجیہہ کرنے یا ان کو اس طرح متصوّر کرنے کی کوشش کے کہ ان کے خیر کے عنصر کو شر پر اور جمال کے عنصر کو بدصورتی پر غالب کر دیا جاتے۔" (مقدمہ فلسفۂ حاضرہ از ڈاکٹر آئنسن مترجمہ ڈاکٹر میر ولی الدین جامعہ عثمانیہ)۔ ادب میں تصورِ حقیقت کے جو بھی معانی بیان کئے گئے ہیں اُن سب میں حقیقت کو ایک محدود مفہوم میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے، اگرچہ ان میں سے ہر ایک کا تعلق حقیقتوں کے مادّی رُخ سے ہے، جن میں حقیقت متحرک واقعات ہی کے آئینہ میں دیکھی جا سکتی ہے ذہن کی دنیا میں حقیقت کا ایک جامد، قطعی، غیر تغیر پذیر مفہوم ہو سکتا ہے جو عمل کی زندگی میں ناممکن ہے اور افسانہ کی تخلیق ذہن کی پیدا کی ہوئی زندگی سے نہیں ہوتی بلکہ کشمکش کی اُس دنیا سے ہوتی ہے جہاں عمل ہی کی کسوٹی پر افراد پرکھے جا سکتے ہیں، اگر کوئی افسانہ نویس اپنے مواد کی جستجو صرف اپنے ذہن کے گوشوں میں کرے تو اس کے کردار عام طور سے غیر حقیقی قرار پائیں گے مختصر لفظوں میں حقیقت سے دور ہونے کا مفہوم یہی ہے لیکن اس بحث کو کسی قدر تفصیل سے دیکھنا چاہیئے۔

افسانہ گوئی اور افسانہ نویسی کے ابتدائی دور میں حقیقت کا مفہوم وہ نہیں تھا جو آج ہے، اور ظاہر ہے کہ وہ ہو بھی نہیں سکتا تھا، اسی لیے عرض کیا گیا ہے کہ حقیقت کا کوئی غیر مرئی تصوّر صرف خیال کی بات ہے زندگی میں جس طرح تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اُسی طرح حقیقت کے مفہوم میں بھی ہوتی رہیں۔ یہ تبدیلی اُس کشمکش کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے جو انسان اپنی بقا اور بہبود کیلئے

مختلف زمانوں میں کرتا رہتا ہے۔ انسان کی یہ جدوجہد کی تاریخ تمدّن کی تاریخ ہے وہ فطرت سے برسرِ پیکار ہوتا ہے اور انسانی جماعت کے لئے کچھ حاصل کرتا ہے انسان کی طاقت جماعتی اور انفرادی حیثیت سے بڑھتی ہے یہ اُس کی پہلی جدوجہد ہے پھر جماعتی حیثیت کو منظم کرنے کے لئے وہ ایک جدوجہد سماج ہی کے افراد کے خلاف کرتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ پیچیدہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ دونوں قسم کی کشمکش ایک دوسرے کو مدد دیتی ہوئی انسانیت کو آگے بڑھاتی ہے۔ ارتقائے تمدّن کے ابتدائی عہد میں انسانوں کو فطرت اور انسان دونوں کو سمجھنے میں دشواریاں پیش آئیں فطرت سے ٹکر لیکر جس جگہ وہ بے بس ہو جاتا تھا وہاں وقتی طور پر کسی مافوق فطرت طاقت کا تصور کر کے سپر انداختہ ہو جاتا تھا۔ مادی وسائل اور علم و حکمت کی کمی کی وجہ سے بالکل معمولی معمولی چیزوں تک اُس کی دسترس نہ تھی اِس لئے وہ مشکلات کو حل کرنے یا اُن سے چھٹکارا پانے کیلئے اُن طاقتوں کا تصور کرتا تھا جو اُس کی کمی کو پورا کر دیں۔ اِس طرح دیوی دیوتاؤں نے جنم لیا۔ ساری دنیا کے تمدّن میں علم الاساطیر اور دیومالا میں ایک قسم کی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ دیوتاؤں میں انسانوں کی غیر معمولی طاقت کا اظہار پایا جاتا ہے وہ طاقتِ انسانی کا مبالغہ آمیز مظہر ہوتے ہیں۔ اسے دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ سکتے ہیں کہ انسان نے فطرت کو سمجھنے اور اپنی مادی ضرورتوں پر قابو پانے کی جدوجہد کبھی ترک نہیں کی بلکہ اُس وقت اس کے ذہن میں جو خلا پیدا ہوتے تھے اُسے بنیاد قرار دے کر آگے بڑھنے کی جدوجہد شروع کر دیتے تھے اور اپنے مسائل کو ذہنی ہی طور پر ہی حل کر کے کسی قدر آسودہ ہو جاتے تھے۔

یہی تصورات دوسری طرف نئے مسائل پیدا کرتے تھے۔ دیوی دیوتاؤں کے تذکروں کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے انسانوں کا ذکر بھی ابتدائی عہد کی کہانیوں میں ملتا ہے جو عام انسانوں اور دیوتاؤں کے درمیان واسطہ کا کام دیتے تھے۔ یہ صورتِ حال طبقات کی اُن بنیادوں کو مضبوط بناتی تھی جو ذرائع پیداوار پر قدرت حاصل کرنے کے سلسلہ میں وجود پذیر ہو جاتی تھیں۔ یہ ساری پیچیدگی ابتدائی انسانوں کے تخیل پر بہت سے مرکب اثرات ڈالتی تھی اور حقیقت کا عجیب و غریب

تصور پیدا ہوتا تھا۔ اس حقیقت کی جستجو ہم اُس وقت کے رسم و رواج میں، طریقِ عبادت میں اور ٹونوں ٹوٹکوں میں کر سکتے ہیں۔ دیوی دیوتاؤں کے ساتھ منجموں، برہمنوں، پروہتوں، فقیروں اور نامعلوم طاقتوں کی حکومت بھی کیونکہ اُس وقت کی مادّی ترقی کے لحاظ سے اسباب و علل کے رشتہ کو جوڑنا اور اپنے موافق نتائج نکالنا عام انسانوں کے بس میں نہ تھا جب واقعات مبہم اور نامعلوم ہوتے ہیں تو ذہن کو جولانیوں کا خوب موقع ملتا ہے اور اگر دیو مالا میں پیش آنیوالے واقعات کا تجزیہ کیا جائے تو ان میں انسانوں کی ترقی کی اُس خواہش کا پتہ آسانی سے چل جائے گا جس سے عالمِ انسانیت ہمیشہ مضطرب رہا ہے۔ ابتدائی کہانیوں میں تخیل کی یہی فراوانی سرسری نظر سے مطالعہ کرنے والوں کو دھوکے میں ڈالتی ہے اور وہ ہر اُس چیز کو غیر حقیقی سمجھ لیتے ہیں جس میں حقیقت کا یہ تصور پیش کیا گیا ہے۔ ایسی کہانیوں کا حکیمانہ مطالعہ کرنیوالوں کو ابتدائی انسانوں کی ذہنی افتاد اور فطری صلاحیتِ تخلیق کے ساتھ ساتھ سماجی عوامل اور ضروریات کا علم بھی ہونا چاہیئے ورنہ وہ حقیقت کے اُس مرکز کو نہ پاسکیں گے جس کے گرد وپیش تخیل نے نقش و نگار کی دنیا تیار کر دی ہے۔ انسان کی مادّی ضرورتوں کو مرکز قرار دے کر کہانی میں خیالی تصویروں کی آمیزش تحلیلی نقطۂ نظر کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ اس لئے افسانہ میں حقیقت کا عنصر تلاش کرتے وقت فکرِ انسانی کے ارتقا کے اُن خطوط کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے جو عام مادّی زندگی سے اثرپذیر ہوتے رہتے ہیں۔

جانوروں، پرندوں اور حیوانوں کو کردار قرار دے کر کہانیاں لکھنے کا رواج تقریباً ہر ملک میں دکھائی دیتا ہے۔ انسانی فکر کے ایک مخصوص قسم کی حقیقتوں کے اس نئے طرز اظہار نے جنم لیا۔ ان کہانیوں میں بھی اخلاق اور رسم و رواج کے جو پہلو پیش کیئے جاتے ہیں۔ سیاستِ مُدن اور تدبیرِ منزل کے جو اصول مرتب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اُس کا گہرا تعلق اُس مخصوص عہد اور اُس مخصوص ملک کی مادّی زندگی سے ہوتا ہے۔ اخلاق و معاشرت کے وہ اُصول جنہیں اُس وقت کے مفکرین منوانا چاہتے ہیں۔ ان انوکھے

افسانوں میں پیش ہوتے ہیں اور اگر ذرا سے غور و فکر سے کام لیا جائے تو جانور دل اور چڑیوں کے لباس میں اچھے بُرے انسان ہی چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔ بہت سا ادب العالیہ جسے آج بھی اُس عہد کی معاشرتی زندگی کو سمجھنے کے لئے پڑھا جاسکتا ہے ایسی ہی کہانیوں میں پایا جاتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص حقیقت کا ایک جامد تصوّر رکھتا ہے تو وہ اُس وقت کے خلّاق ادیبوں کے کارناموں کو سرسری داستان گوئی سمجھ کر غیر حقیقی قرار دے گا۔ جن لوگوں نے ادب کو طبقاتی زندگی کے ترجمان یا کم سے کم غیر شعوری اظہار کی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اُنہیں ایسی کہانیوں میں بڑے اور چھوٹے، حاکم اور محکوم، اچھے اور بُرے، مستحق اور غیر مستحق کا وہی نقطۂ نظر دکھائی دے گا جس سے زندگی بنتی ہے۔

الف لیلیٰ اسے زیادہ پرواز خیال، مہذّب داستان طرازی، زندگی کے بہترین خوابوں کی خوشگوار تعبیر، رنگینی، سرمستی، حقیقت پر افسانے کا دھوکا اور افسانوں میں حقیقت کی کچھ کھلی اور کچھ چھپی ہوئی شکل اور کہاں ملے گی۔ اگر کوئی شخص الہ دین کے چراغ، کل کے گھوڑے، علی بابا چالیس چور اور سندباد جہازی کی کہانیاں پڑھ کر یہ سوچنے لگے کہ یہ سب غلط ہے تو چاہے اُس نے بات بہت صحیح کہی ہو لیکن اُس کی سادگی قابلِ داد نہ کہی جائے گی۔ خلفائے بنی عبّاس کے زمانے میں علم و فضل کی ترقی، نئے ملکوں نئے لوگوں کی معلومات، ہوشربا رنگینی، حُسن و عشق، ناز و نیاز کی افراط اور زندگی سے اُس کا سارا رس نچوڑ لینے کی خواہش کا زور صرف گہری نظر سے تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کو نظر آسکتا ہے، اگر ان حقیقتوں کی روشنی میں الف لیلیٰ کو نہ پڑھا جائے تو ان کہانیوں میں چھپی ہوئی حقیقت طرازی کا پتہ نہ چل سکے گا۔ حقیقت کے گرد مبالغہ کا گہرا پردہ ان افسانوں کے مصنّف کے تخلیقِ فن کے شعور کی ایک شکل ہے۔ اہم سماجی اور معاشرتی حقیقتیں نیا روپ بھر کر ظاہر ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ کہہ کر رہ جانا

کا الف لیلیٰ ایں حقیقت طرازی سے کام نہیں لیا گیا ہے صحیح نہیں ہے کیونکہ ایسا کہنے والے نے یا تو اُس عہد کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا ہے یا وہ افسانوی ادب کو محض تفریح کے لئے پڑھتا اور دیکھتا ہے۔ اور اُسے زندگی کے مسائل کی روشنی میں سمجھنے یا حل کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔

اسی طرح داستانوں کی واقعیت مبالغہ سے مجروح اور بعض اوقات افسانہ کے لحاظ سے بھی بے اثر ہونے کے باوجود اپنے عہدِ تصنیف کے طبقاتی تقاضوں امنگوں اور خواہشوں کی جھلک دکھاتی ہے۔ مذہب کی صداقت، اُس کی عظمت، حق و باطل کی آویزش میں مصائب اور دشواریوں کے باوجود حق کی فتح، یہ چیزیں داستانوں کی خیالی دنیا میں بھی بنیادی حقیقتوں کے طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ داستانیں اس لحاظ سے حقیقت سے دور ہیں کہ اُس زمانے کی مکمل مادّی یا روحانی زندگی کی تصویر کشی اُن میں نہیں پائی جاتی، مصوّری اور بیان کی وہ غیر معمولی طاقت جو ان داستان گویوں کا خاصّہ تھی زندگی کی حقیقی تصویر بنانے میں صرف نہ ہو سکی کیونکہ اُن کی نصب العینیت اور تصوریت، ایک ایسی دنیا کی تخلیق کرنا چاہتی تھی جس سے لوگ محروم تھے۔ ان داستانوں نے یہ بتایا کہ صداقت کے حامیوں کو بھی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے غیر معمولی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور دشمن پر قابو پانے کے لئے تھوڑی بہت وہی سیاسی اور حربی تدابیر اختیار کرنا پڑتی ہیں جو دشمن استعمال کر رہا ہے۔ یہ داستانیں اگر ایک طرف زندگی کی بہت سی بنیادی حقیقتوں کے بیان سے منہ چراتی تھیں تو دوسری طرف اُس اخلاق، اُس ترقی کی خواہش اور اُس جد و جہد کی ترجمانی کرتی ہیں۔ جو اونچا طبقہ اپنے پیشِ نظر رکھتا تھا۔

حقیقت کو اس کی مختلف شکلوں میں پہچاننے کے لئے ہر افسانہ کے مواد کا مطالعہ سماجی اور معاشی رجحانات، طبقاتی تضاد اور جہدِ حیات کی روشنی میں کرنا چاہیئے۔

کیونکہ یہی حقیقت کبھی ترقی کی شکل میں نمایاں ہو سکتی ہے کبھی انحطاط کی، کبھی جوش حیات اور نمو کی مظہر ہو سکتی ہے کبھی مایوسی اور بے بسی کی، کبھی مسائل حیات سے مقابلہ کی تصویر پیش کر سکتی ہے اور کبھی فرار کی ــــ حقیقت اپنے عہد کے فلسفہ اور عمل میں نمایاں ہوتی ہے اور اس کا اظہار ادیب اور افسانہ نگار کی خواہش کے مطابق ہوتا ہے۔

ایک عام انسان کا حقیقت کا تصور یہ ہے کہ جو بات جیسے واقع ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے اُسے بے کم و کاست بیان کر دیا جائے، مصوری میں اُس کی یہ خواہش بہت واضح ہوتی ہے۔ ادب میں چونکہ سارا کھیل لفظوں کا ہوتا ہے جس کی مدد سے مافی الضمیر کو واضح کیا جا سکتا ہے اِس لئے جب تک کہ لکھنے والے اور پڑھنے والے کے درمیان لفظوں کے مفہوم اور خیال و بیان کے تعلق میں کوئی مشترک بات نہ ہوگی اُس وقت تک حقیقت کی یہ عمومیت بھی ناقص شکل میں سامنے آئے گی۔ حقیقت کا یہ سادہ مفہوم کہ افسانہ نگار کیمرہ کی طرح ہر واقعہ کی نقل اُتار دے کچھ زیادہ صحیح نہیں ہے۔ واقعات چاہے لمبائی، چوڑائی، موٹائی، گہرائی اور اونچائی میں نہ ناپے جا سکیں لیکن اُن کی بعض ایسی سمتیں وقت اور جگہ میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں کہ حقیقت نگاری کا یہ لغوی مفہوم اُن کے ظاہر کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ حقیقت نگاری کی تحریک، ایک شعوری تحریک کی حیثیت سے بھی پُرانی ہو چکی، اس پر اچھی خاصی بحثیں ہو چکیں، فلسفیانہ، نفسیاتی، حکیمانہ اور محض جذباتی حیثیتوں سے حقیقت نگاری کی تحریک کو پرکھا گیا ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک حکیمانہ اور ادبی حقیقت میں بہت فرق ہے ــ لیکن سچ یہ معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت کا تصور بالکل الگ الگ شکلوں میں اس طرح کرنا کہ ایک قسم کی حقیقت دوسری قسم کی حقیقت سے مختلف معلوم ہو انسانی فکر اور کردار کی پیچیدگی سے ناواقفیت ہی کی بنا پر ہو سکتا ہے۔

اُردو افسانے میں حقیقت کی تحریک کا مطالعہ ہندوستانی سیاسیات اور افکار میں حقیقت کے مطالعہ کا حصّہ ہے۔ اس کی پیدائش میں اُس عقلیت پسندی اور تغیر پرستی کا ہاتھ ہے جو مغربی اور مشرقی زندگی کے تصادم سے پیدا ہوئی تھی اور تاریخی حیثیت سے یہاں کی معاشی، معاشرتی کشمکش کی صورت میں رونما ہوئی، مشرق میں روحانیت اور تصوّر پرستی کا زور برابر رہا ہے، یہاں تک کہ آج کی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں بھی اُس کے جلوے دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن آج جب دُنیا انسانوں کی بہبودی، ترقی اور عروج کے لحاظ سے یکساں آگے بڑھنا چاہتی ہے، سچائی اُن سائنٹیفک اصولوں میں نظر آتی ہے جو داخلی تخیّل پرستی کی گرفت سے نکل کر خارجی اور مادّی مظاہر میں نمایاں ہو رہی ہے۔ حقیقت کا یہی خارجی نظریہ ہندوستانی زندگی کے ہر شعبے پر اثر ڈال رہا ہے اور جس طرح یہاں کی سیاست، داخلیت اور وجدان کے دائرے سے باہر نکل کر حقیقتوں کا خارجی شعور کرنے لگی ہے۔ اُسی طرح ادب بھی اُس دھندلی داخلیت سے باہر آ رہا ہے جس کی بنیاد فقط رسمی ذہنی قیود پر تھی۔ اُردو افسانے کا ارتقا اور نشو و نما بہت کچھ اسی داخلیت اور خارجیت کے یک طرفہ یا صحیح شعور کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ روشنی اور علم کا زمانہ ہے لیکن اس وقت بھی اغراض اور اُن کے حاصل کرنے میں اختلافات کی وجہ سے بہت سے بتوں کے پجاری موجود ہیں اور بہت سی ایسی باتیں بھی صاف نہیں ہیں جن میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں ہے۔ حقیقت نگاری ہمیں منطقی نتیجہ تک پہنچاتی ہے، یعنی زندگی کی مادّی حقیقتیں جو مسائل ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں افسانہ نگار کا شعور لازمی طور پر اسباب اور نتائج کے رشتہ کی جستجو شروع کر دیتا ہے اور اگر اُس کا طبقاتی مفاد یا ذہنی رکاوٹ جرأت کی کمی یا انسانیت کا فقدان درمیان میں حائل نہ ہو جائے تو اُس کی حقیقت نگاری حقیقت کے اصل معیار پر بالکل پوری اُترے لیکن عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ کبھی کبھی تو

افسانہ نگار حقیقت کے سطحی مفہوم کا شکار ہو کر محض تصویر کشی کا فرض انجام دیتا ہے۔ اور اپنے تنقیدی شعور سے کام نہیں لیتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس گندگی اور غلاظت، جس نا انصافی اور بدی کی تصویر وہ کھینچتا ہے اُس سے اتنی دلچسپی لینے لگتا ہے کہ اُس کا شعور مشتبہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ حقیقتوں کی تہہ تک نہیں پہنچتا یا پہنچنا نہیں چاہتا اور اُس کا حقیقت کا تصوّر ناقص رہ جاتا ہے۔ افسانہ نگار کبھی کبھی تو بد دیانتی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے اور کبھی مسائل کے حل سے حکیمانہ واقفیت رکھنے کی وجہ سے۔ ایک ہوشیار نقاد بد دیانتی اور لاعلمی کے فرق کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے، اِس طرح حقیقت نگاری صرف حقیقت نگاری کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ اُس سے کسی نئی اور بہتر حقیقت کا انکشاف ہونا چاہیئے۔ فنّی حیثیت سے یہ منزل افسانہ نگار کے لئے مشکل ہوتی ہے۔ لیکن اُس کے فن کا کمال یہ ہے کہ نہ تو اس بہتر حقیقت کے اظہار میں اُس کا فن مجروح ہو اور نہ فنّی پابندیوں میں اسیر ہو کر حقیقت بے اثر ہو جائے۔

ہمارے موجودہ افسانہ نگاروں کے یہاں حقیقت کا تصوّر یکساں نہیں ہے۔ بعض بہت اہم مسائل پر ایک مبہم انداز میں اُن کے یہاں حقیقت کی چھوٹ پڑتی ہے۔ لیکن اُن کی خارجی زندگی کو اُس کے تمام لوازم اور روابط، تمام مادّی اور نفسیاتی، انفرادی اور اجتماعی پیچیدگیوں کے ساتھ سمجھنے کی کوشش گہرے تجزیہ اور نظریہ اور عمل کے اشتراک پر مبنی نہیں ہے۔ خارجی زندگی بڑے مرکب جذبے پیدا کر رہی ہے، ناآسودگی تو عام ہے، بیدلی اور تبدیلی کی خواہش میں بھی سب شریک ہیں لیکن ایسا کیوں ہے اور ایسا کیوں ہونا چاہیئے اس کے متعلق ہمارے بعض اچھے افسانہ نگار بھی اتنا نہیں جانتے جتنا جاننا فرد کو فرد کی

حیثیت سے یا فرد کو جماعت کے ایک رُکن کی حیثیت سے سمجھنے میں مدد دے سکے۔ ہمارے افسانہ نگار مختلف خاندانی اور مذہبی روایتوں میں پلے اور بڑھے ہیں۔ مختلف اثرات سے اُن کے شعور کی تشکیل ہوتی ہے، مختلف ذہنی اور جذباتی ادوار سے گذرے ہیں، بعض نے اپنی داخلیت کے سامنے سپر ڈال دی ہے، بعض اپنی داخلی کیفیات کا تجزیہ بھی سماج کے خارجی مظاہر کی روشنی میں کرتے ہیں، اِس لئے وہ شعور کے مختلف زینوں پہ ہیں۔ سرمایہ داری، فسطائیت، شہنشاہیت، جمہوریت اور قومیت کے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تصوّرات نے نہ جانے کتنی اُلجھنیں پیدا کر دی ہیں، سرمایہ داری نے جو روپ بدلے ہیں اور جس طرح اپنی طاقت اپنے تحفظ کے لئے صرف کی ہے وہ اب علمی مباحثوں کی بات نہیں ہے، اُس سے پیدا ہونے والے تضاد نے خود اُسے کتنا کھوکھلا کر دیا ہے، اُس کی نفع خوری نے محنت اور محبّت کا کتنا خون کیا ہے اِس سے بہت سے لوگ ذاتی تجربہ کی بنا پر واقف ہیں، اِس نے کتنی دفعہ انسانوں کو ترقی کا بھلاوا دے کر اپنی زنجیریں اور مضبوط کر دی ہیں، کِس طرح زہر آگیں خونیں راگوں کے تال پر پوری قوم کا رقص دیکھا ہے، کس طرح اپنی پیاس بجھانے کے لئے نا قابلِ یقین بے دردی سے خون بہائے ہیں اور انسانوں کے دُکھ درد کا کوئی علاج نہیں سوچا ہے، اِن سے اب ہر باشعور فن کار واقف ہے، انہیں اپنی نا آسودگی کے اسباب معلوم کرنے میں دشواری نہیں ہوتی، انہیں اپنی مسرتوں کے اُن خزانوں پر بیٹھے ہوئے سانپوں کا پتہ چل گیا ہے جو انہیں قریب نہیں جانے دیتے ـــــ ان تمام باتوں نے اُن کے فکر کی راہیں بدل دی ہیں اور وہ اپنی نفسیاتی اور مادّی بیماریوں کا سبب انہیں حالات میں تلاش کرنے لگتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اس بھول بھلیاں میں ہر شخص کامل اطمینان سے نہیں چل سکتا، قدم قدم پر دھوکے حقیقت کا بھیس بدلے ہوئے موجود ہیں،

قدم قدم پر ایسے موڑ ہیں جو بہ ظاہر انسانی جستجو کی منزل تک پہنچاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن بھول بھلیاں پھر بھول بھلیاں ہے اس لئے اپنے وقوف اور ادراک سے اُن بنیادی حقیقتوں کا پتہ لگا لینا خلوص میں شدّت اور نقطۂ نظر میں سچّائی کے عناصر شامل کر دے گا۔ اور جب غور کیا جائے گا تو یہی معلوم ہو گا کہ ہمارے چھوٹے چھوٹے محرکات جن پر ہم زیادہ تر داخلی نگاہ ڈال کر گذر جاتے ہیں۔ انہیں بنیادی خارجی حقائق کا عکس ہیں۔ اگر افسانہ نگار کو ان کا علم ہو تو وہ ایک قطرہ خون سے پُورے جسم کی حالت کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ اور اگر علم نہ ہو تو خلوص کے باوجود اُس کا تیر نشانہ پر نہیں بیٹھتا اور اگرچہ وہ اپنے وجدان اور جذباتی ہیجان کی وجہ سے اپنے خیالات کو حقیقت پر مبنی سمجھتا ہے لیکن ایسا ہوتا نہیں۔

یہ بنیادی حقیقتیں کیا ہیں؟ شاید اس سے زیادہ واضح کوئی دوسری بات نہیں کہ عام طور پر انسان اپنی مادّی زندگی کو ہر طرح خوشگوار بنانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ تاکہ اس سے انہیں روحانی تسکین بھی حاصل ہو ۔۔۔ ایسا کیوں نہیں ہوتا، ایسا کیونکر ہو سکتا ہے۔ ہمارے تمام حرکات و سکنات اسی کی تفسیر ہیں، الجھی ہوئی اور ناقابلِ فہم، مُبہم اور اُلجھائی ہوئی ہم ہی، آگے بڑھنا چاہتے ہیں اور ہم ہی اپنی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں، اور پھر وہی سوال کہ کیوں ایسا ہوتا ہے؟ یہ سوال ہمیں بنیادی مسائل کی تلاش پر آمادہ کرتا ہے اور ہم حکیمانہ حقیقت نگاری کے قریب پہنچ جاتے ہیں جہاں ہمارا تجزیہ خارجی نقطۂ نظر سے ہوتا ہے اور ہماری نگاہِ تنقید انسانی حرکات و سکنات کے محرکات اور سرچشموں تک پہنچا دیتی ہے۔ اِس سوال پر غور کرتے ہوئے ایک مفکر اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ ہم ڈاکٹر نہیں خود بیماری ہیں۔ سرمایہ داری کی بیماریوں کا یہ اعتراف ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ حقیقتیں جیسی دکھائی دیتی ہیں بالکل ویسی نہیں ہیں اُنکی

سماجی تحلیل ہمیں اصل حقیقت تک لے جائے گی۔

خارجی زندگی سے رشتہ توڑ کر حقیقت کی جستجو کرنا حقیقت کی جستجو نہیں، اپنے داخلی وجدان کی جستجو ہے اور حقیقت جو صرف داخلیت سے تعلق رکھتی ہو کسی حالت میں مکمّل نہیں کہی جا سکتی۔ اگر اسی سلسلہ میں داخلیت کا جائزہ لیا جائے اور اس کے پیدا ہونے بڑھنے اور متغیر ہونے کے اسباب پر غور کیا جائے تو نفسیات کا صحیح علم خارجی حقائق اور داخلی کیفیات کے تعلق کا راز کھول دے گا۔ اُن تجربوں سے قطع نظر جو انسانی جذبات کے خارجی محرکات کا پتہ لگانے کے لئے کئے گئے ہیں اور علمی حیثیت سے درست پائے گئے ہیں، افسانہ نگار کا روز کا مشاہدہ ہی انسانی فطرت کی تبدیلیوں کا پتہ دے سکتا ہے، مختلف حالات میں مختلف طبقے، عمر، مرتبہ، مزاج اور علمیت کے لوگ جس گوناگوں انداز میں عمل پیرا ہوتے ہیں اُسے معمولی طرح سمجھنے کے لئے علم النفس کے اُصول جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ شعور مادّی زندگی کا نتیجہ ہے، اس کے تغیّرات بھی مادّی زندگی کے تغیرات کا نتیجہ ہیں، اِس طرح انسانی کردار کے اعمال و افعال، افکار و جذبات کا حقیقی علم بغیر مادّہ کی حرکت کو سمجھے ہوئے نہیں ہو سکتا۔ یہ بنیادی مسئلہ صرف فلسفیانہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ ہر افسانہ نگار جو انسانی کردار کے ذریعہ سے زندگی کے بھیدوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ہے لازمی طور پر حقیقت کا اندازہ لگانے اور اُس سے اپنے افسانوں میں کام لینے یا نہ لینے پر مجبور ہوتا ہے۔

جو افسانہ نگار حقیقت کو نہ سمجھے گا وہ یا تو اپنے لئے ایک ایسی خیالی دنیا بنائے گا جس میں مسائل حیات کو ذہن اور وجدان کی مدد سے حل کیا جائیگا۔ یا تحت شعور اور لاشعور کی الجھنوں میں مبتلا ہو کر افسانہ نگار اپنی زیادہ قوت

غیر ضروری مباحث پر صرف کر دے گا۔ اُردو افسانوں میں اصلاح پسندی اور رومانیت کا دَور بھی اہم تھا اور حقیقت کے عکس پیش کرتا تھا لیکن دونوں حالتوں میں حقیقت کے ہمہ گیر تصوّر کو سامنے نہیں رکھا گیا تھا۔ تاریخ ارتقا کے ایک خاص موڑ پر، حیاتِ اجتماعی کے ایک خاص دَور میں اِصلاح پسندی اور صالح رومانیت کے ذریعہ سے پیش کی ہوئی حقیقت بھی ضروری تھی لیکن جب حالات بدل گئے ہوں اور زندگی کے تقاضے ہر شعبۂ حیات میں انقلاب کا مطالبہ کرتے ہوں اُس وقت حقیقت کی وہ صورتیں ناقص ہو جائیں گی۔ آج دنیا جس کرب اور بے چینی میں مبتلا ہے، اِنفرادی اور اجتماعی مسائل جس طرح اُلجھ گئے ہیں، علوم وفنون کی ترقی کے باوجود جس طرح انسانوں کی خود غرضیاں انہیں ایک دوسرے پر جھپٹنے اور لہو پینے پر آمادہ کر رہی ہیں، فراوانی کے ہوتے ہوئے بھوک، زندگی کی خواہش رکھتے ہوئے موت اور امن کا مطالبہ کرتے ہوئے جنگ کا سامنا ہوتا ہے، ایسی حالت میں حقیقت کا مرکز بدل جاتا ہے اور اگر افسانہ نگار حقیقت کا کوئی جامد یا مطلق تصوّر رکھتا ہے تو وہ سچائی کی تلاش میں عبث سرگرداں ہوگا۔ متحرک زندگی میں حقیقت متحرک ہے، اُسے ہمیشہ انسانوں کی مادّی ضروریات کے پورا کرنے اور رُوحانی آسودگی کے حاصل کرنے کی جد و جہد کے ساتھ دیکھنا چاہیئے۔

ہمارے افسانہ نویس کبھی کبھی تو اس پیچیدگی کو سمجھنے کی زحمت سے بچنے کے لئے اُن سطحی خیالات اور جذبات کی ترجمانی کرنے لگتے ہیں جن کی عظمت یا اہمیت مشتبہ ہے اور کبھی کبھی حقیقت کو محض انسانوں کی داخلی زندگی میں تلاش کرتے ہیں اور بہت جلد تحتِ شعور اور لاشعور کی دھندلی یا تاریک وادی میں کھو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے خیال میں شعور بہت کم اور لاشعور بہت زیادہ انسانی زندگی کو ترتیب دیتا ہے، یہ لاشعور اُس جنسی زندگی کے مجموعی اثر سے ایک سویا ہوا

آتش فشاں پہاڑ ہے جسے اخلاق، سماج اور خاندان کے محتسب نے کھلے بندوں پُورے ہونے کا موقعہ نہ دیا۔ لاشعور ہمیشہ گھات میں لگا رہتا ہے اور جیسے ہی محتسب کو غافل پاتا ہے تو بھیس بدل کر انسانی حرکات وسکنات کو اپنے قابو میں کر لیتا ہے اور شعور کا بس نہیں چلتا۔ تجزیہ نفس میں یہ بحثیں بہت تفصیل سے آتی ہیں جن کے دُہرانے کی ضرورت نہیں لیکن ایک بات ضرور سمجھ لینے کی ہے کہ ایسے لوگ جو لاشعور کو شعور کے مقابلے میں زیادہ اہم اور طاقت ور سمجھتے ہیں۔ وہ مادّی اور خارجی حالات کو بہت کچھ نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اُن کے خیال میں اگر خارجی حالات کچھ تغیّر پیدا بھی کرتے ہیں تو شعور ہی پر، لاشعور اُن کی دسترس سے باہر ہوتا ہے حالانکہ غور طلب یہ امر ہے کہ اگر خارجی حالات، جن کے مظہر تہذیب، اخلاق اور سماج ہیں، لاشعور پر اثر انداز نہیں ہوتے تو وہ دبا کیوں پڑا رہتا ہے، بھیس کیوں بدلتا ہے، خارجی حالات سے بالکل بے نیاز کیوں نہیں ہوتا؟ اگر کوئی یہ کہے کہ ان سے اثر لیتا ہے تو پھر لاشعور کا تجزیہ بھی اُن خارجی طاقتوں کی روشنی میں ہونا چاہیئے جنھوں نے انسانوں کے بعض جذبات کو ناآسودہ رکھ کر لاشعور کے اندھیرے میں دھکیل دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے جذبات اور خیالات خارج سے بے نیاز نہیں ہوسکتے اور ایک ایسی حقیقت نِگاری جسے خالِص داخلی کہہ سکیں واقعیّت کے نقوش نہیں اُبھار سکتی۔ اِنسان کی جنسی زندگی بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ نہیں ہے، خود فرائڈ کے قلعہ میں پھُوٹ پڑ چکی ہے اور انسانی افعال کے محرکات میں تنہا جنسی جذبہ کی کارفرمائی نہیں معلوم ہوتی۔ اِس لئے وہ لوگ بھی جو صرف جنس کے متعلق لکھنے کو حقیقت نگاری سے تعبیر کرتے ہیں پُورے رُخ کو نہیں دیکھتے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ حقیقت کے اور پہلوؤں کو نظر انداز کر کے

حکیمانہ حقیقت نگاری سے دور ہٹنا چاہتے ہیں۔ حکیمانہ حقیقت نگاری جسے سماجی حقیقت نگاری بھی کہہ سکتے ہیں زندگی کو ہر پہلو سے دیکھتی ہے اور اُلجھے ہوئے جذبات اور خیالات کی اُن مادّی بنیادوں کو ڈھونڈھ نکالتی ہے جنہیں عمل کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے

افسانہ میں جذبات نگاری کرنا، کردار کے خیالات کی رَد کا اندازہ لگانا اور انفرادی یا اجتماعی زندگی سے پیدا ہونے والی خواہشوں اور امنگوں کی اساسی شکلوں سے واقف ہونا ضروری ہے اس لئے یہ بات ہر افسانہ نگار کے لئے ضروری ہو جاتی ہے کہ وہ شعور اور لاشعور کے تعلق کو، محسوسات اور خیالات کی پیدائش کو، خیال پر مادّی زندگی کے اثر اور پھر مادّی زندگی پر خیال کے اثر کو سمجھے ورنہ یا تو اُس کی خیال آرائی ہوائی قلعہ بنانے لگے گی یا وہ لاشعور کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کرنے لگے گا جس کے اصل محرکات کو وہ انسانوں کی ابتدائی زندگی، پیدائش سے قبل کی زندگی، قبائلی زندگی کے فطری ارتقاء میں ڈھونڈھنے لگے گا۔ اور اس کا تعلق صحت سے زیادہ بیماری سے، اُجالے سے زیادہ اندھیرے سے اور واقعیت سے زیادہ خیال آرائی سے ہو جائے گا۔ اپنی جگہ پر یہ چیز کتنی ہی کامیاب ہو انسانی جد و جہد کی زندگی میں اُس کی قدر و قیمت ہمیشہ مشتبہ رہے گی۔ حقیقت سے فرار یا تو خود فریبی ہے یا لاعلمی، اور دونوں حالتیں ایسی ہیں جن سے بچنا ضروری ہے۔

حقیقت کا نیا مفہوم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ افسانہ نگار جن گتھیوں کو اپنے افسانوں میں اصل حقیقت کے طور پر پیش کرتا ہے اُن سے پیدا ہونیوالی نئی حقیقتوں کا تصور بھی کرے، جو منطقی نتائج نکلتے ہوں اُن سے آنکھ نہ چرائے۔ زندگی کے اہم ترین مسائل کی مصوّری صرف ایک مشاہدہ کے شیدائی کی طرح

نہ کر دے بلکہ ایک انسان اور ذمہ دار انسان کی حیثیت سے ان مسائل سے متعلق یہ بھی طے کرے کہ ان کا حل کیا ہے، اندھیرا اُجالے سے کس طرح دست و گریبان ہے، سچائی میں جھوٹ کی آمیزش کس طرح ہو گئی ہے۔ اُجالے اور سچائی کو کس طرح اندھیرے اور جھوٹ سے الگ کیا جائے۔

انسانی کردار کا مصوّر اگر کچھ نہ ہو تو اُسے انسانیت پرست اور انسان دوست تو ہونا ہی چاہیئے، لطیف جذبات اور نازک احساسات کا یہ نقّاش جسے افسانہ نگار کہا جاتا ہے، ظلم، جبر، ناانصافی، جہالت، بربریت، جنگ، لوٹ کھسوٹ، غلامی اور بیماری کو کیوں کر برداشت کر سکتا ہے، اگر وہ بیمار نہیں ہے تو صحت مندی کو زیادہ پسند کرے گا اور اُس بوڑھے کبڑے کی طرح صرف مارے حسد کے تمام انسانوں کو کبڑا دیکھنا پسند نہ کرے گا۔ جس کا ذکر کہانیوں میں پایا جاتا ہے، وہ صفات جن سے انسان انسان بنتا ہے۔ اُسے عزیز ہوں گی اور وہ انہیں عام ہوتا دیکھنا چاہے گا۔

اِس طرح حقیقت افسانے کی رُوح میں گُھتی ہوئی ہے بشرطیکہ افسانہ نگار محض داستان گو بن کر نہ رہ جانا چاہتا ہو بلکہ " انسانی روح کا انجنیئر ہونے کی حیثیت سے اُسے اپنی بصیرت کے اظہار میں کوتاہی کا مجرم نہ ہونا چاہیئے۔ معمولی آدمی بڑا شاعر اور بڑا افسانہ نگار نہیں بن سکتا۔ یہاں معمولی انسان کہہ کر کسی قسم کا طبقاتی زینہ بنانا مقصود نہیں ہے بلکہ اُس سے ہر وہ شخص مراد ہے جس کی بصیرت معمولی ہے اور جس میں ذمہ دارانہ طور پر انسانی مسائل کو سمجھنے اور سلجھانے کا شعور نہیں ہے۔ نظامِ زندگی کو پوری طرح سمجھنا، اُس میں اچھے بُرے کی تمیز کرنا، فرد اور جماعت کے تعلق کو سمجھنا، ان تعلقات کی وجہ سے پیدا ہونے والے تہذیبی ڈھانچہ کو سمجھنا اور پھر ان سب کو زمان و مکان کی وسعت

میں متحرک دیکھنا ــــ یہی چیزیں انسانی کردار، اُس کی اُمنگوں اور تمناؤں، اُس کی فتح اور شکست، اُس کی ترقی اور پسپائی کی صحیح تصویریں کھینچنے میں افسانہ نگار کی مدد کرسکیں گی اور وہ خود اعتمادی کے ساتھ معمولی معمولی واقعات میں زندگی کی پوری مشین کی حرکت دکھا سکے گا۔ افسانہ میں اس مکمل حکیمانہ حقیقت کی آمیزش افسانے کو کسی طرح کا نقصان پہنچائے بغیر اُسے زندگی کے قریب کردے گی۔ اور انسانوں کو بہتر زندگی بنانے کے لئے اُکسائے گی۔ اُس وقت ادب کا فرض بھی پُورا ہوگا اور ادیب کا بھی۔



عمل چغتائی

عبدالرحمٰن چغتائی (آرٹسٹ)

جدید ہندوستانی مصوّری

جنگِ عظیم کے فوراً بعد ہمارے آرٹ میں ایک غیر معمولی تبدیلی اور ایک اجنبی سی سرگرمی پیدا ہوئی جو نتائج کے اعتبار سے ملک کی بہت سی الجھنوں کو سلجھانے کے کام آئی مگر اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ وہ تبدیلی اور سرگرمی جسے ہم کسی بڑی تحریک اور کسی بڑے انقلاب سے تعبیر کرتے ہیں حقیقت میں ایک ردِ عمل کی نشو ونما تھی۔ زاویے نئے ہوں یا قدیم ذہنی نشو ونما کے تغیر کا باعث ہوتے ہیں اور تغیر ہمیشہ افراد کی قلبی واردات کا عکس ہوتا ہے۔ انسانی فطرت نت نئے مشاغل سے بہلتی ہے اور ایسے مشاغل تلاش کر لیتی ہے جو عقل و فکر سے دور اخلاقی برتری کا مطالبہ کرتے ہیں —— ہماری اکثر تحریکیں ہماری حالت لاعلمی اور کم نگاہی کی پیداوار ہیں اور یہی ایک سبب ہے، کہ ان میں پختگی تو در کنار اٹھان اور امنگ بھی ظاہر ہونے نہیں پاتی جب اُن کی موت واقع ہو جاتی ہے جیسا کہ ہماری اکثر انجمنیں اور ادارے —— جو پروان چڑھنے سے پہلے ختم ہو جاتے ہیں۔

جنگِ عظیم سے پہلے ہندوستان میں آرٹ کے تین اسکول تھے، کلکتہ، بمبئی اور لاہور

یہ تینوں اسکول اپنی اپنی نمائندگی کے لحاظ سے ہندوستان کے سرتاج کہلاتے تھے جنگِ عظیم کے بعد جو انقلاب آیا تو سرجے۔ جے اسکول بمبئی اسکول بن کر رہ گیا۔ کلکتہ آرٹ اسکول بنگال اسکول کہلایا۔ اور میو اسکول آف آرٹ پنجاب اسکول۔ یہ تینوں اسکول اپنی اپنی بساط کے مطابق صوبجاتی فرائض ادا کرنے لگے اور اپنی قدامت پسندی کے علی الرغم یہ دعوے پیش کرنے لگے کہ یہ جدید اسکول نئے زاویوں کے حامی ہیں اور ملک کے آرٹ کا مستقبل انہی کے وجود سے صورت پذیر ہو سکے گا —— جدید بمبئی اسکول کا دعویٰ تھا کہ وہ مغربی آرٹ کی ترجمانی کریگا جس کا انداز ہمارے موجودہ انتشار کا حل ہے —— ادھر بنگال اسکول کا جہاد بنیادی طور پر بمبئی اسکول کے خلاف تھا۔ اس کے آرٹسٹ اور بانی چاہتے تھے کہ اسے قومی رنگ دے کر ہندوستان کی ساری فضا پر پورا پورا تسلط حاصل کرلیں۔ ان کے پاس ذہانت اور پبلسٹی کے وسائل زیادہ تھے جن کی بنا پر انہیں اپنی کامیابی پر پورا اعتماد تھا۔ ان دنوں پنجاب اسکول نہ ہونے کے برابر تھا اور اگر کچھ تھا بھی تو اس کی کوئی آواز نہ تھی۔ لے دے کر بنگال اسکول ہی ایک ایسا ادارہ تھا جس کی آواز بلند تھی جس کا عزم مقابلتاً دوسرے اسکولوں کے روح پرور تھا اور وہ فن جو اس نے تخلیق کیا اپنے وقت کا بہترین فن تھا —— ایک طبقہ اس سے جی بھر کر متاثر ہوا اس نے روایتی شیرازہ بندی کی لیکن اسکی کامیابی کے باوجود اس کے پیشِ نظر یہ بات تھی کہ بنگال اسکول کی تحریک صوبجاتی ہے جو جدید نظریوں سے مختلف آتنی مذہبی اور روائتی تحریک ہے کہ اس کے متعلق ملک کے آرٹ کی ترجمانی کر سکنے کا اعتماد پیدا نہیں ہو سکتا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ہماری قومی اور معاشرتی زندگی کو وسیع پیمانہ پر ناپ بھی سکے گی! چنانچہ اس کی مقبولیت میں اس وقت تک فرق نہ آیا جب تک اس کے اندر آرٹسٹوں کی کمی نہ ہو گئی اور اپنی تحریک سے اس کے بانیوں کی ہمدردی نہ اُٹھ گئی۔ کیونکہ آرٹ ہمیشہ سے افراد کی خصوصیات اور اس کے تفکّر کا نتیجہ رہا ہے۔ بنگال کی اس قومی تحریک اور روائتی شیرازہ بندی سے جو سب سے بڑا نقصان پہنچا

وہ افراد کے تجربات اور اس کی بدحواسی تھی۔ حالات کے مطابق پنجاب کے آرٹسٹوں نے
بھی نئے زاویے تخلیق کرنے میں سرگرم حصّہ لیا۔ صوبجاتی بُت توڑنے کی انتہائی کوشش کی
اور ان کی ہر کوشش ان کے وسائل کے مطابق نہایت سلامتی کیساتھ بار آور ہوئی۔
نئے زاویوں کا مقصد قوم کے رجحانات ہی کو بدلنا نہیں ہوتا بلکہ روحانی اور قلبی کیفیت کا
تدارک کرنا بھی ہوتا ہے اور اس کے اندر ایسے جراثیم پھیلانا اور بھی ضروری ہوتا ہے۔ جو ہر
بغاوت کے اثرات کو قبول کر سکیں اور فطرت کی ابدی قوتوں سے زندگی کی تعمیرِ نو کو استوار
کر سکیں پھر ایسے باکمال آرٹسٹ چاہئیں جو نوعیت کے اعتبار سے اُوریجنل ہوں اور سخت
سے سخت تنقید کو برداشت کر سکیں۔ نئے زاویوں کا ہونا ہر دَور میں ضروری ہے اور نئے
زاویے ہر دور میں کسی نہ کسی صورت میں نمایاں ہوتے ہی رہے ہیں۔ مگر وہ تحریکیں جنہیں صحیح
مضموں میں "نئے زاویے" کہا جا سکتا ہے ہمارے ملک کو بہت کم دیکھنی نصیب ہوتی ہیں۔ اور
اگر کسی نے کبھی اس اہم کمی کا احساس کیا بھی ہے تو اس کی شنوائی نہ ہو سکی اور دبتے دبتے
آرزوں اور تحریکوں کی شکل وصورت ہی بدل گئی۔ پھر نہ آرٹسٹ کا مقصد پورا ہوا نہ کسی اہلِ
دل نے جی بھر کر ان تحریکات سے استفادہ حاصل کیا جن کا ابھرنا فطرت کے عین مطابق تھا۔
آرٹ کی موجودہ تکنیک سائنس اور جدید نظریوں کی تخلیق ہے۔ اس نے محض آرٹ
ہی کی نوعیت نہیں بدل ڈالی بلکہ تصورات اور افکار کی راہیں بھی بدل ڈالی ہیں۔ اس کا
لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہم نئی راہوں پر چلیں۔ نئے سے نئے زاویوں پر نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ
زندگی کے تیز دھارے اور تصورات کی طغیانی میں تغیر، بغاوت، انقلاب اور جدت پسندی
کا کیا درجہ ہے —— آرٹ میں ہمارے ہاں تنقید کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے اور جو ہے
بھی وہ بالکل سطحی ہے۔ نقاد اس کی نشوونما اور جمالی حسیات کو پورے طور پر اجاگر نہیں کر
سکتا —— وہ فن اور تکنیک سے بالکل ناواقف، بدیشی نظریوں سے متاثر آرٹ کو ان
زاویوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ جن کا تجربہ نہ خود اس نے اور نہ اس کے فنکاروں نے کیا

ہے۔ سوائے ایک فیشن ایبل شغف کے ـــــ آرٹسٹ اور نقاد کا مسلک محض مذہب اور معاشرت ہی نہیں کیونکہ صحیح قسم کا آرٹ ان تمام پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے ہاں آرٹ کی قدر و منزلت ایسے ہاتھوں میں ہے جو تصویر کی قدر و قیمت رنگ اور کاغذ کے وزن سے ناپتے ہیں اور پوچھتے ہیں کتنے وقت میں بنی ہوگی یہ سونے اور چاندی سے بھی مہنگی تصویر ـــــ وہ تصویر، وہ آرٹ جو روح کو وجد میں لاتا ہے ہمارے اخلاق کی نمائندگی کرتا ہے اور وہ آرٹ جو ہماری زندگی کی دل بستگیوں کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے اور بحیثیت جماعت اور انسانیت کے ہم اس پر فخر کرتے ہیں۔

بنگال میں بالعموم ہر تحریک کی پرستش صوبجاتی اصولوں پر کی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جس آرٹ نے بھی وہاں پرورش پائی وہ ایک دفعہ پروان چڑھا اور چڑھ کر مست رفتار ہو گیا۔ ڈاکٹر ٹیگور کو جب نوبل پرائز ملا تو وہاں کی تحریکات میں اور بھی اضافہ ہوا۔ شاعر اور آرٹسٹ جوق جوق ان تحریکوں میں شامل ہونے لگے پبلسٹی کے وسائل عام تھے لیکن مذہبی اور صوبجاتی تعصب نے بیسویں صدی کے ہندوستانی آرٹسٹوں کو پھلنے پھولنے نہ دیا اور وہ وقت سے پہلے ہی اپنے ماحول کی نظروں سے گر گئے۔ پھر بھی اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جدید بنگال اسکول کے بانی ابندر و ناتھ ٹیگور نے ہندوستانی آرٹ اور جدید آرٹ کی وہ شاندار خدمت انجام دی ہے جس سے کوئی صاحب نظر چشم پوشی نہیں کر سکتا۔

یورپ میں نئے زاویوں اور نئے آرٹ کی ابتدا صحیح معنوں میں جنگِ عظیم سے بہت پہلے عملی صورت اختیار کر چکی تھی۔ وہ آرٹسٹ جو نئے زاویوں کے حامی تھے وہ جنہوں نے آرٹ کا جمود توڑا تھا ہر جدت سے ہر فرسودگی کا قلع قمع کرنے کا تہیہ کیا تھا اور اپنے ماحول کے خلاف زبردست بغاوت کی تھی۔ انہوں نے رفائیل سے لیکر ریمبارنٹ تک کو اپنے بھنور میں لے لیا۔ ان کا اور ان کے آرٹ کا مقصد چاہے ریمبارنٹ۔ ڈیورر، روبنز، ٹیشین اور ال گریکو سے بلند نہ ہو۔ مگر ہر جدید آرٹسٹ جو اس منزل پہ کمر بستہ کھڑا تھا اور

جینیئلٹی جدت پسندی اور ایک پیش رو کا سا اعتماد اور عزم رکھتا تھا۔ ان آرٹسٹوں میں سیزآں۔ پول گوگیس۔ ہنری مٹشے۔ مڈ گلینی۔ سورت ے۔ مونے۔ رئے نائے اور فین گوگ ایسے آرٹسٹ تھے۔ جو روایتی فن کے سخت دشمن تھے۔ ان کے آرٹ میں کوئی مذہبی جذبہ نہ تھا بلکہ اس کے برعکس وہ مذہبی تصویروں پر جو قدیم آرٹسٹوں نے بڑے احترام سے بنائی تھیں طنز کرتے تھے۔ یہاں تک کہ گوگیس نے جرأت سے کام لیکر ایک نیگرو کو مسیح سے تشبیہہ دی اور اپنی شبیہ کو ان استعاروں کا مرکز بنایا جو مسیح کی مقدس شبیہ کے نشان تھے ــــ جب ہم جدید مغربی آرٹ کا مقابلہ اپنے جدید آرٹ سے کرتے ہیں تو ہمارا جدید ہندوستانی آرٹ جس میں بنگال۔ پنجاب اور بمبئی اسکول شامل ہیں۔ نہ تو فن برائے فن نظر آتا ہے اور نہ فن برائے زندگی۔

یورپ کے جدید آرٹسٹوں سے مراد ان آرٹسٹوں سے ہے جنہوں نے اپنی تحریک کو تعمیرِ نو اور حیاتِ تازہ بخشی ہے ــــ سیزآن۔ سورت ے اور فاین گوگ غالباً ایسے آرٹسٹ تھے جن کی بغاوت قابلِ تعریف ہے۔ سیزآن اپنے وقت کا پیغمبر آرٹسٹ تھا اس نے فنی خوبیوں کو جسامت دی اور آرٹ کے اندر وقت اور وقفے کا زبردست تفاوت پیدا کیا ہے یہ جدید آرٹ کے لئے ایسا بنیادی پتھر تھا۔ جس پر آنے والے ہر آرٹسٹ نے اپنی بساط اور نظر کے مطابق عمارت اٹھائی۔ سیزآں خود اپنے مدعا کی تکمیل کے لئے ۱۸۳۹ء سے لیکر ۱۹۰۶ء تک جدید آرٹ کی تاریخ بنانے کی جد و جہد کرتا رہا ــــ

ایک خالق فن کار ہمیشہ اپنے لئے نئی راہیں نکالنے اور اپنے زاویے تخلیق کرنے پر قادر ہوتا ہے اور خود ہی اپنی تخلیق میں نئی زندگی بھرنے کا موجب بنتا ہے۔ اگر ایک مغربی مصور کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مسیح اور مریم کی تصویریں بنا کر زندہ رہ سکے تو ایک ہندوستانی آرٹسٹ کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ بدھ۔ رام۔ رادھا اور کرشنا کی تصویریں بنا کر زندہ رہے لیکن ہمارے آرٹسٹ روایات میں اس قدر الجھ جاتے ہیں کہ ان کی خامیاں شعوری اور ذہنی نشوونما کے

علاوہ معاشرتی تغیرات کی راہ میں بھی حائل ہوتی ہیں اور ان کی انفرادیت سکڑتے سکڑتے اتنی محدود ہو جاتی ہے کہ وہ خود فرسودگی کا شکار ہو جاتے ہیں —— حقیقی طور پر ہماری معاشرتی نشو و نما کا کوئی پرتو ہمارے آرٹ پر نہیں اور نہ ہم میں کوئی ایسی اہم تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ جو ہمیں مغربی تحریک کے مانند جھنجوڑتی اور اپنے اجنبی ہونے کا یقین دلاتی۔ حالانکہ ہمیں بھی اپنی رسمی روایات کو چھوڑ کر اپنے قدیم آرٹ کے زیر اثر ایک دنیا پیدا کرنی ہے۔ ایسی دنیا جس میں مُغل اور اجنٹا الگ الگ نظر آئیں ! ——

جدید ہندوستانی آرٹ اور اس قدیم آرٹ میں جس پر ہمارا تمدن اور تہذیب نازاں ہے۔ کوئی ایسا نمایاں فرق نہیں کہ ہم بھی مغرب کی طرح اپنے باغی اور ترقی پسند ہونے کا دعویٰ پیش کر سکیں یا اپنی کمزوریوں کو اس طور پر چھپا سکیں، کہ ہمارے فطرتاً روایاتی یا مذہبی نہ ہونے کا دعویٰ برملا کیا جا سکے ! —— ہم پہ ہماری سیاسیات اور طرزِ حکومت کا ایک بوجھ ہے اور کوئی امکان پیش نظر نہیں کہ ایک ہندوستانی آرٹسٹ انفرادی طور پر وہ فروغ حاصل کر سکے جیسا ایک آزاد قوم کا آرٹسٹ بغیر کسی قدیم یا جدید آویزش کے اپنے عقائد کی بنا پر اپنی جگہ آپ بناتا ہے غور سے دیکھا جائے تو یوں معلوم دیتا ہے جیسے ہمارے جدید آرٹسٹوں کے سامنے نہ کوئی ابتدا تھی اور نہ انتہا —— مغربی اثرات نے ہمیں ترقی کی طرف جانے سے روکا نہیں لیکن ہمارے راستہ میں ایسے وسائل ضرور لا کھڑے کئے ہیں جن سے ہماری ترقی ان کی ترقی بن کر رہ گئی ہے۔ اور ہم میں سے کوئی آرٹسٹ انفرادی طور پر اس طرح جھنجھلا نہیں سکا کہ ماحول کا ماحول ہی بدل جاتا۔ ہم نئے عقائد اور نئے آرٹ کی تخلیق میں لگ جاتے اور اتنے بے نیاز ہو جاتے کہ اجنٹا میں بدھ کو جو فوقیت حاصل ہے وہ اسے آج عقاید کی بنا پر حاصل نہ ہوتی ——

ہمارے جدید آرٹ کا اگر جائزہ لیا جائے تو ہمارے ہاں ننانوے فیصدی ایسی مذہبی تصویریں ملتی ہیں جن کی ترجمانی آج سے صدیوں پہلے رنگوں، خطوں اور جذبات میں کی جا چکی ہے۔ اور بدقسمتی سے ان مذہبی تصویروں کے ساتھ تاریخی کرداروں کو بھی مذہبی پیشواؤں کا سا

رنگ دے کر برباد کر دیا گیا ہے ـــــ اگر آج کا آرٹ برائے حیات ہے اور حیات سے آرٹ کا کچھ واسطہ ہے تو کسی آرٹسٹ نے توجہ نہیں دی کہ وہ فراغت سے معاشرتی زندگی کا صحیح خاکہ تیار کرتا اور محسوس کرتا کہ زندگی ہے تو اس کا معیار کیا ہے۔ ہم میں زندہ رہنے کی کہاں تک صلاحیت موجود ہے۔ اور ان امکانات کے انکشافات کی کتنی اشد ضرورت ہے جس میں بحیثیت فرد اور بحیثیت جماعت ایک آرٹسٹ کا فرض ہے کہ وہ سوسائٹی کی ان چیرہ دستیوں سے نجات دلائے جس سے فن موجودہ مصیبتوں کا ذمہ دار ٹھہرتا ہے ـــــ ٹیگور کو چھوڑ دیجئے اور نندلال بوس کو لے لیجئے جس نے اپنا مقام اپنی ذہانت اور قابلیت سے آپ بنایا۔ اور پوری تن دہی سے مرد زیرک ہونے کا اعتراف کرایا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ بھی اپنے ہمعصروں کی طرح اتنا مذہبی واقع ہوا ہے کہ جو نظریہ ٹیگور ساتھ لایا تھا وہ اسے بغل میں دبائے ہوئے اجنتا کے غاروں میں کھو گیا اور بدھ کے چرنوں پر سب کچھ ڈال کر یہ کہتا ہوا سنا گیا "میں تیرا ہوں اور تیرے ہی پرستاروں میں ہوں" ـــــ ٹیگور کے اکثر شاگردوں اور بنگال اسکول کے مبصروں کا مطمح نظر تھا کہ وہ بنگال کے اندر نئے غار نئے استھان بنا کر دم لیں گے۔ ایک ایسے پربت کے جو ان سے پہلے ہندوستان کی سرزمین پر کبھی نمودار نہ ہوا ہو ـــــ زندگی کے وسائل بہتر ہوتے ہی وہ سرکاری درسگاہوں میں جا چھپے' اور ان کی پناہ میں اتنا بھی نہ کہہ سکے کہ ان کے گرو نے ان کو کیا درس دیا تھا؟ ہاں بنگال اسکول کے بانی ٹیگور اور اس کی شخصیت مذہبی قیود سے اتنی آزاد ضرور ہے کہ اس کے متعلق وثوق کے ساتھ کہا جا سکے وہ بنگال کا ایک واحد آرٹسٹ ہے جو بیسویں صدی کا آرٹسٹ کہلانے کا حق رکھتا ہے۔

جوں جوں ہمارے ہاں تنقید کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ جدید اور قدیم کا جھگڑا ابھی کم ہوتا جا رہا ہے اور فن سوسائٹی اور معاشرتی عقاید کا حل تنہا چلا جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے فن پھر ایک بار صحیح معنوں میں ابھرے اور زندگی کے اور زیادہ قریب ہو جائے ـــــ ہالدار۔ اکیل چودھری۔ اللہ بخش۔ مالی۔ قادری جیسے آرٹسٹ جنہوں نے اپنی ذمہ داریوں کو ایک دوسرے

کے کندھوں پر ڈال رکھا ہے۔ اپنی نگرانی آپ کرنے لگیں اور وہ نشانات جو آہستہ آہستہ ہمارے فن کے کھوکھلا ہونے کی خبر دیتے ہیں۔ پھر حوصلہ افزا امکانات کا مجموعہ بن جائیں اور ہمارا فن بنیادی طور پر پھر ایک بار نیا جنم لے۔ اور ہم ان استعاروں اور مذہبی پیشواؤں کا سہارا تلاش نہ کریں۔ جن کے وجود سے آرٹسٹ اپنی حیات اور فن کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔

نئے زاویوں کے لیے نئی نگاہیں نئے لوگ نئے سکے۔ بے لاگ تنقیدیں باغی آرٹسٹ اور ایک ایسا جہاں بھی اور ایسی سرزمین بھی چاہیئے جس کا خمیر ہی نیا ہو ـــ مگر ہمارے ہاں مشاہدات کی بہت کمی ہے۔ ہماری انفرادی نشو و نما ہونے بھی نہیں پاتی کہ ہم ایک دوسرے کے اثرات تلے دب کر تصویریں نہیں بلکہ رنگدار کھلونے بنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ چلتے پھرتے لوگ یہ زندہ عورتیں، پھدکتے بچے عشق و محبت کی ٹمٹماتی ہوئی قندیلوں کے گرد لرزتے ہوتے سائے ہیں۔

بچہ روتا ہے تو روتا ہے مگر جب اسے کچھ کہنا ہوتا ہے تو اس کا رونا اس کے رونے میں معنی پیدا کر دیتا ہے۔ عورت ہنستی ہے تو ہنستی ہے، لیکن جب اسے اپنی ہنسی سے کوئی خاص مقصد ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ تو اس کی ہنسی دلوں پر بجلی گراتی ہے۔ اس کے جسم سے بہاریں، شعاعیں پھوٹ نکلتی ہیں اور یہی ایک ترجمان آرٹسٹ کا کمال ہے۔ کہ وہ اپنے اظہار خیال کے لیئے ایسے اسلوب اور ایسے زاویئے تلاش کرے کہ دیکھنے والوں کے دل و دماغ پر مجموعی حیثیت سے نفرت یا محبت کا اظہار پوری شدّت سے وارد ہو۔ اور اگر اس کے نتائج مرتب کئے جائیں تو وہی فن کا صحیح مفہوم ہو ـــ

ہر مرد زیرک کو مختلف پہلوؤں سے نئے نئے زاویوں سے مطالعہ کرنا اسلوب فن کا کرشمہ ہے چاہے اس کا فن سادہ ہو یا پیچیدہ۔ چاہے وہ ایک الجھن ہو یا سوال۔ ہمیں اپنے موجودہ آرٹسٹوں میں سے ٹیگور۔ بوس۔ روپ۔ امرتا۔ مزمدار کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ بجائے اس کے محض فیشن کے طور پر ہم سیزاں۔ گوگیس۔ میٹیسے۔ سورٹے اور پیکاسو کا نام لے لیکر

اپنی کم مائگی کا ثبوت بہم پہنچائیں اور کسی کو امپرشن اسٹ۔ پوسٹ امپرشن اسٹ۔ کیوب اسٹ اور الٹرا موڈرن کہیں۔ نئے زاویوں کا مفہوم انفرادی حیثیت رکھتا ہے اور ہر باکمال آرٹسٹ کا وصف اس کی شخصیت کا مظہر ہوتا ہے ـــــ زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ پھلے پھولے۔ آرٹ کا صرف ایک ہی مقصد ہے۔ کہ وہ پھلتی پھولتی زندگی کا مظہر ہے تاکہ وہ مچلتی رہے اور اپنی کیفیات کی ترجمانی کرتی رہے اور اس اجنبیت کو قبول کرے جس میں اس کی اپنی نجات ہے۔

ہندوستان کے آرٹ پر مختلف دور آتے رہے ہیں اور مختلف اسکول مختلف ناموں سے اور مختلف صورتوں میں بنتے سنورتے رہے ہیں جنہیں ہم آج بڑے فخر کے ساتھ اجنٹا۔ مغل راجستانی۔ دکھنی اسکول کہہ کر یاد کرتے ہیں اور یہی نام ہمارے آرٹ کا پس منظر اور ہماری قدیم روایات کا زندہ ثبوت ہیں ـــــ اگر آج ہم اپنے ان قدیم آرٹسٹوں کو دعوتِ عمل دیں۔ جو اجنٹا اور مغل اسکول کے بانی تھے تو ہمارا موجودہ آرٹ جو صدیوں بعد کی تخلیق ہے۔ اتنا اجنبی نہ ہوگا کہ وہ اس کے سامنے احترام سے جھک جائیں اور پہچان نہ سکیں کہ وہ ہندوستانی آرٹ کو کس منزل پر چھوڑ گئے تھے اور آج وہ کس انتہا پر پہنچا ہوا ہے ـــــ ہمارے نئے زاویوں کا مقصد اور ہمارا تصور زندگی ہر حالت میں مشرقی ہونا لازمی ہے۔ مگر کسی فرقہ وارانہ ذہنیت کی بنا پر نہیں انسانیت کی تکمیل کے لئے۔ آرٹ کی تسخیر کے لئے ـــــ ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے بھی اور بیسویں صدی میں بسنے کی حیثیت سے بھی، اگر میں جرأت سے کہوں کہ ایک بنگالی اور ایک پنجابی، دو ہی ایسے آرٹسٹ ہیں جنہوں نے جمود کے خلاف بغاوت اٹھائی اور اپنے صحیح مشرقی ہونے کا زبردست احساس دلایا۔ تو کوئی بڑی بات نہ ہوگی لیکن پھر بھی ہم اپنے آپ کو اتنا زیادہ اچھال نہیں سکے کہ مندروں اور مسجدوں کی جگہ آرٹ گیلریاں اور میوزیم نیا ہوتے اور آرٹ معہ اپنے اسلوب اور نگارش کے، اپنے وقار کا خود محافظ بن جاتا تاکہ آرٹ کا مفہوم مذہب سے جدا ہوتا ـــــ

دیوِندر ستیارتھی

گائے جا ہندوستان

ویری ناگ کے نیلگوں پانی میں تھکن سے چوُر، پاؤں ڈالے میں سوچ رہا تھا کہ میں نے اپنی عمر کا بہترین حصّہ خانہ بدوشی میں گزار دیا ایک طرف ذاتی پریشانیاں اور دوسری طرف لہولہان دُنیا کی لہولہان خبریں اور پھر یہ خیال کہ دیس میں ایک بھیانک قحط آنے والا ہے۔ پچّاس سے اُوپر زبانوں کے ڈھائی تین لاکھ لوک گیت، جو میری خانہ بدوشی کے ضامن ہیں، مجھے جھوٹی تسلیاں دینے سے قاصر تھے۔ اوپر شیش ناگ کی طرح پھن پھیلائے دیو ہیکل پہاڑ نیچے چھیلیو نکی سبک خرامیوں اور مغلئی فنِ تعمیر کے آخری نشانات پر نازاں ویری ناگ۔ ایک بار پھر یہ خیال آیا کہ میں فن کی تخلیق کے لئے پیدا ہُوا ہوں اور یقیناً قدیم روایتوں کے اشوک کی طرح جو اپنے تنے پر کسی گوری کے نازک پیروں کا لمس محسُوس کرتے ہی کھِل اُٹھتا تھا، جنتا کی شاعری اور قدرت کی سحر طرازیوں نے مجھے فنکار بنادیا ہے۔ لیکن قدرت میری حاسد بن گئی ہے۔ مجھے اُن لوگوں پر غصّہ آرہا تھا جو یہ سمجھتے تھے کہ ہر چشمہ پر کسی نہ کسی ناگ کا حکم چلتا ہے یہاں تک کہ اُس کے غصّے سے چشمہ ہمیشہ کیلئے خشک ہو سکتا ہے اور جو اندھی عقیدت سے مجبور ہو کر ناگ اور چشمہ کو

ہم معنی الفاظ سمجھنے لگ گئے تھے۔ یہ لوگ ساپنوں کی پوجا کر سکتے ہیں، ایک فنکار کی نہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ ہر سال ویری ناگ پر جہلم کا جنم دن منایا جاتا ہے ـــــ بھادوں کے اُجالے پاکھ کی تیرھویں کے روز، جب اس نیلگوں پانی میں نہانا ثواب سمجھا جاتا ہے۔ یہ لوگ چشموں کی پوجا کر سکتے ہیں، ایک فنکار کی نہیں ..... مجھے اُس گوری پر بھی غصّہ آنے لگا۔ جو ہر روز آدھی رات کو، جب بیلا کے پھول کھل جاتے ہیں، اپنا گجرا بنا لیتی تھی اور جواب تک یہ فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ اسے کس کے گلے میں پہنائے ـــــ "بیلا پھولے آدھی رات، گجرا میں کیکے گلے ڈالوں؟" .... مجھے اُس گوری پر بھی غصّہ آنے لگا جیسے ظالم والدین نے ایک جاہل کے گلے باندھ دیا تھا اور جس میں اب اتنی ہمت نہ تھی کہ اپنے لئے کوئی نئی راہ ڈھونڈ نکالے ـــــ "رتن کٹوری گھی جلے، چولہے جلے کسار، گھونگھٹ میں گوری جلے، جس کے مورکھ بھرتار!" اور پھر پُورب اور ہریانے سے ہٹ کر میرے ذہن کی سُوئی چھوٹا ناگپور کی طرف گھوم گئی۔ جہاں قدیم النسل اراؤں دوشیزہ اپنے سپنوں کے دوشے سے التجا کر رہی تھی ـــــ "کوڑے ڈنڈن پاڑا کو پاڑو، ٹیچ بالرائے راگے برنرا۔ پیری بیڑی پاڑا کو پاڑو، ٹیچ بالرائے راگے برنرا" ـــــ ارے او گیت گانے والے، کوئی بھلا سا نغمہ چھیڑ دے رے، مرے ہوؤں کی آتمائیں سننے آتی ہیں۔ کوئی اُشا کا نغمہ چھیڑ دے رے گیت گانے والے، مرے ہوؤں کی آتمائیں سننے آتی ہیں.......

مَیں سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی حقیقت یہی ہے ـــــ "بیلا پھولے آدھی رات"....... "گھونگھٹ میں گوری جلے"....... یا وہ اُشا کا نغمہ جسے مُردوں کی آتمائیں سننے آتی ہیں۔ شاعر بولا: "ٹھیک تو ہے۔ پہلے نغمہ پھر کچھ اور" پھر طنز نگار کی آواز آئی: "اصل حقیقت تو زندگی کے مسائل ہیں جن سے ڈر کر تم اتنی دور نکل آئے ہو۔" اور پھر دُور کہیں سے بُلبل کا نغمہ گونج اُٹھا، جیسے وہ کہہ رہی ہو ـــــ زندگی کے مسائل تو کبھی ختم نہیں ہوتے، باورے، تو کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ تم میرے نغمہ میں پناہ لے لو؟

سامنے بڑھ رہے تھے۔ سورج کی آخری کرنیں بھی غائب ہوگئیں۔ آزاد، کھلنڈری، نٹ کھٹ ہوا بھی سست ہوگئی۔ اب پانی میں پاؤں ڈال رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ میرے ذہن کے پاتال میں بھیل ناچ رہے تھے۔ ٹپ ٹپ، ٹھم ٹھم ٹھم۔ ایک ایک بھیل کے بعد ایک ایک بھیلنی، دائیں ہاتھ سے دائیں ساتھی کا بازو تھامے اور بائیں ہاتھ سے بائیں ساتھی کا۔ رنگ بھومی کے مرکز میں چومکھا دیا روشن تھا۔ شاعر کہہ رہا تھا: "یہ لوگ حقیقی فنکار ہیں۔ انہیں ملک گیری کی پروا ہے نہ تحریکِ آزادی کی فکر۔ ڈھولک کہتی ہے' یہ سب میرے تال کا تماشہ ہے' یہی حقیقت ہے۔ پازیبیں کہتی ہیں' یہ سب ہماری جھنکار کا نشہ ہے' یہی حقیقت ہے بھیل دُلہن کا نیم کا گیت کتنا معنی خیز ہے ——— کڑوا لیمبڑا فوں ایک ڈال میٹھوں رے، مارو دلھنی رنگیلو! ——— کڑوی نیم کی ایک شاخ میٹھی ہے رے' میرا دلھنی رنگیلا ہے ——— چند آنوں کے عوض دن بھر مٹی کھودتے کھودتے ان کے بیلچوں کے منہ ٹیڑھے ہو گئے۔ لیکن اس وقت وہ کڑوی نیم کی میٹھی شاخ کے نیچے اپنا آزاد ناچ ناچ رہے ہیں۔ نغمہ و رقص کے زیر و بم اُن کے لئے کافی ہیں۔" پھر طنز نگار کی آواز آئی: "بھیلوں کا ناچ محض فرار ہے۔ اُن کا تمدن اُن کے لئے افیون بن گیا ہے جو حقیقت میں زہر ہے لیکن نشیلا ہے۔" شاعر بولا: تم غلط کہتے ہو۔ زندگی کے پیڑ کی میٹھی شاخ کے نیچے فنکاروں کا فن قائم رہ سکتا ہے۔ یہ لوگ یقیناً اُن عامیوں پر خندہ زن ہونے کا حق رکھتے ہیں جو قانون بناتے ہیں' دفتر میں نوکری کرتے ہیں اور ناچ گھر میں دیر ہو جائے تو صبح کو اسپرین کی گولیاں کھائے بغیر سردرد سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔"

دودھیا سفید چاندنی کھل گئی تھی۔ فضا میں خوشبوئیں بسی ہوئی تھیں ——— خوشبوئیں اور سرگوشیاں' آنکھیں میچ کر میں نے نیم وا پلکوں میں سے ویری ناگ کی طرف دیکھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ چناب ہے اور کوئی سوہنی کچے گھڑے پر تیر رہی ہے۔ شاعر بولا: "سوہنی اب بھی زندہ ہے ——— سوہنی آپ ڈُبی جند تڑدی' وہ رچ جھناواں دے! ——— سوہنی خود ڈوب

گئی پر اُس کی روح برابر چناب کے پانیوں پر تیر رہی ہے۔" طنز نگار کہہ رہا تھا: "یہ پنجابی لوک گیت فضول ہے۔ کچے گھڑے پر تیرنے والی سوہنی بے وقوف تھی۔"

میری حالت اُس پجاری کی سی تھی جو اپنے من مندر میں ان گنت بُت رکھتا چلا گیا ہو اب اس مندر میں بھیل چھوکریاں ناچ رہی تھیں —— دیو داسیوں کی طرح:

"آنکھیا نی کاجل رلی رلی جائے،
کاپڑی نا پھُوندا نمی جائے،
ریسائی نہ جاجو، رے سوریو، گھومسی رے لول،
آوو آوو رے سوریو، گھومسی رے لول!"
—— آنکھ کا کاجل پھیل رہا ہے
انگئے کا پھُندنا جھک رہا ہے
روٹھ کر نہ چلی جا میری چھوکریو، ہم گھوم گھوم کر ناچیں گی
آؤ آؤ ری چھوکریو، ہم گھوم گھوم کر ناچیں گی۔

شاعر بولا "آنکھوں میں کاجل کی لکیریں پھیل جانے سے پیشتر ہی تو جھومر کا مزا ہے۔ وہ پورب کا نغمہ بھی تو سُنا ہو گا "کبھی آپ ہنسے کبھی نین ہنسیں، کبھی نین کے بیچ ہنسے کجرا۔"

پھر طنز نگار کی آواز آئی۔ "ہنستے ہوئے کاجل کی عمر کے گھڑی ہو گی؟" طنز نگار کہہ رہا تھا: "کاجل میں کیا دھرا ہے؟ گانا ہی ہو تو مزدوروں اور کسانوں کا بین الاقوامی گیت گاؤ —— اے دنیا کے مظلوم انسانوں، اُٹھو۔ اٹھو اے بھوکے محنت کشو۔ انصاف کا جوالا مکھی اُبل رہا ہے۔ اپنے ماضی کو بھلا دو، ساری دنیا کے غلامو، ایک ساتھ مل کر اُٹھو۔ دنیا نئی کروٹ لے رہی ہے۔ اب تک ہم کچھ بھی نہیں تھے۔ اب ہم ہی سب کچھ ہوں گے۔ یہ ہماری آخری جنگ ہے۔ آؤ ہم تم ایک ہو جائیں۔ دنیا کی تمام قومیں ایک ہو جائیں گی۔"

چاندنی رات کی ہر سلوٹ کہتی تھی چاند ہے تو ستارے ہیں۔ یہی حقیقت ہے۔ ستارے کہتے تھے، ہم شاعر پر بھی اُسی طرح چمکتے ہیں جیسے طنز نگار پر...... جنگ شدید سے شدید تر ہوتی جاتی تھی۔ بم باری۔ آگ ہی آگ، بھوک اور موت، زہریلی گیسیں، زخمیوں سے بھرے ہوئے ہسپتال کون جانے یہ جنگ کب ختم ہو، میں نے سوچا، جنگ سے پہلے اس دیس میں ایک بھیانک قحط آنے والا ہے۔ اُس وقت مجھے اُس امیر کا دھیان آیا جس کا عشق بھوک کے مارے ختم ہو رہا تھا ـــــ "بُھکھیا کے مارے برہا بسر یگا، بھول گئی کجری کبیر۔ دیکھی ک گوری ک موہنی سُورتی، اب اُٹھے نہ کریجوا ماں پیر!" ـــــ بھوک کے مارے برہا بسر گیا، کجری اور کبیر گیت بھی بھول گئے۔ گوری کی موہنی صورت دیکھ کر اب میرے کلیجے میں پیڑ نہیں ہوتی۔

اپنی اقتصادی حالت پر غور کرتے کرتے ایک بار پھر اپنے ماضی پر جھنجھلاہٹ سی ہوئی ناحق میں لوک گیتوں کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔ ناحق گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے ہی کو آدرش بنائے عمر برباد کرتا رہا۔ پھر میں نے یہ کہہ کر دل و دماغ کو تسلّی دی کہ عالمگیر مصیبتوں کے پیشِ نظر میری تکلیفوں کی کیا اہمیت ہے۔ شاعر بولا: "جہاں گردی سے بڑی کوئی تعلیم نہیں، فن کی پختگی کے لئے اِس سے بڑا کوئی معاون نہیں۔"

جُگنو اپنی آنکھ مچولیوں میں مگن تھے۔ پاس ہی ایک مغلئی جھروکے میں دیا روشن تھا۔ ویری ناگ کی چاندنی رات ایک نازک بدن حسینہ کی طرح نرم، گہرے سانس لے رہی تھی۔ اُس وقت میرے ذہن کی سُوئی بہار کے ترست ضلع کی طرح گھوم گئی۔ اور ایک کسان کی آواز آنے لگی:

"ہے بھولا بابا یہن کتے لون دین
کھیتی بیچاری، بھولا، سے ہو لیلا چھین
بھائی سہودر، سے ہو بھے گیل بھین
گھر میں نہ کھرچی، باہر نہ ملے رین
گاؤں کے مالک، نہ پڑے دئی اسے چین

ایکے گو لوٹا چھلنی بھائی بھیلئی تین
پنیا پو ہیت کال، ہوئی آچھنا چھین
ایکے گو بیل نچ گیل، مہاجن لیلک رین
کرکٹمب سب بھیلئی پرہین!"

—— ہے شِو بابا! تم نے میرے دن کتنے دکھ بھرے بنا ڈالے
تھوڑی بہت کھیتی تھی، وہ بھی تم نے چھین لی
سگے بھائی تھے، وہ الگ ہو گئے
گھر میں خرچ نہیں، باہر قرض نہیں ملتا۔
گاؤں کا زمیندار رات کو سونے نہیں دیتا
ایک لوٹا ہے اور ہم تین بھائی ہیں
پانی پیتے وقت چھینا جھپٹی ہونے لگتی ہے
ایک بیل بچ گیا تھا، اُسے مہاجن نے قرض کے بدلے لے لیا
کٹمب والے سب پرائے ہو گئے۔

شاعر بولا: "یہ تو وہی 'دو اور دو؟ —— چار روٹیاں!' والی شاعری ہے۔ کوئی نازک خیالی نہ ہو تو شاعری بیکار ہے۔" طنز نگار کہہ رہا تھا: "مجھے تو یہ گِلہ ہے کہ یہ لوگ قسمت کے غلام ہیں اقتصادیات کی باتوں میں بھی خدا کو لے بیٹھتے ہیں، اپنی غریبی کو دیوتاؤں سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب اس قدر جہالت ہے، یہاں انقلاب کیسے آسکتا ہے؟"

پھر کہیں سے بُندیلکھنڈ کی ایک پھاگ گُونج اُٹھی:

"گوا ہنوں ہتے سو ہو گئے
بھُس لے گئی اندورا
ٹوٹے میں ٹلوا گئے

باڑھی میں کھگبار ــــ
جری بانے میں لکھ لو دونی جوبنا!"
ـــــ گیہوں تھا وہ ختم ہوگیا
بھوسے کو جھکڑ اڑا لے گیا
گھاٹے میں بیل بک گئے
بنئے کا اناج لوٹانے میں میری ہنسلی چلی گئی
جرمانے میں میری دونوں چھاتیاں لکھ کر لے جاؤ!

طنز نگار نے شاعر سے پوچھا: اس لازوال تلخی اور طنز کے آگے بولنے کی جرأت ہے تم میں؟ یہ دبی ہوئی پسی ہوئی خفتا نہ جانے کبتک اپنی چھاتیاں پیش کرتی رہے گی!"

شاعر چپ تھا

یہ خواب تو نہ تھا معلوم ہوتا تھا دیری ناگ کے مغلئی کھنڈرات کے اس پار ـــ اُن اندھے، بہرے، گونگے کھنڈرات کے اُس پار، بنگال بسا ہوا تھا۔ کوئی دوشیزہ اپنے محبوب کو بلا رہی تھی:

"نشیتھے جائیو بھولو بنے، ہے بھرمرا!
نشیتھے جائیو بھولو بنے
جالائے چندر و باتی
جیگے روو دنشا راتی گو
کوئیلو کتھا شِشیر یدو شنے، ہے بھرمرا!
نشیتھے جائیو بھولو بنے
جودی واگھما ئے پوڑی
شپنیر و پنتھ دھوری گو

نیر پوچھنے جائیو ہے بھرمرا!
نشیتھے جائیو پھولو بنے
تو ہار گان جینو بھانگے نا
آمارہ گھوم جینو بھانگے نا
پھولیر گھوم جینو بھانگے نا
ڈالیر گھوم جینو بھانگے نا
نشیتھے جائیو پھولو بنے، ہے بھرمرا!
نشیتھے جائیو پھولو بنے"
——— آدھی رات کو پھولوں کے جنگل میں درشن دیجیو رے بھونرے!
آدھی رات کو پھولوں کے جنگل میں درشن دیجیو
چاند کا دیا جلا کر رے
رات بھر میں جاگتی رہونگی رے
اوس کی بوندوں سے باتیں کیئے جاؤنگی، رے بھونرے!
آدھی رات کو پھولوں کے جنگل میں درشن دیجیو
اگر میں سو بھی جاؤں
سپنوں کے راستے پر چل پڑوں گی رے
چُپ چُپ قدموں کے ساتھ درشن دیجیو۔
تمہارا گیت تھمنے نہ پائے
میری نیند ٹوٹنے نہ پائے
پھولوں کی نیند ٹوٹنے نہ پائے
ڈالیوں کی نیند ٹوٹنے نہ پائے

آدھی رات کو پھولوں کے جنگل میں درشن دیجیئو رے بھونرے!
آدھی رات کو پھولوں کے جنگل میں درشن دیجیئو

شاعر کہہ رہا تھا: "بھونرے کا گیت تھمے گا نہیں اور پھولوں کے جنگل کی نیند بھی نہیں ٹوٹے گی۔" طنز نگار بولا: "میاں نکلو اس بھول بھلیاں سے۔ زندگی کی بے پناہ الجھنوں سے یوں چھٹکارا نہیں ملنے کا۔ وہاں زمین سنگلاخ ہے نا! اور یہاں خمار آلود خواب میں پگڈنڈیوں پر ریشم بچھ جاتا ہے۔" شاعر کہہ اٹھا: "خدا کی قسم، بے تھوون اسے سن پاتا تو عش عش کر اٹھتا۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ بے تھوون کو اپنی مشہور سمفنی کی بنیادی لے ایک لوک گیت سے حاصل ہوئی تھی"...... لیکن میں نے طنز نگار کی بات پسند کی حقیقت پسندی کی سنگلاخ زمین مجھے بلا رہی تھی۔ شاعر نے گرم ہو کر کہا: "مجھے چھوڑ کر تم کہیں نہ جا سکو گے۔ اپنا وعدہ یاد کرو۔" طنز نگار بھی جھنجھلایا: "میں جانتا ہوں تم اس عادی قیدی کی طرح ہو جسے لاکھ کوئی جیل سے آزاد کرے مگر اس کے قدم گھوم پھر کر اسی جیل کے دروازے پر پہنچ جاتے ہیں۔

چاروں طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ سایوں کی اپنی حیثیت تھی —— کوئل کے انڈے پر بھونرے دھبوں کی طرح۔ معلوم ہوتا تھا رات لمبی ہوتی چلی جائے گی — شہزادی کی سو سالہ نیند کی طرح۔ شاعر کہہ رہا تھا: "بلبل کا نغمہ مجھے اتنا ہی پیارا ہے۔ جتنا ارنسٹ ٹالر کو وہ گھونسلا پیارا تھا جسے ایک ابابیل نے اس جیل کی کوٹھڑی میں بنایا تھا جہاں ٹالر پانچ برس تک قید رہا اور جس کی تصویر اس نے اپنی ایک مشہور نظم میں پیش کی ہے" طنز نگار بولا: "تم نے صرف ٹالر کا نام سن رکھا ہے۔ تم اس افیمی کی طرح ہو جسے نشہ چاہیئے چاہے وہ زہری کیوں نہ ہو۔ تم نے سمجھا ٹالر کی ابابیل والی نظم بھی افیم کی گولی ہوگی جسے تم ہتھیلی پر مل کر منہ میں ڈال لو گے اور ایک گھونٹ پانی کے ساتھ اسے نگل جاؤ گے۔ پھر ٹالر کا نام نہ لینا۔ ایک افیمی کیا جانے ٹالر کی قدر؟ ٹالر نے انقلاب کو زندہ زبان دی۔"

پھر راجپوتانہ کی آوازیں سنائی دینے لگیں کوئی گوری اپنے گھڑ سوار محبوب سے رُکنے کی التجا کر رہی تھی:

"ناگ جی، گھڑی دو ئے گھڑلا تھام رے
ویری گھونگٹ ری چھئیاں کروں، ناگ جی!
ناگ جی، تاوڑیو پاپی پڑے، ہاں رے
ویری، گھائل کر دی تاوڑے، او ناگ جی!
ناگ جی، من لوبھی من لالچی رے
ویری، من چنچل من چور، او ناگ جی!
ناگ جی، من رے مَتے انہ چالیئے رے
ویری پلک پلک من اور، او ناگ جی!
ناگ جی، تڑک تڑک مت توڑ رے
ویری کنواری رے تار جیوں ناگ جی!
ناگ جی، جیوں ٹوٹے تیوں جوڑ رے
ویری، پریت پُرانی نہ پڑے، ناگ جی!
ناگ جی کھایو کھجانے رومال رے
ویری، لُون حرامی ہو گیئو، ناگ جی!
—— ناگ جی، ایک بر گھوڑلو موڑ رے
ویری، من رُڑے ری واتاں مَیں کہوں، ناگ جی!
—— ناگ جی! دو گھڑی کے لئے گھوڑا تھام لو رے
ارے بَیری! آؤ تم پر گھونگھٹ کی چھاؤں کر دوں، ناگ جی!
ناگ جی! بھیانک دھوپ پڑ رہی ہے، ارے ہاں،

ارے بَیری! دُھوپ نے مجھے گھائل کر دیا، ناگ جی!
ناگ جی! من لوبھی ہے، من لالچی ہے رے
ارے بَیری! من چنچل ہے، من چور ہے، ناگ جی!
ناگ جی! من کے پیچھے مت چلو رے
ارے بَیری! ایک جھپکا تے ہی من اور کا اور ہو جاتا ہے، ناگ جی!
ناگ جی! پریت کو یوں اچانک مت توڑ ڈالو رے
ارے بَیری! جیسے چرخہ کاتنے والی سُوت کا تار توڑ ڈالتی ہے، ناگ جی!
ناگ جی! ٹوٹنے کے فوراً بعد اسے جوڑ دو رے
ارے بیری! پریت تو کبھی پُرانی نہیں ہو پاتی، ناگ جی!
ناگ جی! تم نے خزانے کا مال خوب کھایا ہے رے
ارے بیری! تم نمک حرام ہوتے جاتے ہو، ناگ جی!
ناگ جی! ایک بار گھوڑا موڑ لو رے
ارے بیری! مَیں من کی باتیں کر دُنگی، ناگ جی!

شاعر بولا: "مجھے اِس گیت کا وہ حصّہ سب سے زیادہ پسند ہے جہاں چرخہ کاتنے والی کے ہاتھ میں سوت کا تار ٹوٹنے اور جوڑنے سے عشق کو تشبیہہ دی گئی ہے۔ مَیں نے خود مارواڑنوں کی زبان سے بارہا یہ گیت سُنا ہے۔" طنز نگار کہہ اُٹھا: "اور سب سچ، لیکن مارواڑنوں کے گانے کی بات جھوٹ۔"

خیال آیا کہ اُٹھ کر ڈیرے کو چل دوں، شاعر اور طنز نگار دونوں سے چھٹی پا کر آرام سے سو جاؤں۔ لیکن اِسے چاندنی رات کی سحر طرازی سمجھئے کہ مَیں وہاں جم کر بیٹھا رہا۔ ہلکی ہلکی گدگدی کی طرح اِندور کا وہ لوک گیت میرے دل و دماغ کو سہلانے لگا جس میں ایک گوری اپنے بالم سے کہتی ہے۔ تم چل دو گے تو میں کھچڑی پکاؤں گی۔ بالم کہتا ہے تمہاری کھچڑی چکھ لُونگا اور

تمہاری کھیر کھا لوں گا، پر مجھے جانا ہے ضرور۔ گوری کہتی ہے تم چلے جاؤ گے تو سپید ساری پہنوں گی رہ جاؤ تو دُلھن کی ساری پہنوں گی۔ بالم جواب دیتا ہے۔ تمہاری سپید ساری کو دیکھ لونگا، تمہاری دُلھن کی ساری کا رس لے لونگا، پر مجھے جانا ہے ضرور۔ گوری کہتی ہے' تم چلے جاؤ گے تو کمبل بچھاؤنگی' رہ جاؤ تو پھولوں کی سیج بچھاؤنگی۔ بالم جواب دیتا ہے' تمہارے کمبل پر بیٹھ کر دیکھ لوں گا، تمہاری پھولوں کی سیج کا رس لے لوں گا، پر مجھے جانا ہے ضرور۔

شاعر کہہ رہا تھا: "محبت کبھی مرتی نہیں"۔ طنز نگار بولا: "جس سے آدمی جتنی محبت کرتا ہے۔ اُس سے اُتنی ہی نفرت بھی کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں' محبت سے کہیں زیادہ نفرت ہی کام کر رہی ہوتی ہے۔

سُوئی گھمائی جا چکی تھی۔ اب پنجاب سے آواز آ رہی تھی۔

پادے اکّ واری مرگو رہیئے، ملینوں رِجھ رنڈیاں دی آوے
جھاماں پیکے جا کے مرگو رہیئے، ھچھٹی لے کے مکانیں آواں
کھالسا پیکے جا کے مر جاواں گی، میری مڑھی تنے آدیں بھلیا مانسا!
تیلی ماپیاں دی دھی مرگئی، رُڑھ گئی چنن دی گیلی
ہوری سَوہریاں دی نُونہہ مرگئی، رُڑھ گئی دمّاں دی بوری
بونا اِکّ واری بول گوریئے، تیری مڑھی اُتّے آن کھلوتا
چھولے مڑھیاں چوں اُڈّ طوطیا کدی موئے مُردے نہیں بولے
مایا اِکّ واری جیوں گوریئے، رنڈا ہو کے بڑا دکھ پایا

———(کھاٹ کے پائے) ایک بار مر جاؤ، گوری، مجھے رنڈوں پر رشک آتا ہے

جھانواں، میکے میں جا کر مر جاؤ، گوری ہچٹی لیکر ماتم پُرسی کو آؤں گا
خالصہ، میکے میں جا کر مر جاؤنگی، میری سمادھ پر مت آنا، بھلے آدمی!
تیلی، ماں باپ کی بیٹی مرگئی، چندن کی شہتیری بہہ گئی

ہولی — ساس سسر کی بہو مر گئی، روپوں کی بوری بہہ گئی
جوان اُونٹ — ایک بار تو بولو، گوری میں تمہاری سمادھ پر کھڑا ہوں
چھنے — سمادھوں میں سے اُڑ جا، رے طوطے، مرے ہوئے لوگ کبھی نہیں بولتے
بابا — ایک بار تو بولو، گوری، رنڈوا ہو کر میں نے بہت دُکھ اُٹھایا ہے

طنز نگار بولا: "گوری نے ضرور خودکشی کی ہوگی۔ خالصہ بھی عجیب آدمی ہے۔ یقیناً وہ ذہنی خلا میں مبتلا ہے۔ وہ محبت کر سکتا ہے نہ نفرت۔"

اُس وقت ایک اور پنجابی لوک گیت گونج اُٹھا۔ شاعر اور طنز نگار دونوں ہمہ تن گوش ہو کر اِسے سُننے لگے:

پُوڑے نوں چت کرے تے آٹا گھولیا
آٹا گھولیا، جے پہلا پُوڑا پایا گوانڈھن چھڈ دی
گوانڈھن چھڈ دی، جے دُوجا پوڑا پایا تاں سستو جھاکدی
سستو جھاکدی، جے گوڈے بیٹھ لکوماں تاں گوڈا سڑ گیا
گوڈا سڑ گیا، جے پیڑھی بیٹھ لکوماں تاں پیڑھی سس دی
پیڑھی سس دی، جے منجے بیٹھ لکوماں تاں منجا جیٹھ دا
منجا جیٹھ دا، جے کوٹھی بیٹھ لکوماں تاں چوہے جھاکدے
چوہے جھاکدے، جے پوڑی لے کے چڑھی تے ٹمبا مڑ گیا
ٹمبا مڑ گیا، جے کوٹھے نے کے چڑھی تاں اِلّاں بھوندیاں
اِلّاں بھوندیاں، جے نے چبارے وڑی تاں ماہی آ گیا
ماہی آ گیا، ہتھ وچ اتیاں چھمکاں تے سانوں ماردا
سانوں ماردا، سستو دے من وچ چا کہ نونہہ نوں کُٹیا
نونہہ نوں کُٹیا، مر جاؤ پرائی دھی جائیں گا پٹیا!

——— پوڑا کھانے کو جی چاہتا ہے اور میں نے آٹا گھول لیا
آٹا گھول لیا، پہلا پوڑا توے پر ڈالتی ہوں تو پڑوسن پوچھ تاچھ کرتی ہے
پڑوسن پوچھ تاچھ کرتی ہے، دوسرا پوڑا توے پر ڈالتی ہوں تو ساس تاکنے لگتی ہے
ساس تاکنے لگتی ہے اِسے گھٹنے تلے چھپاتی ہوں تو گھٹنا جل گیا
گھٹنا جل گیا، پیڑھی کے نیچے چھپاتی ہوں تو پیڑھی ساس کی ہے
پیڑھی ساس کی ہے، کھاٹ کے نیچے چھپاتی ہوں تو کھاٹ جیٹھ کی ہے
کھاٹ جیٹھ کی ہے، بکھاری کے نیچے چھپاتی ہوں تو چوہے دیکھتے ہیں
چوہے دیکھتے ہیں، اسے لئے ہوئے میں زینے پر چڑھ گئی تو ڈنڈا اٹک گیا۔
ڈنڈا اٹک گیا، میں چھت پر چڑھ گئی تو چیلیں منڈلاتی ہیں
چیلیں منڈلاتی ہیں، میں چوبارے میں چلی گئی تو شوہر آگیا
شوہر آگیا، اُس کے ہاتھ میں تازی لچکیلی چھڑیاں ہیں اور وہ مجھے پیٹتا ہے
مجھے پیٹتا ہے، ساس کے من چاؤ ہے کہ بہو کو پیٹ ڈالا
بہو کو پیٹ ڈالا، ارے پرائی بیٹی مر جائے گی اور تو برباد ہو جائے گا

طنز نگار بولا: "میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آدمی جس سے جتنی محبت کرتا ہے اُس سے اُتنی ہی نفرت بھی کرتا ہے بلکہ محبّت سے کہیں زیادہ نفرت ہی کام کر رہی ہوتی ہے:"

شاعر بولا: "تمہاری بات پر میں غور کر رہا ہوں۔"

طنز نگار بولا: "عورت بھی عجیب بلا ہے۔ ان گنت صدیوں سے وہ مرد کے ہاتھوں پٹتی آ رہی ہے، پھر بھی وہ اُسے محبّت کئے جاتی ہے۔"

شاعر چُپ تھا۔ اُس کی حالت اُس مداری کی سی تھی جسے ہمیشہ کھوٹا پیسہ نصیب ہوتا ہو۔ اُس وقت کرناٹک کی آواز سنائی دینے لگی:

"سُر پُرا بیلے سلی سُر پُرا اتلّی

سُر پا گُنڈ اچگی الی نن غنتھا
منی تانیا یاں نُرّی الی!"
——سُر پا گاؤں کی قسمت جاگے، سُر پا میں بیج بوئے جائیں
سُر پا کی پہاڑی سرسبز ہو جائے، اور مجھ سی
عورت کا انصاف ہو جائے۔
اب کے طنز نگار کچھ نہ بولا۔ میں نے پھر سوئی گھما دی۔ یہ تامل ناڈو کی آواز تھی:
"ارشی اِروک کدو پُروتی روکدو
اڑدو توُ کلّا ووشنگڑم!
کاتِر کدُو توُل پر کدُو
کدوِلّا وسنگڑم
پونڈاتی وندو مُنّے نِدکرال
پڑوئی اِلّا وشنگڑم!
وا شان وندُو واش دِل زِکران
کاتِشلّا وشنگڑم!"
——چاول ہے، دال ہے
چُولہا نہیں، یہی دِقّت ہے
ہوا اڑ رہی ہے، گرد اڑتی ہے
کواڑ نہیں، یہی دقّت ہے
بیوی آکر سامنے کھڑی ہے
ساڑی نہیں، یہی دقّت ہے
فقیر آکر دروازے پر کھڑا ہے

ادھیلا نہیں، یہی وقت ہے

شاعر کی حالت اُس گلہری کی سی تھی جو جنگل سے اخروٹ اٹھا اٹھا کر اپنے موُکھے میں جمع کرتی جائے۔ اُسے خوش کرتے کے لئے، میں نے گجرات کی آواز حاصل کی:

"کائی مدھر مدھر رنکارتی اے گھنٹڑیو

امے کریئے منگل ناد، مدھری گھنٹڑیو

امے پوڑھیا دیو جگاڑیئے، ہو گھنٹڑیو....."

——کوئی مدھر جھنکار کرتی ہوئی ہم ہیں گھنٹیاں

ہم منگل گان کرتی ہیں، مدھر گھنٹیاں!

ہم سوتے دیوتا کو جگاتی ہیں —— گھنٹیاں!

طنز نگار بولا: "اب بند بھی کرو یہ گھنٹیاں، یہ صرف دیوتاؤں کو جگا سکتی ہیں۔ بھوکے انسانوں کی قسمت کو جگانا ان کے بس کی بات نہیں۔ کسی کی بیوی کو خودکشی سے روکنے کی طاقت اِن میں کہاں؟ نہ یہ سُر بیا گاؤں کی عورت کا انصاف کر سکتی ہیں، نہ تامل ناڈ کی دقتوں کو دور کر سکتی ہیں۔"

بلبل کا نغمہ شاید ہمارے سوگیتوں پر بھاری تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ میری روح سے صدیوں کا بوجھ اُتر گیا۔ لیکن شاعر بولا: "ویری ناگ گویا ایک بھوری بھینس ہے —— جگالی کرتی ہوئی بھوری بھینس۔ اسے میری بھوک کی کیا فکر؟" اُس کا دھیان بدلنے کے لئے میں نے خود سوئی گھما دی۔ آسٹریلیہ کی قدیم النسل ساورا قوم اپنا اجتماعی نغمہ چھیڑ رہی تھی:

"اے ایر ٹنپلا، لیم سی تم

اے ایر ٹنپلا، لیم جینگ تم

سر جی آنیپ بن سیین نائی

آمان اُمنہ باتے سر بجالم

رڈوے ڈی تاٹ ڈاکوا منتے
اب گاربیں ڈکوا متے
—— ارے ہل، تیرے ہاتھوں کو نمسکار
ارے ہل، تیرے پیروں کو نمسکار
سال کے پیڑ کو سراہتا ہوں
جس سے تم بنائے گئے ہو
تم سدا بلوان رہو
تم سدا کام کے لئے تیار رہو

نہ جانے کتنی صدیوں سے یہ گیت گایا جا رہا تھا —— یہ گیت جس میں ساودا جنتا نے اپنی روح تک سمو دی تھی۔ اُس وقت مجھے دو لڑکیوں کا دھیان آیا۔ ایک نے گیت لکھانے سے تنگ آکر کہا تھا: "تم گیت پہ گیت پوچھے جا رہے ہو۔ یہ کیوں نہیں پوچھتے گیہوں کا کیا بھاؤ ہو گیا؟" دوسری نے پتھر کوٹتے کوٹتے کہا تھا: "میرا نام ہے روٹی کھاؤ پانی پیو۔" شاعر اپنا نام "نہ پھل نہ روٹی" بتاتا یا شاید طنزنگار کے پیشِ نظر اُسے "گیت ہی گیت" کا لقب دیا جا سکتا تھا۔

ٹمٹماتے دیئے کی طرف دیکھتے ہوئے طنزنگار بولا: "تیل کے بغیر تو دیا بھی نہیں جلتا۔ کھانا کھائے بغیر شاعر نہ جانے کیسے گیتوں میں مگن رہ سکتا ہے"..... میں نے ایک شرابی کی طرح کہا۔

—— لو ایک گھونٹ اور سہی، اور میں نے اب کے گلمرگ کی طرف سوئی گھما دی۔

"گور گور کریو، کن کے ڈورو، کن کے ڈورو
دلہہ ہیند شاہزاد، آگھ لاہورو، آگھ لاہورو
نال چھے کھال مال ہتہ ہنزورو، ہتہ ہنزورو
ٹنڈ ماردیو، مرگے سورو، مرگے سورو
لٹہ لٹہ تیبو، ہتہ منصورو، ہتہ منصورو

آنگن مُوپک، وانگن ژورد، وانگن ژورو
سُون گیاریو، ٹھولہ زیوُرُو، ٹھولہ زیوُرُو
ژنہ ہا پہ وتا، چھُونہ دستورُو، چھونہ دستورو"

—— اپنے آغوش میں تجھے جھلاؤں گی، میرے کان کے آویزے، کان کے آویزے!
تم دِلی کے شہزادے ہو، تم لاہور سے آئے ہو، لاہور سے آئے ہو
تمہارے گلے میں بادام کی گریوں کا ہار ہے، تم چلتے ہو تو آواز آتی ہے، چلتے ہو تو آواز آتی ہے
پیروں کی اُنگلیوں کے سِرے تو نہیں جل گئے، ارے مرکہ راکھ ہونے والے، ارے مرکہ راکھ ہونے والے
بار بار میرے ہاں آؤ، ارے پاگل منصور، پاگل منصُور۔
میرے آنگن سے مت گزرو، ارے بینگن چرانے والے، بینگن چرانے والے!
تیرے لئے کیا پکاؤں؟ —— انڈے کا سالن؟ انڈے کا سالن؟
نقاب تو الٹ دیتی، پر یہ دستور نہیں، دستور نہیں۔

بھُو کا شاعر ہمہ تن گوش ہو گیا تھا۔ بولا "بہت خوبصورت نغمہ ہے۔ تِرل رِل، تِرل رِل —— جیسے کوئی چشمہ گنگنا رہا ہو۔ سچ جانو اس سے تو کچھ ایسی خوشبو آتی ہے جو تازہ کئے ہوئے دیوار کی خوشبو سے بھی بڑھ کر ہے"۔

میرا ذہن اچھا خاصا ریڈیو بن گیا تھا۔ ذرا سوئی گھمائی اور نغمہ بدل گیا۔ شاعر کی حالت کچھ اُس شخص کی سی تھی جو محفل میں بیٹھا ہو مگر پھر بھی اُسے یہی احساس ہو کہ اُس کے گرد تنہائی نے جال بُن رکھا ہے۔ میں نے پھر سوئی گھما دی۔ ریڈیو بول رہا تھا: "یہ ویری ناگ ہے۔ ابھی آپ بلبل کا نغمہ سُن رہے تھے۔ اب ایک کشمیری لوک گیت سنئے، جس کے ٹیپ کے مصرع کا مطلب ہے کہ دو پریوں سے دھان کے ڈھیر لگا دیں ......" طنز نگار نے جھٹ سے سوئی پرے گھماتے ہوئے کہا: "ہندوستان غلام کا غلام ہے۔ تاریکی ہی تاریکی ہے، جہالت ہی جہالت، بھُوک ہی بھُوک۔ لہولہان دنیا کی لہولہان خبروں سے تمہاری طبیعت پریشان

رہتی ہے۔ اور تم نے کہا تھا نا کہ بہت جلد جنگ سے پہلے دیس میں بھیانک قحط آنے والا ہے" ہندوستان کے مسائل بھوتوں پریتوں کے طرح میرے کانوں میں چیخنے لگے۔ شاعر نے سنبھل کر کہا: "لاکھ جنگ جاری ہے، لاکھ تاریکی ہو، جہالت ہو، غلامی ہو۔ نغمہ ہی حقیقت ہے، رقص ہی حقیقت ہے۔ رنگ ہی نغمہ ہے نغمہ ہی رنگ ہے۔ گھبراؤ مت۔ نغمہ ہی آزادی ہے نغمہ ہی اُشا ہے......"

میرا ریڈیو بول رہا تھا: "یہ کلکتہ ہے۔ ابھی آپ نے دیپالی خاستگیر سے رابندرناتھ ٹیگور کا گیت سُنا۔ اب سبھے رشری مجومدار سے ایک بنگالی لوک گیت سنئے:

"او بھائی نا ایر ماجھی، شنو بولی دُکھیر کتھا شُن
کتو مانش گورو مرے گیلو جیشٹھی ماشیر جھڑے
تال گاچھ تے سا لک پاکھی ڈِیمے تا ؤت پڑے
او بھائی ڈِیمے تا ؤت پڑے
آمار بؤ گیچھے باپیر باڑی مرے چھے تار پشی رے
او بھائی نا ایر ماجھی، شنو بولی دکھیر کتھا شُن"

_____ ارے بھائی ناؤ کے ماجھی! سنو میں بتاؤں میرے دکھ کی کتھا سُنو
کتنے ہی آدمی اور مویشی مر گئے جیٹھ مہینے کے طوفان میں
ارے بھائی جیٹھ مہینے کے طوفان میں
تال کے پیڑ پہ سالک پنچھی انڈے سے رہا ہے
او بھائی، انڈے سے رہا ہے
میری بہو باپ کے گھر گئی ہے، اُس کی پھوپھی مر گئی
ارے بھائی ناؤ کے ماجھی سُنو میں بتاؤں میرے دکھ کی کتھا سُنو،

شاعر اور طنز نگار خاموش تھے۔ وسط ہند کے قدیم النسل گونڈوں کے ڈھول بجنے لگے اور اُن کے کرما ناچ کا گیت گونج اُٹھا۔

تھاری بینچے لوٹا بینچے اور گرے کا ہار رے۔
اِتنا میں تبھی ناہیں جیو گھبرائے، مایاں!
اے منڈلا جیلا میں کٹھن جینا ہا رے!
——میں نے تھالی بیچ دی اور گلے کا ہار بیچ دیا
اتنے پر بھی پُورا قرضہ نہیں چکتا۔ جی گھبراتا ہے، پریتم!
اِس منڈلا ضلع میں زندگی کٹھن ہو گئی، ہائے رے!

شاعر اور طنز نگار خاموش تھے۔ میں نے کہا: "لوک گیتوں میں دیش کا صحیح، حقیقی چہرہ نظر آتا ہے، یہ دیش کی اپنی آواز ہے، اپنی بیتی، ہر طرح کے تصنع سے بے نیاز۔"

شاعر بولا: "نئے دَور کے پیشِ نظر نئے گیت جنم لے رہے ہیں۔ یہ جنگ کا زمانہ ہے۔ پنجاب کے "گِدّھا" ناچ میں آجکل عورتیں ایک نیا گیت گانے لگی ہیں —— "آ گئے راہی راہ پُچھّدے، ہن پچھدے لڑائی کِتھے لگّی؟" یعنی پہلے راہی راستہ پُوچھتے تھے۔ اب وہ پوچھتے ہیں جنگ کہاں چھڑ گئی؟"

طنز نگار نے شاعر کے اِس بیان کی داد دی اور کہا: "تم ٹھیک کہتے ہو۔ تم نے وہ پنجابی گیت بھی تو سنا ہو گا —— گڈّی سرکاری پُلاں تو لنگھدی آچھم کر کے، پتّر ماواں دے کھنّی ویندی آبند کر کے!' یعنی سرکاری ریل گاڑی پُلوں کے اُوپر سے گزر رہی ہے۔ ماؤں کے بیٹوں کو وہ بند کئے ہوئے لئے جا رہی ہے۔ یہ گیت بھی اسی جنگ کے زمانہ میں پیدا ہوا ہے۔ جبکہ روز ریل گاڑیوں میں ہزاروں نئے رنگروٹ اپنی اپنی چھاؤنیوں کو جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ماں آخر ماں ہے۔ اُسے تو بیٹوں کی جدائی زہر کا گھونٹ معلوم ہوتی ہے۔ اس بیچارگی میں وہ اپنے پیر کا آسرا لیتی ہے۔ اور اُس سے دعا مانگتی ہے۔ کہ اُس کے لاڈلے بیٹے صحیح سلامت لوٹ کر گھر آئیں۔"

میں نے کہا: "لیکن نئے گیت ابھی کٹھالی میں پگھلنے سونے کی طرح ہیں۔"

ویری ناگ کی وہ رات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ میرے سامنے ہندوستان کا نقشہ تھا۔ کسی دیو قامت کسان کے ہاتھ کی طرح قسمت کی اچھی بُری لکیروں کی طرح اس پر ان گنت پگڈنڈیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ جو پگڈنڈی مجھے ویری ناگ تک لے آئی تھی، اب گہرے گہرے سایوں میں یوں چمک رہی تھی، جیسے یہ کسی اترائی ہوئی، لجائی ہوئی دلہن کی مانگ ہو۔

شاعر بولا، "تمہارے پاؤں اُلجھے ہوئے راستوں کو سلجھا چکے ہیں۔"

طنز نگار کہہ اُٹھا، "لیکن شاعر، خود تمہارے ذہنی راستے اب تک اُلجھے ہوئے تھے"

میں نے کہا، "میرے ہمدم، میرے دوست، میرے شاعر، میرے طنز نگار، آپس میں یوں مت اُلجھو۔ لوک گیت زندہ باد۔ آؤ ہم مل کر نعرہ لگائیں ——— گاتے جا ہندستان!

احمد ندیم قاسمی

کروٹیں

کتنے ادوار سے گذرا ہے شباب   عشق۔امید۔تذبذب۔انجام
ذرّے ذرّے میں خیالی فردوس   یعنی ہر گام پہ اوہام کے دام
ایک مرکز پہ دھڑکتی تھی حیات   "دوست بر سینہ۔نظر بر لبِ بام"
مجھ کو محسوس ہؤا کرتا تھا،   اپنے اشکوں میں ستاروں کا خرام
مضمحل سوچ میں لپٹی ہوئی صبح
دل بافِکر میں ڈوبی ہوئی شام
گنگناتے ہوئے جھرنے کے قریب   کسمساتا ہؤا اِک پیکرِ نور
وہ شفق رنگ لبوں کی لرزش   جیسے موسیٰ کے خیالوں میں طُور
رُخ پہ وہ ایک طلائی گیسو   جیسے آکاش کے رمنوں میں حُور
سمٹی باہوں میں لپٹنے کی امنگ   جیسے کلیوں میں چٹکنے کا شعور

مسکراہٹ میں محبّت کی کسک
تلملاہٹ میں جوانی کا غرور

میں نے اس عالمِ مدہوشی میں منجمد وقت کا دھارا دیکھا
جب کبھی غور کیا دُنیا پر ایک آوارہ ستارا دیکھا
میں نے آفاق کی پہنائی میں حُسن کو انجمن آرا دیکھا
اس قدر تند تھا سیلابِ شباب نہ سفینہ۔ نہ کنارا دیکھا

ایک دِن حُسن سے نظریں جو ہٹیں
قلبِ ہستی کو دو پارا دیکھا

اِک طرف رقص کی بجلی چمکی، اِک طرف آہ کا شعلہ بھڑکا
اِک طرف تھاپ پڑی طبلے پہ اِک طرف بھوک کا بادل کڑکا
زلفیں لہرائیں ——ہوائیں مہکیں ہونٹ تھرائے —— کلیجہ پھڑکا
بھاؤ کچھ اور چڑھے —— مے چھلکی فصلیں تیار ہوئیں —— دل دھڑکا

سانس لیتا رہا پھر بھی اِنساں
اندھی فطرت کا مجاہد لڑکا

شاعری حُسنِ بیاں تک محدود فلسفہ ہرزہ سرائی کا شکار
سرفروشوں پہ سلاسل کی گرفت سورماؤں پہ سیاست کا غبار
نوجوانوں کے ارادے ۔ بے رنگ جیسے صحرا میں شہیدوں کے مزار
غم کی ماری ہوئی دوشیزائیں شب کے سناٹے میں جیسے گلزار

زندگی۔ غیر مسلسل مستی
موت کا خوف۔ مسلسل آزار

نہ تدبّر سے مقدر کو غرض، نہ مشیّت سے مرا یارانہ
مجھ پہ ابلیس نے ڈورے ڈالے مجھ سے یزداں بھی رہا بیگانہ
کب تک احساس کو محصور رکھے خشک اسرار کا تانا بانا
کہکشاں اب ہے مری منزلِ شوق کہ بہت چھان لیا ویرانہ
مصلحت یہ ہے کہ تخلیق کروں،
نئے مے نوش — نیا مے خانہ

مژدہ! اے عالمِ نو کے خوابو مائلِ خیر ہے اِنساں کا شرف
اِس میں کچھ دوش کمانوں کا نہیں میرے تیروں سے گریزاں تھا ہدف
دل کی دھڑکن وہ شبیبوں سے اٹھی محوِ پرواز ہے تاروں کی طرف
حدّتِ جنس سے زنداں ٹوٹا اپنے موتی کو اچھالے گی صدف
گردشِ چرخ خبردار رہے
اب مرا عزم ہے تقدیر بکف

اسرار الحق مجاز

آہنگِ نو

یوں تو آنے کو کئی بار اِدھر آیا ہوں
اب کے اے دوست بہ اندازِ دگر آیا ہوں

اپنے سینے میں لیے شعلۂ احساسِ وفا
اپنے دامن میں لیے برق و شرر آیا ہوں

میکدہ چھوڑ کے میں تیری طرف آیا ہوں
سرفروشوں سے میں باندھے ہوئے صف آیا ہوں

لاکھ ہوں مَیکشِ آوارہ و آشفتہ مزاج
کم سے کم آج تو شمشیر بکف آیا ہوں

۲

اے جوانانِ وطن روح جواں ہے تو اُٹھو
آنکھ اِس محشرِ نو کی نگراں ہے تو اُٹھو

خوفِ بے حرمتی و فکرِ زیاں ہے تو اُٹھو
پاسِ ناموسِ نگارانِ جہاں ہے تو اُٹھو

اُٹھو نقّارۂ افلاک بجا دو اُٹھ کر
ایک سوئے ہوئے عالم کو جگا دو اُٹھ کر

ایک اک سمت سے شبخوں کی تیاری ہے
لطف کا وعدہ ہے اور مشقِ جفاکاری ہے

محفلِ زیست پہ فرمانِ قضا جاری ہے شہر تو شہر ہیں گاؤں پہ بھی بمباری ہے
یہ فضا میں جو گرجتے ہوئے طیّارے ہیں
یہ سرِ دوشِ ہوا موت کے ہرکارے ہیں
اُس طرف ہاتھوں میں شمشیریں ہی شمشیریں ہیں اِس طرف ذہن میں تدبیریں ہی تدبیریں ہیں
ظلم پر ظلم ہے تعذیر دل پہ تعذیریں ہیں سر پہ تلوار ہے اور پاؤں میں زنجیریں ہیں
ایک ہو ایک کہ ہنگامۂ محشر ہے یہی
عرصۂ زیست کا ہنگامۂ اکبر ہے یہی
اپنی سرحد پہ جو اغیار چلے آتے ہیں شعلہ افشان و شرر بار چلے آتے ہیں
خون پیتے ہوئے سرشار چلے آتے ہیں تم بھی اُٹھ جاؤ تو بیکار چلے آتے ہیں
خوں جو بہہ نکلا ہے اُس خوں میں بہادو ان کو
ان کی کھودی ہوئی خندق میں گرادو ان کو
رنگِ گلہائے گلستانِ وطن تم سے ہے شورشِ نعرۂ رندانِ وطن تم سے ہے
تشنۂ نرگسِ خوبانِ وطن تم سے ہے عفّتِ ماہ جبینانِ وطن تم سے ہے
تم ہو غیرت کے امیں تم ہو شرافت کے امیں
اور یہ خطرے میں ہیں احساس تمہیں ہے کہ نہیں
یہ درندے یہ شرافت کے پرانے دشمن تم ہو کہ حاملِ آداب و روایاتِ کہن
جادہ پیما کے لئے خضر ہو تم، یہ رہزن تم ہو خرمن کے نگہبان یہ برقِ خرمن
خطۂ پاک میں زنہار نہ آنے پائیں
آ ہی جائیں جو یہ زندہ تو جانے پائیں
مرد و زن پیر و جواں ان کے مظالم کا شکار خونِ معصوم بھی ڈوبی ہوئی ان کی تلوار
یہ قیامت کے ہوسناک غضب کے خونخوار ان کے عصیاں کی نہ حد ہے نہ جرائم کا شمار

یہ ترحم سے نہ دیکھیں گے کسی کی جانب
اِن کی توپوں کے دہن کر دو انہی کی جانب

یہ تو ہیں فتنۂ بیدار دبا دو اِن کو
یہ مٹا دیں گے تمدّن کو مٹا دو اِن کو
پھونک دو ان کو جھلس دو کہ جلا دو ان کو
شانِ شایانِ وطن ہو یہ بتا دو ان کو

یاد ہے تم کو کہن اسلاف کی تم یادیں ہو
تم تو خالد کے پسرِ بھیم کی اولادیں ہو

تم تو تنہا بھی نہیں ہو کئی دمساز بھی ہیں
روس کے "مرد" بھی ہیں چین کے جانباز بھی ہیں
کچھ نہ کچھ ساتھ فرنگی فسوں ساز بھی ہیں
اور ہم جیسے بہت زمزمہ پرداز بھی ہیں

دُور انسان کے سر سے یہ مصیبت کر دو!
آگ دوزخ کی بجھا دو اِسے جنّت کر دو!

علی سردار جعفری

وہم و خیال

(زمانۂ ماقبلِ تاریخ کے انسان کا ذہنی تجزیہ)

وقت

مسکراتے ہیں مناظر، رقص کرتے ہیں نجوم
چھن رہا ہے ابر کے پردے سے نورِ آفتاب
وقت کے میلے بدن پر دھاریاں ہیں نور کی
عارضِ گلرنگ پر صبحِ تمدّن کی نمود
آنکھ میں ماضی کا جادو، رُخ پر مستقبل کا نور
اپنے سینے میں لئے انسان کے سینے کا جوش

گنگناتی ہیں چٹانیں، گا رہے ہیں آبشار
اور فضا میں پڑ رہی ہے ہلکی ہلکی سی پھوار
تھرتھراتے ہیں ہوا میں سیکڑوں چاندی کے تار
گود میں تہذیبِ انسانی کا طفلِ شیر خوار
انکھڑیوں میں ارتقا کے جامِ رنگیں کا خمار
دوش پر اپنے اُٹھائے فکرِ انسانی کا بار

فکرِ انسانی

ٹوٹتی ہے کیوں شعاعِ مہرِ تاباں کی کمند
شب اٹھا لیتی ہے کیوں ناہید و پرویں کا نثار

رات کے ڈھلتے ہی پڑ جاتی ہے پھیکی چاندنی　　صبح ہوتے کیوں بکھر جاتا ہے تاروں کا غبار
جھوم کر اٹھتی ہے کیوں اودی فضاؤں میں گھٹا　　کوہ و صحرا پر برس جاتا ہے کیوں ابرِ بہار
کیوں پلٹ جاتا ہے موسم کیوں بدل جاتی ہے رُت　　کھیلتی ہے کیوں خزاں کی گود میں فصلِ بہار
موت اڑا لیتی ہے کیوں رنگین رخساروں سے رنگ　　ہے اجل کی نیند کا کیوں چشمِ ہستی میں خمار
رات کو ہوتا ہے کیوں بھولے مناظر کا ہجوم　　خواب میں رہتی ہے کیوں پیشِ نظر تصویرِ یار
ذہن کی تاریکیوں میں نور پھیلاتا ہے کون　　کس کے نغمے ہیں سرودِ زندگی پر بے قرار
زیرِ دامانِ افق سے پھول برساتا ہے کون　　کون ہوتا ہے شفق کے رنگ میں آئینہ کار
کون سوتا ہے ردائے برف میں لپٹا ہوا　　کوہ کی چوٹی ہے کس دوشیزہ سینے کا ابھار
آندھیوں سے اس طرح سرگوشیاں کرتا ہے کون　　گونجتی ہے وادی و کہسار میں کس کی پکار
کس کی ہیبت ہے کہ گیتی کا دہل جاتا ہے دل　　"کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار"
آسماں پر ہے یہ کس کے تازیانوں کی صدا　　آ رہا ہے کون یہ بادل کے گھوڑے پر سوار
اُٹھ رہا ہے کیوں پہاڑی کے کلیجے سے دھواں　　ناچتا ہے کون یہ پہنے ہوئے شعلوں کے ہار

الاماں اے عالمِ فطرت کی ارواحِ عظیم　　ہے حدِ ادراک سے باہر تمہارا اقتدار
ہے عناصر میں تمہارے حسن و ہیبت کی نمود　　آتش و آب و ہوا پر ہے تمہارا اختیار
تم وہاں رہتی ہو انسانی تخیل سے پرے　　جس جگہ جھک کر زمیں کو آسماں کرتا ہے پیار
نذر لائے ہیں تمہاری بارگاہِ ناز میں　　خوف کے مارے ہوئے مجبور انسانوں کی ہار

دیکھ کر انساں کی پستی وقت بھی تھرّا گیا
ارتقاء کے نرم ماتھے پر پسینہ آ گیا

ارتقاء

آہ اے ناداں، خیالی دیوتاؤں کو نہ پُوج — ذہن میں بنتے ہیں جو، ایسے خداؤں کو نہ پوج
جو برستے ہیں یہاں بھی اور وہاں بھی ہم نشیں — ایسے آوارہ طبیعت بے وفاؤں کو نہ پُوج
ہاں مرادیں اپنی ان گونگی چٹانوں سے نہ مانگ — قدر کر اپنے ارادوں کی، دعاؤں کو نہ پُوج
پوجنا ہے پُوج اپنی فطرتِ آزاد کو — مشرق و مغرب کی آوارہ ہواؤں کو نہ پُوج
گود میں سمٹی ہوئی رعنائیوں کو چھوڑ کر — وادی و کہسار کی رنگیں اداؤں کو نہ پُوج
بھُول کر اپنے سرودِ لذتِ گفتار کو — آسماں میں گونجنے والی صداؤں کو نہ پُوج

یہ خدا[1]، یہ دیوتا دو روز ہی رہ پائیں گے
جہل سے پیدا ہوئے ہیں علم سے مرجائیں گے

[1] مراد ہے خیالی خدا۔

شاؔد عارفی

مشورہ

مانتی ہوں! سہروں کے پھول آپ کھلتے ہیں
کاہلی کی مسند سے باپ بھی تو ہلتے ہیں
اور "بر" زمانے میں بن تلاش ملتے ہیں
گھر پہ آئے "قِسمت" کیوں دے صدا کہ "حاضر ہوں"

تم پہ ہے "بڑی" ابتک "بن بیاہ" بیٹھی ہے
پاک دامنی سے ہے دادخواہ، بیٹھی ہے
دیکھتی ہے کنبے کی رسم و راہ، بیٹھی ہے
مجھ پہ ہو تو جو مل جائے اُس کو ہاتھ پکڑا دوں

بختیاؔر کی نانی۔ کون تھی۔ پنہاری
خاندانِ رُشدی انعام کز غلط کاری
احتشاؔم کی دادی، حُسنِ بامِ بازاری
"چھان بین" اور ایسی "چھان بین" بے بس ہوں

باپ ہیں یہاں کچھ میل۔ ماں وہاں اُدھر کھوٹی
اِس کی آبرو دُبلی اُس کی بے کسی موٹی
یہ زکات کا پیسہ وہ حرام کی روٹی
"اونچ نیچ" کی بابت سوچ لو کہ سنتی ہوں

لڑکیوں کی دشمن ہے دوپہر جوانی کی
نوکروں پہ ہوتی ہے "مشق" دستانی کی
ولولوں پہ کھلتی ہے آنکھ پاسبانی کی
مشورے میں دل کی بات کیوں زبان پہ روکوں

کل فلاں فلاں۔۔۔ لڑکی نام اوچھال کر چلدی
"رکھ رکھاؤ" کے سر پہ خاک ڈال کر چل دی
انتہا پہ ہر تتلی پر نکال کر چل دی
یہ مثال کافی ہے اور کیا حوالہ دوں

جانتے ہو پردے کا گھر قفس نہیں ہوتا
دس میں پانچ وہ "لچھن" جن پہ بس نہیں ہوتا
اونچ نیچ کا کھٹکا نسوا میں دس نہیں ہوتا
نقل کفر کے اندر کفر تب سمجھتی ہوں

تم ہو دوسرا کوئی اس طرح اگر کہتا
حملۂ حمیت پر مارتا کہ مر رہتا،
"سوئے ظن" کا "خمیازہ" سطح فرش پر بہتا
مجھ سے ہو نہیں سکتا حرفِ ناسزا سُن لوں

نظمِ خانہ داری میں تم کو آج تک ٹوکا
"سائرہ" کا "رشتہ" ہے واسطہ "من و تو" کا
حرفِ جا و بے جا پر میں نے ہاتھ کب روکا
تم زمیں پہ چلتی ہو میں ہوا میں اُڑتا ہوں

"غیر کُف" میں شادی کا سلسلہ نہ مانوں گا
پاک صاف ڈھڈی کو پاک صاف جانوں گا
اب وجد کو پھٹکوں گا نسل و قوم چھانوں گا
"شجرہ ہائے ساقط" کو کیا صلائے "نسبت" دوں

آج سے "بڑی" تنہا باغ میں نہ جانے پائے
وہ تو وہ سلیمہ بھی ڈھول پر نہ گانے پائے
جس میں "آہ" شامل ہو وہ ہوا نہ کھانے پائے
نوجواں گوالہ بھی گھر میں اب نہ آئے۔ کیوں؟

کیا؟... "بڑی" کو پندرہ دن ہو گئے بخار آتے — کام کاج سے بچتے۔ ناشتے سے کتراتے
اور کچھ مرض ایسے جو نہیں کہے جاتے — روگ نے جڑیں پکڑیں۔ اب حکیم بلوا دوں

ہمتیں بڑھاتا ہے ہر طبیب اخلاقاً — طبِ یوسفی یہ ہے اور طاق پر مخزن
دق نہیں تو نسخے میں "کاسنی" کا کیا کارن — نبض کے بُرے لچھن! تھامنا۔ میں گرتی ہوں

"دق سے موت" ہے اس جا "احتیاط کرداری" — فرد فردِ قصہ پر شدّتِ نگہداری
"جو نماز پڑھتا ہو وہ کرے نہ مے خواری" — پھر یہ "عصمتیں" لاکھوں ہو رہی ہیں "اغوا" کیوں

وقارعظیم

پُرانی شاعری میں ترقّی پسند عناصر

اِس عنوان کو دیکھ کر بعض دِلوں میں اشتیاق پیدا ہوگا اور بعض میں شبہ۔ اور ان دونوں سے الگ بعض دل ایسے بھی ہوں گے جو اسے پڑھ کر مسکرائیں گے —— تمسخر اور طنز بھری مسکراہٹ۔ اِس لئے یہ کچھ ضروری سا معلوم ہوتا ہے کہ اصل مضمون شروع کرنے سے پہلے میں دو باتیں کہہ دوں جو شاید حد سے زیادہ مشتاق دلوں کو مایوسی سے بچالیں، اور جنہیں پڑھ کر شبہ کرنے والے اور مسکرانے والے دلوں میں اطمینان اور نظروں میں وسعت پیدا ہو سکے۔

یہ دونوں باتیں خود عنوان ہی کے متعلق ہیں۔ پُرانی شاعری' اور "ترقی پسند" اِن دو اصطلاحوں کا ایک ساتھ جمع ہونا —— یہی چیز دلوں میں اشتیاق پیدا کرتی ہے اور شبہ بھی اِن بظاہر دو مخالف چیزوں کے اسی اجتماع سے تمسخر اور طنز بھری مسکراہٹ بھی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے 'پُرانی شاعری' کے 'ترقی پسند عناصر' کا ذکر کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ پُرانی شاعری سے میری مُراد، حالؔی اور آزادؔ کی تحریک سے پہلے کی شاعری ہے۔

گو اس پُرانی شاعری کے اثرات آج بھی ہماری شاعری پر نمایاں ہیں، لیکن میں نے اپنی مثالیں اکا دکا مثالوں کو چھوڑ کر، اس پُرانی شاعری کے پرانے شاعروں سے لی ہیں۔ "ترقی پسند" کا مفہوم بھی میرے ذہن میں اُلجھا ہوا یا بہت پھیلا ہوا نہیں۔ اس مضمون میں میں نے جہاں کہیں ترقی پسند کا لفظ استعمال کیا ہے۔ میری مراد صرف یہ ہے کہ ہماری پرانی شاعری کے ہر دور میں ہمارے شاعر اپنے گرد و پیش کی زندگی سے متاثر ہوتے ہیں اور انہوں نے اس زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی اپنے شعروں میں کی ہے، اس لئے پُرانی شاعری کو یہ کہہ کر مردود قرار دے دینا کہ وہ سرے سے نقالی ہے یا اُس پر ہماری ویسی زندگی کا کوئی اثر نہیں، صحیح نہیں — داخلی اور خارجی، — شاعری کے اِن دونوں پہلوؤں میں زندگی کے نقش موجود ہیں، کہیں اُبھرے ہوئے اور کہیں ذرا دبے ہوئے، کہیں بہت روشن اور کہیں ادبی نزاکتوں کے دھندلکے میں چھُپے ہوئے۔ ہم جو سوچتے ہیں یا محسوس کرتے ہیں اور ان دونوں سے زیادہ جو کچھ دیکھتے ہیں۔ یا دیکھ کر، سوچ کر، محسوس کر کے، اس دیکھی، سوچی اور محسوس کی ہوئی چیز کو ایک نئی شکل دیتے ہیں — ترقی پسند ادب اس کی ترجمانی چاہتا ہے۔ اور یہ سب کچھ ہماری پُرانی شاعری میں موجود ہے۔

اعتراضوں کی نوعیت دو قسم کی ہے۔ پہلا اعتراض داخلی شاعری پر ہے۔ اور دوسرا خارجی شاعری پر۔ داخلی شاعری کے متعلق عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ ہماری غزلوں میں زندگی کی روح کہیں نہیں۔ ہمارے شاعروں نے اپنی غزلوں میں عشق و محبّت کے جس جذبہ کی ترجمانی کی ہے، اُس جذبہ کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ اُن کی کہی ہوئی باتیں نہ تجربہ کے نزدیک صحیح ہیں اور نہ انہیں نفسیاتی اعتبار سے سچّا سمجھا جا سکتا ہے۔ اُنکی باتوں پر لفظوں کے گورکھ دھندے اس طرح چڑھے ہوئے ہیں کہ سیدھی سادی بات بھی اُلجھاؤ میں پڑ کر زندگی سے بہت دور جا پڑتی ہے۔ خارجی شاعری پر جو اعتراض کیا جاتا ہے وہ بھی کچھ اس سے ملتا جلتا سا ہے۔ ہمارے شاعروں نے ہماری ملکی، سماجی، سیاسی اور اس

کے علاوہ قدرتی زندگی کی جو تصویریں اپنے شعروں میں پیش کی ہیں اُنہیں دیکھ کر ہمارا ذہن زندگی کا صحیح تصور کرنے کے بجائے، ایک ایسی زندگی کی تصویریں بنانے میں اُلجھ جاتا ہے جس کے وجود سے ہماری نظر یا ہمارا ذہن بالکل بے گانہ ہے۔ اسی لئے اس خارجی شاعری میں کوئی اثر نہیں۔ شاعروں نے تصویروں میں جو رنگ بھرے ہیں۔ اُن میں اصلیت کے روپ کے بجائے رنگوں کی شوخی اور گہراپن زیادہ ہے۔ اِس لئے کہیں کہیں نظر فریب تو ضرور معلوم ہوتے ہیں لیکن اُن میں دلوں کو تسخیر کرنے کی تاثیر نہیں۔ وہ آنکھوں کو دھوکا دے دیتے ہیں لیکن دل اُن کے فریب میں نہیں آتا۔

یہ مضمون لکھتے وقت میرے ذہن پر ان دو عام اعتراضوں کا اثر ہے اور اسی لئے میں نے پُرانی شاعری کی کچھ مثالیں لیکر یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اِس میں زندگی کا عکس بے حد نمایاں ہے۔ داخلی شاعری کی مثالیں میں نے نسبتاً کم لی ہیں۔ لیکن مثالوں کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا شاید مشکل نہ ہو کہ ہماری پُرانی شاعری کا کافی بڑا حصّہ اسی طرح کی چیزوں سے پُر ہے اور اس لئے یہ مثالیں صرف "مشتے نمونہ از خروارے" کی حیثیت رکھتی ہیں۔ خارجی شاعری کی مثالیں زیادہ لینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ کلام جس میں ایسی شاعری کے اچھے نمونے ملتے ہیں، غزلوں کے مقابلے میں زیادہ چھپا ہوا ہے اور عام نظریں اُس تک نہیں پہنچتیں۔

(۱)

اُردو کی داخلی شاعری —— غزل —— کی طرف سے دِلوں میں جو بدگمانی ہے وہ سرے سے بے بنیاد نہیں۔ اس لئے کہ ہماری غزل، شکل و صورت، تکنیک اور نفسِ مضمون، ہر اعتبار سے فارسی غزل کا عکس ہے۔ اور اسی لئے اُس کے بیشتر حصّوں پر اصلیت سے زیادہ بناوٹ کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ اُس کے لفظ، اُس کی ترکیبیں، اُس کی تشبیہیں اور استعارے اور ان سب کے بعد اُس کا تخیّل، یہ سب چیزیں ہمیں کچھ گنے چُنے

سانچوں میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ دیکھنے میں سڈول، خوبصورت اور نظر فریب، لیکن ان میں زندگی کا وہ کھُردراپن نہیں جس کا تعلق ہمارے دلوں ہے۔ لیکن ایک بات کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں کہ اِن گنے چُنے سڈول سانچوں میں سے ہمارے فنکاروں نے ایسی چیزیں بھی نکال لی ہیں جو چھلی اور ترشی ہوئی ہونے کے باوجود بھی سانچوں میں سے نکلی ہوئی مورتوں کے ڈھیر میں دبی دبائی لیکن کندن کی طرح چمکتی دمکتی دکھائی دیتی ہیں۔ شاعروں نے اِس جوہر کو سانچوں میں ڈالنے سے پہلے زندگی کی کسوٹی پر اچھی طرح کس لیا تھا اور اس لئے سڈول بن کر بھی اُس میں زندگی کا کھُردراپن موجود ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم فن کے حسین پردوں کو ہٹا کر ان میں چھپی ہوئی زندگی کو کھوجنے کی کوشش کریں۔

فن کے حسین پردے —— انسان کو ہمیشہ دھوکے میں ڈالتے ہیں، کبھی کم اور کبھی زیادہ۔ غزل کے معاملے میں دھوکا اپنی حد کو پہنچ گیا۔ اور ہماری نگاہیں ان پردوں کو چیر کر اُن کے دوسری طرف چھپے ہوئے حسن کو دیکھ نہ سکیں۔ پردے تو بہت ہیں۔ لیکن سب سے گہرا پردہ اشاریت (Symbolism) کا ہے۔ ہمارے شاعروں نے بہت کم باتیں اس پردے سے باہر آکر کہی ہیں۔ اور اسی لئے بہت کم باتیں ہیں جنہیں ہم نے کام کی باتیں سمجھا ہے۔ باقی باتیں بھی، جنہیں ہم نے کام کا نہیں سمجھا، کام کی ہیں، لیکن ہم اُنہیں دیکھ اس لئے نہیں سکے کہ نگاہ اشاریت کے جال میں اُلجھ کر رہ گئی۔ گل و بلبل، صیاد و قفس، شمع و پروانہ، مے و مینا، یہ اور اس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں، جنہیں اچھے شاعروں نے تو فن کا ایک پردہ سمجھا۔ اور بُرے شاعروں نے انہیں اصلی چیزیں سمجھ کر انہیں سے اپنی بزمِ شعر کو سجایا۔ پڑھنے والے بھی جنہیں اچھے شاعروں سے کم لگاؤ تھا۔ اور بُروں سے زیادہ انہیں چیزوں کو اصلی سمجھنے لگے۔ حالانکہ یہ سب کچھ صرف ایک پردہ ہے۔ اور اس کے پیچھے رنگ برنگی چلتی پھرتی متبسم زندگی۔

میرؔ کا شعر ہے ؎

پتّا پتّا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

بظاہر بے معنی سا شعر ہے۔ پتّوں اور بوٹوں کو کیا غرض کہ ہمارا حال جانیں اور پھر ہمیں یہ اُلجھن کیوں کہ "جانے نہ جانے گُل ہی جانے باغ تو سارا جانے ہے"۔ اعتراض صحیح ہے، لیکن اگر شاعر دنیا کو باغ سمجھتا ہے اور اُس میں رہنے بسنے والوں کو پتّے اور بوٹے۔ اور پھر اِن رہنے بسنے والوں میں سب سے اچھا اور سب سے پیارا وہ گُل، جسے کوئی محبوب کہتا ہے اور کوئی دوست۔ لیکن جسے شاعر کا دل اپنا سب کچھ سمجھتا ہے، جس کی بات سب سے وزنی اور جس کا خیال سب سے گہرا ہے، وہ اس دل کی حالت جانے۔ تو زندگی سب کچھ ہے۔ اور نہ جانے تو جینا اور مرنا برابر۔ اب اگر ہم شعر پر سے فن کے پردے کو ہٹا دیں اور پتّے، بُوٹے، گل اور باغ کو وہی کچھ سمجھیں جو شاعر سمجھتا ہے۔ تو اپنے دل کی آواز معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہی سچّی شاعری ہے اور یہی چیز نئے اور پُرانے میں فرق پیدا کرتی ہے اسی کو ہم ترقی پسندی کہتے ہیں "شعر اور زندگی" دونوں میں یکسانیت ہو۔

غالبؔ کا شعر ہے ؎

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

فن کے پردوں کے پیچھے چھُپی ہوئی چیزوں کو نہ دیکھ سکنے والا کہتا ہے۔ یہ کیا شاعری ہے؟ شاعر مرنے کے بعد شعر کہتا ہے۔ اور پھر کہتا بھی کیا کہ محبوب نے مرے قتل کے بعد جفا سے توبہ کی۔ یہ دونوں باتیں زندگی میں نہیں ہوتیں۔ نہ کوئی مرکر شعر کہتا ہے اور نہ کوئی زندگی میں اپنے چاہنے والوں کو قتل کرتا ہے۔ پھر آخر یہ ہے کیا؟ شعر کو زندگی کی کسوٹی پر کس کر دیکھئے۔ میں کہیں نوکری کے لئے جاتا ہوں۔ نوکری کے قاعدے اتنے سخت ہیں کہ میرا انتخاب نہیں ہوتا۔ میں مایوس ہو کر آجاتا ہوں۔ اور ہمیشہ کے لئے عہد کر لیتا ہوں کہ نوکری کا نام نہ لوں گا کچھ دن بعد اُسی قسم کی ملازمت کے لئے کچھ آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں درخواست نہیں دیتا۔ تو کوئی کہتا ہے کہ بھئی! اس مرتبہ انتخاب کی شرطیں افسر نے پہلے سے بہت ہلکی کر دی ہیں۔ لیکن مایوسی کی دنیا میں کھویا ہُوا ہوں۔ غالبؔ کا یہ شعر پڑھ دیتا ہوں ؎

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

شعر زندگی کی تفسیر بن جاتا ہے۔ فن کے پردے نظر کے سامنے سے ہٹتے ہیں تو زندگی خود بخود سامنے آجاتی ہے۔ مومن نے بھی کہا ہے ؎

کرکے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں وہ اگر ہوں گے تو بے وقت پشیماں ہونگے

اور اس شعر میں بھی زندگی کی تلخ حقیقت اور ایک سچا تجربہ چھپا ہوا ہے۔ ضرورت صرف پردہ اُٹھانے کی ہے۔

آدمی زندگی کی تلخ کاریوں سے تنگ آکر، اُس کی چہل پہل سے دور، تنہائی اور بیچارگی کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ اور اِس تنہائی میں کسی ایک چیز کو، ایک خیال کو اپنا مونس و ہمدم بنا کر، اِسی ایک سہارے پر زندگی کے بہاؤ کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ پھر اگر کوئی اس ایک سہارے کو بھی اس غریب سے چھیننا چاہے تو مایوسیوں میں دبا ہوا انسان خوشامد، لجاجت اور عاجزی کے لہجے میں کچھ اسی طرح کی بات کہے گا کہ ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دَم ہے رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

یہاں ساغر و مینا سے مُراد شیشے کا بلّوریں جام اور اُس میں چھلکتی ہوئی سُرخ شراب نہیں۔ بلکہ وہی ایک سہارا، جس کے بھروسے پر ایک مایوس اور ہاری ماندی زندگی دَم توڑ رہی ہے۔

ایسے ہی مایوس، زندگی سے گھبرائے ہوئے انسان، انسانوں کے سائے تک سے گھبراتے ہیں۔ دوسروں کی گرم سانسوں کی آہٹ بھی اُن کے دِلوں میں دھڑکن پیدا کرتی ہے۔ دوسروں کا ہنسنا بولنا، اٹکھیلیاں کرنا ان کے دِلوں میں تیر کی طرح چبھتا ہے اور اسی لئے جب ہنستا بولتا، اٹکھیلیاں کرتا ہوا انسان اُنکی برابری سے مسکرا کر بھی نکل جاتا ہے تو یہ اُس سے میٹھے، درد بھرے لفظوں میں کہتے ہیں ؎

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

یہاں نکہتِ بادِ بہاری فن کا پردہ ہے اور اس پردے میں زندگی اٹکھیلیاں کر رہی ہے۔
اُردو شاعری کے اشاریات عام طور پر حسن وعشق کی دُنیا سے نکل کر، ہماری عام زندگی کے کچھ محدود تجربوں کی ترجمانی کرنے تک ہی محدود نہیں رہے۔ اُن کے پردے میں صرف دل کی مایوسیاں اور ٹوٹی ہوئی امیدیں ہی چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ بلکہ شاعروں نے ان محدود اشاروں سے بعض بہت گہری سیاسی طنزوں کا کام لیا ہے۔ جب تک ہماری شاعری 'نئی' نہیں ہوئی تھی۔ شاعر کھلم کھلا سیاسی تنقیدیں کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ پھر بھی پردے میں رہ کر اُنہوں نے جو کچھ کہا ہے اُسمیں زندگی کی لہر، اور اُس کی خوں آلود تلخی، سیدھے سادے بے پردہ لفظوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اکبر بعض حیثیتوں سے نئے اور بعض سے پُرانے دَور کے شاعر ہیں۔ غزلوں میں اُن کا انداز اور رنگنیک پُرانا ہی ہے۔ اس لیئے ان کی غزلوں کا شمار پُرانی شاعری میں ہوتا ہے۔ اُن کا شعر ہے ؎

وہ توڑتے ہیں تو کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں
وہ روندتے ہیں تو سبزہ نہال ہوتا ہے

یہاں "وہ" سے مراد ہماری شاعری کا وہ مثالی محبوب نہیں، جس کے مَس نازک سے کلیاں مسکرادیں، یا جس کے خرامِ رنگیں سے سبزہ کھلکھلا اُٹھے۔ اِس وہ' کے پردے میں ایک ایسے محبوب کا تصوّر پوشیدہ ہے۔ جس کی چاہ میں زہر اور نبت میں کانٹے چھُپے ہوئے ہیں۔ جو ظالم ہے، لیکن جسے ظالم کہنا ممکن نہیں۔ جو آزادی کے گیت سُنا کر دوسروں کو غلام بناتا ہے۔ اور اسی غلامی کا نتیجہ ہے کہ ؎

وہ توڑتے ہیں تو کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں
وہ روندتے ہیں تو سبزہ نہال ہوتا ہے

یہ محبوب ہم پر کچھ ایسا جادو کرتا ہے کہ ہمیں اپنی بُرائی، اپنی بھلائی دکھائی دینے لگتی ہے ہم خود اپنے راستے میں کانٹے بچھاتے ہیں اور اُن پر چل کر اس طرح مسکراتے ہیں جیسے قدموں کے نیچے پھُولوں کی سیج بچھی ہوئی ہے۔ ہم یہ باتیں نہیں جانتے اور اگر جانتے ہیں تو جان کر انجان بنتے ہیں۔ سمجھ کر بے سمجھی دکھاتے ہیں۔ لیکن شاعر کا دِل جانی اور سمجھی ہوئی چیزوں کو چھپا ہوا نہیں رکھ سکتا۔ وہ ہماری نادانی کا پردہ اس طرح فاش کرتا ہے ؎

طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا اپنی چونچوں سے جو پھندا کس رہے ہیں جال کا

اور جب کوئی کہتا ہے کہ تم اس پردے کو اٹھا کیوں نہیں دیتے۔ اشاروں کنایوں میں کیوں باتیں کرتے ہو۔ برائی کو بھلائی کیوں بتاتے ہو۔ تو مجبور شاعر بات پر ایک دوسرا پردہ ڈالکر کہتا ہے کہ

خوشامد اس بتِ سفاک کی کس کو خوش آتی ہے
کوئی کیا شوق سے کرتا ہے مجبوری کراتی ہے

یہی مجبوری اور اس کا اظہار، زندگی کی ایک ناخوشگوار حقیقت کی ترجمانی ہے۔ اور ایسی ہی شاعری کو ہم "ترقی پسند" شاعری کہتے ہیں جو پردوں میں رہ کر بھی وہ سب کچھ کہہ سکے جو صاف لفظوں میں کہنا مشکل ہے یا جو صاف لفظوں میں کہا جائے تو اس میں اتنا اثر نہ ہو۔

غزل گو شاعروں پر ایک بہت بڑا اعتراض یہ ہے کہ اُنکی شاعری میں زندگی کا کوئی باقاعدہ نظریہ پیش نہیں کیا گیا۔ کسی شاعر نے زندگی کو نہ اپنی نظروں سے دیکھا ہے اور نہ اُس کے متعلق اپنا کوئی مطمح نظر پیش کیا ہے۔ زندگی کا نام تو اُن کے شعروں میں بہت آتا ہے لیکن یہ نام صرف ایک خول کی طرح ہے جس میں جھانک کر دیکھا جائے تو خالی جگہ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، یہ اعتراض بھی صرف انہیں شاعروں کے کلام پر کیا جا سکتا ہے جنہوں نے شاعری صرف قافیہ پیمائی کے لئے یا دل کی ہوس بجھانے کے لئے کی ہے۔ اچھے شاعروں کے یہاں جہاں ایک طرف زندگی کی سچائیوں اور تجربوں کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں وہاں دوسری طرف اُن کے شعروں سے یہ پتہ بھی چلتا ہے کہ اُنہوں نے زندگی کو برت کر کیسا پایا۔ اب یہ اور بات ہے کہ جو کچھ انہوں نے محسوس کیا ہے۔ اُس کی زیادہ تفصیلیں ہمیں اُن کے شعروں میں نہیں ملتیں۔ اسکی ایک وجہ تو خود غزل کی پابندیاں ہیں۔ اور دوسری زندگی کی ناہمواری۔ زندگی کو قرار نہیں اور اس لئے پرانے شاعروں کے نظریۂ حیات میں ہمواری کی کمی ہے۔

پھر بھی کچھ شاعر ایسے ضرور ہیں جن کے یہاں ان پابندیوں اور ان کمیوں کے باوجود کام کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ میر کا شعر ہے ؎

زندگی ماندگی کا وقفہ ہے — یعنی آگے چلیں گے دم لیکر

اِس شعر میں میرؔ نے زندگی کا جو نظریہ پیش کیا ہے، اُس پردہ برابر قائم بھی رہے ہیں۔ اور اُن کے دیوان میں اس طرح کے تھوڑے بہت شعر موجود ہیں جن میں زندگی کو اسی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ ایک دوسرا شعر ہے ؎

عمر کا وقفہ اس رستے میں کیا ہے میرؔ سمجھتے ہو — ہارے ماندے راہ کے ہیں ہم لوگ کوئی دم سولیں گے

غالبؔ نے تو زندگی کے متعلق اتنا کچھ لکھا ہے کہ لوگوں نے اُن کے فلسفۂ زندگی پر مفصل مضمون لکھے ہیں۔ اُن کے نظریۂ حیات کا نچوڑ اِن دو شعروں میں موجود ہے ؎

زندگی اپنی جب اِس شکل سے گذری غالبؔ — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

دیکھو مت کھائیو فریبِ ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

زندگی کے نظریہ میں اس باقاعدگی کی جو وجہ ہے اس کا اعتراف ایک شاعر نے خود کہا ہے ؎

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

اب غزلوں کے اکا دکا اور متفرق شعر دیکھ کر اندازہ کیجئے، کہ ہمارے پُرانے شاعروں نے زندگی کے مختلف محسوسات اور تجربات کو کس طرح لفظوں اور شعروں کا جامہ پہنایا ہے۔

ہاتھ میں لے کر ساعد سیمیں اُس کے ہم نے چھوڑ دیئے

بھُولے اُس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا (میرؔ)

ایک گذرے ہوئے تجربہ کی جو تصویر اِس شعر میں پیش کی گئی ہے اُس کا تصوّر کیجئے تو اِس رومانی منظر کے ایک ایک جزو میں ڈوبنے کو دل چاہتا ہے۔ یا اسی قسم کے ایک تجربہ کی عکاسی اِس شعر میں ہے ؎

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ — دیکھا مجھے تو چھوڑ دیئے مُسکرا کے ہاتھ (ناظمؔ)

ہماری زندگی کی ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ ہم جس چیز کے عادی ہو جائیں اُس کے بعد

پھر کچھ اچھا نہیں لگتا۔ رنج کا عادی ہونے کے بعد خوشیوں میں بھی وہ نیاپن اور انوکھاپن معلوم ہونے لگتا ہے کہ انسان کو اپنے آپ کو اِن سے مانوس کرنے میں دشواری محسوس ہوتی ہے غالبؔ نے اسی حقیقت کو اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

ایک دوسرا شعر ہے ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا سیلِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے (اصغر)

کسی مریض سے حکیم نے پوچھا کہ تمہارا دل کیا چاہتا ہے۔ مریض نے جواب دیا، میرا دل یہ چاہتا ہے کہ میرا دل کچھ نہ چاہے۔ ممکن ہے یہ محض لطیفہ ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ چھوٹا سا لطیفہ زندگی کی ایک بہت بڑی اور بے حد اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ہمارے سارے رنج، غم یا مایوسیاں، صرف اسی لئے تو ہیں کہ ہمارے دل میں طرح طرح کی آرزوئیں اور امیدیں پیدا ہوتی اور اُن کا پورا نہ ہونا ہی ہمارے دکھوں کی ساری کہانی ہے۔ یہ آرزوئیں نہ ہوں تو دکھ کی کہانی بھی نہ ہو۔ ہمارے بہت سے شاعروں نے زندگی کی اس بڑی حقیقت کو اپنے شعروں میں نظم کیا ہے۔ چکبستؔ کا شعر ہے ؎

رہی ہے ایک ترکِ آرزو کی آرزو باقی
اسی پر ختم ہے افسانۂ دردِ الم میرا

یہی بات ذرا دوسرے انداز میں دوسرے شاعروں نے اس طرح کہا ہے ؎

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
میری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

یا ؎

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں (شادؔ)

اور جب یہ اُمیدیں اور تمنائیں پوری نہیں ہوتیں تو شاعر موت کی آرزو کرنے لگتا ہے ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا امیدی اُس کی دیکھا چاہیئے

زندگی صرف ان بڑی بڑی باتوں ہی میں نہیں۔ اصل میں زندگی تو اونچ نیچ، اُتار چڑھاؤ،

ہلکے بھاری سے مل کر ہی بنتی ہے۔ اور شاعر جتنا زیادہ اونچ سے زیادہ نیچ، چڑھاؤ سے زیادہ اُتار اور بھاری سے زیادہ ہلکے کی طرف غور سے دیکھتا ہے اُتنی ہی اُس کی شاعری دلوں سے قریب ہوتی ہے۔ مثلاً جب شاعر کہتا ہے کہ ؎

میرے آنسو نہ پونچھنا دیکھو کہیں داماں تر نہ ہو جائے (مومنؔ)

تو ہمارے ذہن میں کئی تصویریں آتی ہیں۔ کسی مایوس انسان کو کسی سے بڑی آسیں اور امیدیں ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ میرا دوست ہر دکھ درد کا ساتھی ہے۔ لیکن دُکھ پڑتا ہے تو دوست پروا بھی نہیں کرتا۔ آخر دکھ اُس منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں درد کو درماں کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس وقت وہ دکھوں کا سہارا، دوست، آتا ہے تو یہ دل جلا، دکھ کا مارا، اپنے دلی لگاؤ کی بنا پر اس آنے والے کے دل میں بڑی گہری چٹکی لیتا ہے کہ دیکھئے آپ میرے دکھ کے علاج کی کوشش نہ کیجئے۔ آپ کو مفت میں زحمت ہوگی۔

کیا کیا فریب دل کو دیئے اضطراب میں اُن کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں (داغؔ)

ایک نفسیاتی حقیقت ہے۔ انسان اپنے دل کے بہلاوے کے لئے ایسی ایسی باتیں کرتا ہے جنہیں عقل تو شاید دیوانگی کہے۔ لیکن عشق کی دنیا میں، یا دوسرے لفظوں میں جذبات اور نفسیات کے نزدیک یہی دیوانگی سب سے بڑی فرزانگی ہے۔

حسرتؔ کا شعر ہے ؎

حُسن بے پروا کو خود بیں خود آرا کر دیا کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنّا کر دیا

ایک نہایت صاف اور بیّن نفسیاتی حقیقت کا شاعرانہ اظہار ہے۔

حسرتؔ کے یہاں اس طرح کے تجربوں کی بعض جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ تجربہ اور نفسیاتی تجزیہ دو چیزوں نے مل کر غزل کے شعروں کو زندگی کا ہم نوا بنا دیا ہے ؎

یاد ہیں سارے وہ عیش با فراغت کے مزے دل ابھی بھولا نہیں آغازِ اُلفت کے مزے

وہ سراپا ناز تھا بیگانۂ رسمِ جفا اور مجھے حاصل تھے لطفِ بے نہایت کے مزے

حسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے   اب کہاں سے لاؤں وہ نا واقفیت کے مزے

سچی زندگی کے ایسے تجربوں کی یاد، جن کے تصوّر میں ڈوب کر انسان دُکھ بھری زندگی کی تلخی سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ گذری ہوئی زندگی کے میٹھے، رس بھرے اور خوشگوار دنوں کی یاد کی تصویر اسی شاعر نے ان شعروں میں کھینچی ہے ؎

چُپکے چُپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے   ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانا یاد ہے
باہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق   تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے
تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بیباک ہو جانا مرا   اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے
کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً   اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے
تجھ کو جب تنہا کبھی پانا تو از راہِ لحاظ   حالِ دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے
غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی نظروں کیخلاف   وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے
دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لئے   وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے
دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے   جب منا لینا تو خود بھر روٹھ جانا یاد ہے
چوری چوری ہم سے تم آکر ملے تھے جس جگہ   مدّتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

اِن شعروں میں شاعر نے زندگی کی جن تصویروں میں آب و رنگ بھرا ہے، وہ تو شاید نئے زمانے کی "ترقی پسندی" کو بھی شرمائے۔ دل کی کہانی، اور اس کہانی کے ایسے ٹکڑے، جن میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی چھوٹی سی تصویر ہے اور ان بہت سی چھوٹی چھوٹی تصویروں کو ملا کر ایک ایسی تصویر بن جاتی ہے جسے دیکھ کر کہانی کے سارے ٹکڑے ایک ایک کر کے ہماری نظر کے سامنے پھر جاتے ہیں۔

اُردو کی داخلی شاعری کی یہ تھوڑی سی مثالیں ہیں جن کے چُننے میں کسی خاص التزام سے کام نہیں لیا گیا۔ جو شعر مضمون لکھنے سے پہلے ذہن میں آئے، اُن سے میں نے مضمون کا ڈھانچا بنا لیا۔ زیادہ دقّتِ نظر اور کاوش کے بعد شعروں کا انتخاب کیا جائے تو اُن میں سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں شعر ایسے ملیں گے جو ہماری جذباتی اور نفسیاتی زندگی کے علاوہ، ہماری اخلاقی، سماجی اور سیاسی

زندگی کے مختلف پہلوؤں کے ترجمان ہیں۔ یہ بات داخلی شاعری سے زیادہ خارجی شاعری میں ہے۔ مختلف دوروں میں شاعروں نے غزلوں، قصیدوں، مرثیوں اور مثنویوں میں ہماری معاشرت، تمدن اور سیاست کی جو تصویریں پیش کی ہیں وہ بہ یک وقت دل اور دماغ دونو پر اثر کرتی ہیں اُن میں جذبات بھی ہیں اور ان جذبات سے الگ مادی دنیا کی بے لوث بے رنگ اور سچی حقیقتیں بھی۔ اس داخلی اور خارجی شاعری کے بیچ میں ایک چیز اور بھی ہے۔ جس پر ہماری دیسی زندگی کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ ہمارے محاورے، ہماری تشبیہیں، ہمارے استعارے مختلف دوروں کے شاعروں کے کچھ شعر دیکھئے ؎

ہجوم رکھتے ہیں جاں بازیوں ترے آگے
جواریوں کا دوالی میں جیسے جھمگٹ ہو (ناسخ)

خونِ شہیدِ ناز سے بھی ہولی کھیلئے
رنگ اس میں ہے گلال کا بو ہے عبیر کی (آتش)

اپنا دلِ شگفتہ تالاب کا کنول تھا
افسوس تُو نے ظالم ایسے کنول کو توڑا (ولی)

زردی چھائی ہوئی رخساروں پر
سرسوں پھولی ہوئی انگاروں پر (شوق)

خونِ جگر سے مژگاں یوں خشک ہو رہے ہیں
جنگل میں جیسے یارو پھولا کھڑا ہے ڈھاکا (نظیر اکبرآبادی)

خوب چھایا ہے سرِ گوکل و متھرا بادل
رنگ میں آج کنہیا کے ہے ڈوبا بادل

لشکر بڑھے ہیں شاہ پہ یوں شام و روم کے
آتی ہے جس طرح سے گھٹا جھوم جھوم کے (انیس)

یوں سر برس گئے یہ روانی تھی باڑھ میں
پڑتا ہے ڈونگرا کبھی جیسے اساڑھ میں "

وہ گورا بدن اور بال اُس کے تر
کہے تو کہ ساون کی شام و سحر (حسن)

وہ رونے میں وہ ابرِ غم یوں ملے
کہ جس طرح ساون سے بھادوں ملے (")

جوگیا بھیس کئے چرخ لگائے ہے بھبوت
یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمّل (محسن کاکوروی)

دِل میں اس طرح سے ارماں ہیں آزادی کے
جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی (چکبست)

اِن شعروں میں شاعروں نے جو تشبیہیں استعمال کی ہیں اُن میں ہماری زندگی کے کئی پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے۔ دوالی، ہولی ہندوستان کے تیوہار ہیں۔ کنول، سرسوں، ڈھاکا ہمارے یہاں کے پھول پودے۔ اساڑھ، ساون، بھادوں، بادل، ڈونگرا، ہندوستان کے سب سے رومانی موسم کے پیامی

کنہیا، ہندو دھرم اور اُس کے رُومانی پس منظر کی جیتی جاگتی تصویر، جوگی، بھبوت اور بیراگی ہندوستان کے کوہ و دشت اور اُن کے وسیع مناظر کے نمائندے۔ ان سب لفظوں کے ساتھ کچھ تصوّر وابستہ ہیں۔ اور ان کے ذکر کے ساتھ ہماری نظر کے سامنے تصوّر کی ایک دُنیا آتی ہے ہولی، دوآلی کی گہما گہمی، ساون بھادوں کی پھواریں اور اودی اودی بدلیوں سے ڈھکا ہُوا آسمان کرشن کنہیا کی رومانی بانسری اور اُس کی تانوں میں گھری ہوئی گوپیاں، پہاڑ کی چوٹی پر آگ کے ڈھیر کے سامنے رچہچہاتے ہوئے پکھیروؤں کے گیت سننے والا بن باسی سنیاسی، تالاب میں کھلے ہوئے کنول، کھیتوں میں لہلہاتے ہوئے نرم و نازک ہرے پودوں پر ناچتے ہوئے سرسوں کے زرد پھول۔ یہ ترقی پسند شاعری کی خصوصیات ہیں۔ ترقی پسند شاعری جس میں شاعر تشبیہوں اور استعاروں سے بھی اپنے آس پاس کی زندگی کی چمکتی دمکتی تصویریں بناتی ہیں۔ یہی حال ہمارے بعض محاوروں کا ہے۔ جن کے پردے میں ہماری زندگی کے تصوّر آفریں نقش دکھائی دیتے ہیں۔ اس جگہ میں تھوڑی سی صرف ایسی مثالیں دوں گا جن میں عورتوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے محاورے نظم کئے گئے ہیں۔ ہمارے ملک میں توہم پرستی اتنی پھیلی ہوئی ہے کہ عورتیں بعض باتیں صاف صاف کہتے ہوئے بھی ڈرتی ہیں۔ اور اسی لئے اُنہوں نے اپنے لئے خاص خاص لفظ اور محاورے وضع کر لئے ہیں۔ اور جب یہ لفظ اور محاورے زبان سے نکلتے ہیں تو ان لفظوں اور محاوروں کے ساتھ جو تصوّرات وابستہ ہیں وہ خود بخود ہمارے ذہن میں آجاتے ہیں اور اس طرح گویا شعروں میں ہماری زندگی کے بعض پہلوؤں کی مصوّری ہو جاتی ہے ؎

ع جو بڑھ کے باجی سے میں ہوں بولی تو میری تو تو میں ماموں لپٹے

تو تو ـــــ زبان ماموں ـــــ سانپ

غضب ہے وہ تو میلے سر سے تھی آج طبق کی کیوں پنجیری اُس نے پھانکی

ع شاید کہ ہو گیا تر ا میٹھا برس شروع

سوچ اس کا نہ ہو گر مجھ کو تو پھر کس کو ہو جانتی تو نہیں کیا پاؤں ہے بھاری انّا

ان محاوروں سے جہاں ایک طرف ہماری معاشرت کی توہم پرستی کا اندازہ ہوتا ہے دوسری طرف ایک اور بات پر روشنی پڑتی ہے۔ ہمارے شریف گھروں کی عورتیں جنسی باتیں دوسروں کے سامنے بے باکی سے بیان کرتے ہوئے شرماتی ہیں۔ اور اتفاق سے یہ جنسی باتیں اس طرح کی ہیں کہ اُن کا ذکر بھی گفتگو میں آ ہی جاتا ہے اس لئے اپنی اس فطری اور ایک بڑی حد تک ملکی خصوصیت سے مجبور ہو کر اُنھوں نے صاف باتوں پر لفظوں اور محاوروں کے پردے ڈال لئے ہیں۔ ایسے پردے جو باتوں کو چھپا بھی لیں اور اُنہیں ظاہر بھی کر دیں۔

۲

ملکی اور قومی زندگی سے ہماری شاعری کس درجہ متاثر ہوئی ہے۔ اس کا اندازہ داخلی شاعری سے کہیں زیادہ خارجی شاعری سے ہوتا ہے! اسلئے کہ داخلی پر زندگی نے جو کچھ اثر ڈالا ہے وہ برہنہ نظروں کو صاف نہیں دکھائی دیتا۔ اس میں کہی ہوئی ہر بات کسی نے کسی دھندلکے میں ڈھکی چھپی رہتی ہے تشبیہ استعارہ، اشارہ، کنایہ، رمز، طنز، تصور آفرینی — یہ اور اس طرح کے بہت سے پردے ہیں جو اصل بات کو ہماری نظر سے چھپا لیتے ہیں اور جب تک ہماری نظر میں اتنا زور نہ ہو کہ ہم ان پردوں کو چیر کر باتوں کی تہ تک پہنچ سکیں اُس وقت تک داخلی شاعری کی ملکی اور قومی خصوصیتیں اندھیرے میں چھپی رہتی ہیں اور اسی لئے ہم اُس پر طرح طرح کے اعتراض کرنے لگتے ہیں۔ خارجی شاعری میں بھی یہ پردے کسی حد تک ہوتے ہیں اور ان کا ہونا ہی ادبی شان پیدا کرتا ہے لیکن یہ پردے اتنے بھاری نہیں ہوتے کہ ان کے پیچھے چھپی ہوئی چیزوں کی جھلک بھی نہ دکھائی دے۔ اس لئے جو کچھ ان پردوں میں ہے وہ چھپا رہ کر بھی چھپا ہوا نہیں اور یہی وجہ ہے کہ لوگ قومی اور ملکی زندگی کی تلاش داخلی شاعری سے زیادہ خارجی شاعری میں کرتے ہیں۔

ہمارے شاعروں نے اِس زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی اپنی شاعری میں جس طرح کی ہے اس کا اندازہ کچھ مثالوں سے ہو سکتا ہے

ہماری زندگی کا سب سے دلکش ظاہری پہلو یہاں کے موسم ہیں اور ان موسموں کے پودے پھل اور پھول۔ اچھی چیز کو دیکھ کر آنکھیں خوش ہوتی ہیں اور دل پر اسی خوشی کا اثر ہوتا ہے آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، دل اُسے محسوس کرتا ہے اور شاعر دیکھ کر اور محسوس کر کے ان مناظر کا حال اپنے شعروں میں بیان کرتے ہیں۔ ہمارے غزل گو شاعروں نے بھی زندگی کے اِس پہلو کی مصوری کی ہے لیکن زیادہ اچھی اور موثر تصویریں مثنویوں میں نظر آتی ہیں۔ غزل گو شاعر تو جب اِن مناظر سے متاثر ہوتا ہے تو اس کا اظہار کچھ اس طرح کرتا ہے ؎

چل یقیں بہتر نہیں ہے اس سے جل مرنے کی طرح
کیا ہی ہے پھولا ہے پلاس اور لگ رہی ہے بن میں آگ

کس کا ماتم ہے یقیں جو اس طرح روتا ہے ابر
کوکتی ہیں کوئلیں اور شوریوں کرتے ہیں مور

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی (ناسخ)

صبا جو گئی ڈھیریاں کر کے پھول
پڑے ہر طرف مولسریوں کے پھول (میر حسن)

ڈھلی ہوئی ندرت محسوس ہوئی بھونرے کی بھی آواز سنی
فطرت کی سہانی یہ ٹھمری بیساختہ دل نے ساز سنی

چھیڑا ہے راگ بھونرے کا ہوا کی ہے نئی دھن بھی
غضب ہے سال کے بارہ مہینوں میں یہ پھاگن بھی (اکبر)

اب مسلسل نظموں کو دیکھیے۔ میر کی ایک مثنوی کے چار شعر ہیں ؎

کہیں سبزہ تر سے جی جا لگے
کہیں سرسوں کا پھول جی کو ٹھگے

نہ پھولی تھی سرسوں تھی کچھ بہار
نہ ظاہر ہیں اُس کے کہیں لالہ زار

ہوا دلکش و ہر طرف سبزہ زار
کہ سرسوں نے کی تھی قیامت بہار

کہ خاطر جنوں سے نہ رکھئے نچنت
خبر بھی ہے تم کو کب آئے بسنت

یہ شعر ایک ایسے شاعر کے ہیں جو اُردو میں داخلی شاعری کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔

میر نے برسات کا حال اس طرح بیان کیا ہے ؎

رُت ہے برسات کی بہت پیاری
موج زن جھیلیں ندیاں ساری

کھیت دھانوں کے لہلہے شاداب
کر رہے ہیں نظر کی دلداری

کیا ہری دوب جنگلوں میں ہے — سبزہ مخمل سے ہے سوا پیاری
ہر طرف کھل رہے ہیں گل بوٹے — جس سے شرمندہ باغ کی کیاری
ننھی ننھی برستی ہیں بوندیں، — روح پر ہوتی ہے خوشی طاری
سوندھی سوندھی زمین کی مٹی — بھینی بھینی چمن کی بو پیاری
بدلیاں چھا رہی ہیں گردوں پر — زرد، اودی، سبزی زنگاری

کیا کہوں اب کے کیسی ہے برسات — جوشِ باراں سے بہ گئے ہیں پات
بوند تھمتی نہیں ہے اب کے سال — چرخ گویا ہے آب در غربال
جیسے دریا اُبلتے دیکھے ہیں — یاں سمندر نالے چلتے دیکھے ہیں
ہر طرف ہے نظر میں ابرِ سیاہ — پانی ہے جس طرف کو کریے نگاہ

سردی میں اسی بارش کا یہ حال سنئے ؎

برس مینہ دو دن میں کھل بھی گیا — ولیکن ہے کہرا لطف یہ بنا
کہ اندھیر تھا جیسے ظلمات ہر سو دود — ہوئے ہونٹ سردی سے سب کے کبود
دل اس دود تیرہ سے گھبرا گیا — کہیں آگ دیکھی تو جی آگیا (میرؔ)

انشاؔ کی برسات دیکھیے ؎

لہرا دیا صبا نے جو کل سبزہ زار کو — واں ہی گھٹا نے گھیر لیا چشمہ سار کو
جوش و خروش رعد نے یہ دھوم دھام کی — ہرگز کوئی کسی کی نہ پہنچا پکار کو
بجلی تڑپ تڑپ کے دکھانے لگی چمک — رونق ہوئی دو چند ہر اک برگ و بار کو
کچھ گلہ ہائے ابر سپید و سیاہ و سُرخ — مستانہ جھوم جھوم چلے کوہسار کو

سوداؔ کی گرمی ؎

جل گئیں بیلیں رہ گیا ہے کاٹھ — روشنی کا سا دار بست ہے ٹھاٹھ

بوند کو دِل صدف کا ترسے ہے ‏ ‏ ابرِ نیساں سے آگ برسے ہے
اب زمیں پر ڈبس پڑے ہے دھوپ ‏ ‏ سرسوں کے کھیت کا سا ہے کچھ روپ
سائے کی تیرگی پہ کر تو نگاہ ‏ ‏ قرب سے دھوپ کے ہوا ہے سیاہ
خلق کا تشنگی سے ہے یہ حال ‏ ‏ طفل کو مشک و دو جواں کو بکھال
تو بھی نیت اُنہوں کی بھرتی نہیں ‏ ‏ پیاسے مرتے ہیں پیاس مرتی نہیں
غیر زخانہ جائے امن نہیں ‏ ‏ اب کچھ آرام ہے تو زیرِ زمیں

سوداؔ نے گرمی کے موسم کا جو حال بیان کیا ہے اُس میں سچائی پر مبالغہ کا رنگ چڑھا ہُوا ہے۔ انیسؔ نے البتہ اِس موسم کا حال اس طرح بیان کیا ہے کہ اُس کی چھوٹی چھوٹی جزئیات بھی ہماری نظر کے سامنے آجاتی ہیں ؎

گرمی کی سحر اور وہ پھولوں کا مہکنا ‏ ‏ مرغانِ چمن کا وہ درختوں پہ چہکنا

ع ‏ وہ سرد ہوا اور وہ سبزے کا لہکنا

ع ‏ وہ گل کے کٹوروں پہ دُر افشانیٔ شبنم

ع ‏ کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا

دریا کو دیکھ دیکھ کے لہرا رہا ہے دل ‏ ‏ پانی بھی خوش گوار ہوا بھی ہے معتدل
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک ‏ ‏ ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں وہ بیاباں وہ سحر ‏ ‏ دمبدم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر
اوس نے فرشِ زمرد پہ بچھائے تھے گہر ‏ ‏ سو نی جاتی تھی لپکتے ہوئے سبزہ پر نظر
دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آتی تھی ‏ ‏ صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی

راکب عبائیں چاند سے چہروں پہ ڈالے ہیں ‏ ‏ تو نسے ہوئے سمند زبانیں نکالے ہیں

وہ دن ہیں جن دنوں کوئی کرتا نہیں سفر　　صحرا کے جانور بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر

ع　　گرمی سے کھیت خشک تھے جنگل اُجاڑ تھا

وہ گرم ہوا آہ وہ آندھی کے بگولے　　اُٹھے جو ترائی سے تو دم شیر کا پھولے

ع　　ایک ایک نخل جل رہا تھا صورتِ چنار

آب رواں سے منہ نہ اُٹھاتے تھے جانور　　جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر

شیر اُٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے　　آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے

آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے　　گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پہ

بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پہ

نظیر اکبرآبادی نے ہندوستان کے سب موسموں پر نظمیں لکھی ہیں اور اُن میں ان موسموں کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیلیں موجود ہیں لیکن اُن کی نظمیں اب اتنی زیادہ عام ہیں کہ اُنکی مثالیں دیئے بغیر بھی اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اُنکی شاعری پر ہندوستان کی زندگی کتنی گہری چھائی ہوئی ہے۔

ہندوستان کی فطری زندگی کے بعض پہلوؤں کی ترجمانی میرحسن نے بھی اپنے شعروں میں اس طرح کی ہے کہ زندگی کے اِس مخصوص پہلو کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ایک جگہ جنگل کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے ؎

وہ سنسان جنگل وہ نورِ قمر　　وہ براق سا ہر طرف دشت و در

وہ اُجلا سا میداں چمکتی سی ریت　　اُگا نور سے چاند تاروں کا کھیت

درختوں کے پتے چمکتے ہوئے　　خس و خار سارے جھمکتے ہوئے

درختوں کے سائے سے مہ کا ظہور　　گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور

ایک جگہ کہتے ہیں :-

کھڑے نہر پہ قاز اور قرقرے ۔۔۔ لئے ساتھ مرغابیوں کے پرے
صدا قرقروں کی بطوں کا وہ شور ۔۔۔ درختوں پہ بگلے منڈیروں پہ مور
صبا جو گئی ڈھیریاں کر کے بھول ۔۔۔ پڑے ہر طرف مولسریوں کے پھول
وہ کیلوں کی اور مولسریوں کی چھاؤں ۔۔۔ لگی جائیں آنکھیں لئے جن کا ناؤں

ہمارے ملک کے فطری مناظر کا ذکر شاعروں نے اتنا زیادہ کیا ہے کہ اگر ان سب نظموں کو باقاعدہ طور پر ایک جگہ جمع کیا جائے تو اس ملک کی فطری زندگی کی بہت سی جزئیات تفصیل کے ساتھ ہمیں معلوم ہو جائیں۔ یہاں کے موسم، اُن کی رومان انگیز کیفیتیں، ان کیفیتوں میں ڈوبے ہوئے امیر، غریب انسان، بچے، بوڑھے، عورت، مرد۔ یہاں کے ندی نالے، تالاب اور دریا، جنگل اور پہاڑ اور ان سب پر چہچہاتے ہوئے پکھیرو، گھومتے پھرتے اور کلیلیں کرتے ہوئے چوپائے۔ زرد، گلابی اور سفید پھول اور ان کی بھینی بھینی مہک، یہ سب چیزیں ہماری تو دیکھی بھالی ہیں۔ لیکن اگر کسی نے نہ بھی دیکھی ہوں تو ان چیزوں کے تصوّر سے ان کے رس اور کیفیت میں ڈوب سکتا ہے۔

یہ تو ہماری زندگی کا ایک پہلو ہے۔ ہمارے رہنے سہنے، پہننے اوڑھنے کے طریقے، ہمارے رسم و رواج، ہمارے تیوہار، ہمارے عقیدے، ہماری روایتیں اور ہماری سیاسی زندگی ان سب میں بھی ہے۔ اور سچ پوچھئے تو یہی زندگی، ہماری زندگی ہے۔ اس پر سوچ بچار کے طریقوں، ہماری اخلاقی قدروں اور ان سے زیادہ ہمارے دکھوں سکھوں کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اور اسی لئے انہیں چیزوں کا حال سُن کر کوئی ہماری زندگی کو صحیح تصوّر کر سکتا ہے۔ ہماری پرانی شاعری میں یہ زندگی جس طرح چلتی پھرتی اور مچلتی دکھائی دیتی ہے۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعروں نے دُنیا میں رہ کر آنکھیں کھلی رکھی ہیں اور چیزوں کو دیکھتے وقت دل اور دماغ کی کھڑکیاں بھی برابر کھلی رکھی ہیں۔ اس لئے اُن کے مشاہدوں پر جذبات کی رنگ آمیزی بھی ہے اور تخیّل کی گلکاری بھی۔

پرانے شاعروں کی مرقع نگاری کے کچھ نمونے دیکھئے۔ مثنوی میر حسن میں پرانے زمانے کے گہنوں اور اُنکی سجاوٹ کا حال اس طرح بیان کیا گیا ہے ۔

وہ ترکیب اور چاند سا وہ بدن — وہ بازو پہ ڈھلکے ہوئے نورتن
جڑاؤ وہ بالے کہ بالے کا رشک — وہ موتی کے مالے کہ عاشق کا رشک
وہ آنکھوں کی مستی وہ مژگاں کی نوک — کرن پھول کی اور بالے کی جھوک
وہ موتی کا دولڑا وہ موتی کا ہار — سدا اشک غم دیدہ اُس پہ نثار
رگا دھکدھکی، پنچ لڑا، ست لڑا — سراسر گلے حسن اُس کے پڑا
جڑاؤ دمکتی وہ چمپا کلی — رہے جس سے الماس کو بے کلی
جواہر سے بینے کی بیکل جڑی — کمر اور کولے کے نیچے پڑی
فقط موتیوں کی پڑی پائے زیب — کہ جس کے قدم سے گھڑی پائے زیب

وہ ماتھے پہ ٹیکے کی اُس کے جھلک — سحر چاند تاروں کی جیسے چمک
وہ تکمے پہ چمپا کلی کی پھبن — کہ سورج کے آگے ہو جیسے کرن

ع وہ بھج بند بازو کے اور نورتن
ع وہ لعلوں کی پازیب آدینہ دار
ع وہ مینے کے پاؤں میں چھلے تھے کُل (میر حسن)

مثنوی معراج المضامین میں پوجا کرنے والی عورتوں کے بناؤ سنگھار کا حال شاعر نے جس رنگ میں ڈوب کر بیان کیا ہے، اس میں سچی زندگی کی تازگی اور شادابی موجود ہے۔ اور ہمارے تصوّر کو ادبی لطافتوں کے پردے ہٹائے بغیر ہی ایسی تصویریں نظر آتی ہیں جن پر سے آنکھیں ہٹانے کو جی نہیں چاہتا ۔

بھرے مانگوں میں سیندور اور صندل — گلابی مدھ بھری آنکھوں میں کاجل

لطافت میں پرندچیں دو پٹے — شفق گوں چُنریاں رنگیں دوپٹے
کرن لچکا بنت گوٹا کناری — نزاکت میں یہ کچھ پوشاک بھاری
سنہرا ہے زر افشانی سے پانی — تمام آب رواں ہے کامدانی
غضب ڈھاتی ہے زیور کی سجاوٹ — ہمیلیں تورے چھلّے بچھوے انوٹ
نمایاں پان کی ہونٹوں پہ سُرخی — مہاور پاؤں میں ہاتھوں میں مہندی

یہ مہوشانِ ہند اس انداز سے پوجا کرنے جارہی ہیں۔ اور اُن کے سروں پر پوجا کے سامان کی تھالیاں ہیں ؎

سنہری تھالیاں چوکاسے روشن — بنا ہے دوب تلسی، دھوپ چندن
مٹھائی ناریل، پھول اور چاول — گلوری، کالے تل، سیندور گوگل
چڑھاتے ہیں نہانے میں لبِ آب — جہاں دیکھو وہاں پُوجا کا اسباب

اِدھر تو گھنگھرؤں کی چھماچھم کے ساتھ یہ پُوجا کرنے والیاں نظروں کو اپنا پُجاری بناتی جارہی ہیں اور اُدھر دوسری طرف ؎

بھجن گاتے ہوئے پنڈے کسی جا — کہیں جگ ہے کہیں ہے یوم پُوجا
کہیں باہم جوان و پیر و کودک — کوئی پوتھی لئے ہے کوئی پُستک
کہیں ہے بھاگوت گیتا کا چرچا — مہابھارت ہے رامائن کسی جا
کوئی اشلوک پڑھ کر پوچھتا ہے — کہیں تِلک کا ٹیکا ہو رہا ہے
کہیں ویدانت ہے مہانسا ہے — کہیں جوگ اور بیدک بدّیا ہے
پرانوں کی کہیں ہوتی ہے تجدید — کہیں ہوتی ہے ویدپاٹ کی دید (معراج المضامین)

میرؔ نے اپنے زمانے کے دیہاتوں کا ذکر بعض بعض مثنویوں میں کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دیہاتی زندگی ہمارے پُرانے شاعروں کی توجہ کا بھی مرکز رہی ہے۔ آج دو صدیوں سے زیادہ ... گذرنے کے بعد بھی جو شاعر، ادیب، افسانہ نگار یا ناول نویس دیہاتی زندگی کے

مرقعے کھینچتا ہے، اُسے "ترقی پسند" ادیب کہا جاسکتا ہے اور اس لحاظ سے ہمارے پُرانے شاعروں کے یہاں ایسی چیزیں بھی موجود ہیں جو نئی ترقی پسندی کے نزدیک بھی "ترقی پسند" ادب کا حصّہ کہی جاسکتی ہیں۔ میرؔ کے کچھ شعر ہیں ؎

چار چھپر کہیں چماروں کے — سو بھی ٹوٹے گرے بچاروں کے
پھر چلو جو آگے تو نہیں ہے کچھ — دھندھ سا اور جو کہیں ہے کچھ
پھوٹی ٹوٹی کوئی حویلی ہے — سو بھی میدان میں اکیلی ہے

اور آگے چل کر ان چماروں کی حالت دو شعروں میں بیان کی ہے ؎

وہ بھی کوئی چمار بھتے کوئی — فاقوں کے زیر بار بھتے کوئی
صورتیں کالی سوکھی سوکھی سی — ساری کنگال اور بھوکی سی

یہ اُس زمانے کا حال ہے جب دلّی میں بادشاہت تو تھی لیکن وہ قلعے کے اندر گھر کر رہ گئی تھی۔ مرہٹوں کی لوٹ مار، خانہ جنگیاں، اور ان سب کا نتیجہ غربت اور بھوک، ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے، میدان میں کھڑی ہوئی ویران اور سنسان حویلی۔

اِن پانچ شعروں میں شاعر نے دو سو برس کی زندگی کا جو نقشہ کھینچا ہے، تصوّر اُسے بنیاد بنا کر تاریخ کا ایک خون آلود اور اشک فشاں ورق تیار کرسکتا ہے۔

زندگی کی کتاب کا ایک رنگین، بیحد رنگین ورق، ہمارے رسم و رواج ہیں۔ رسم و رواج جن میں توہم پرستی، جذبات اور ان دونوں چیزوں سے زیادہ ہماری پُرانی معاشرت نے رنگ بھرے ہیں — ، باجے گاجے، ہنسی ٹھٹھے، ظاہری زرق برق، نام ونمود کا شوق، غریبوں کی پرورش، عزیزوں سے میل ملاپ، اور زندگی کو ہنستا کھیلتا دیکھنے کی خواہش، ہماری معاشرت میں یہ اور ان کے علاوہ بہت سی چیزیں شامل ہیں۔ اور اسی لئے جب بچّہ پیدا ہوتا ہے اُس کا عقیقہ ہوتا ہے، اُسے پڑھنے بٹھایا جاتا ہے، اُس کا شباب آتا ہے، اُس کی شادی ہوتی ہے تو یہ سب چیزیں ایک ساتھ مل کر اپنا کام کرتی ہیں۔ اور توہم پرستی اور جذبات میں ڈوبی ہوئی

معاشرت اور اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی زندگی میں ایک ایسی چہل پہل پیدا ہو جاتی ہے جس میں چھوٹے، بڑے، امیر، غریب، اپنے، پرائے سب خوش ہوتے ہیں۔ اِس لئے کہ اس میں سب کا بھلا ہوتا ہے۔ اپنے آتے ہیں، کھا پی کر، ناچ رنگ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ پرائے آتے ہیں تو زندگی کی گہما گہمی سے مسرور ہوتے ہیں۔ امیر اپنی امیری دکھا کر خوش ہوتے ہیں اور غریب کچھ پا کر بُری زندگی کو اچھا بنا لیتے ہیں، یہی اُن کی خوشی ہے۔ بڑے اِس لئے خوش ہوتے ہیں کہ چھوٹوں کی خوشی ہے اور اِس خوشی میں آئندہ کی امیدیں اور امنگیں شامل ہیں۔ چھوٹوں کو اس لئے خوشی ہے کہ یہ ساری چہل پہل انہیں کے لئے تھی۔ یہ زندگی دیکھنے کو اب آنکھیں ترستی ہیں اور دل روتا ہے۔ پھر بھی اس کی جھلک شعروں میں نظر آجاتی ہے۔ خوشی کے موقعوں پر ہم کیا کرتے ہیں اس کی طرف، غزل گو شاعروں نے بھی اشارہ کیا ہے ؎

گھی کے چراغ طور کے اُوپر جلاؤں میں (آتش)

چراغ گھی کے جلاؤں وہ آج شام نہیں (داغ)

رت جگے ہوتے ہیں گر غیر کے گھر ہونے دو (امیر)

غزلوں اور مرثیوں میں شادی بیاہ کی مختلف رسموں کا سرسری سا ذکر ملتا ہے لیکن اُن کا تفصیلی حال نہیں ملتا۔ پھر بھی جستجو کرنے والے ان اشاروں میں بھی تفصیلیں تلاش کر لیتے ہیں۔ سودا، ضمیر اور انیس کے مرثیوں میں ان رسموں کا ذکر اس انداز سے ہے ؎

کاٹا ہوا وہ سر تھا جو ساچق کا جتاوا — گردن کا خم زخم تھا مٹکے کا کلاوا (سودا)

شربت کی تو وال رسم کا کیا ذکر تھا اُس آن — پانی کے لئے سارے قبیلے کی گئی جان (〃)

ع چو بھوں کی جگہ خون جگر کھا گئے مہمان (〃)

ع وہ دولہا جو سلامی کے لئے سا ہوری آیا (〃)

ع بجائے مٹکیاں تیروں پہ سر تھے خوں چکیدوں کے (〃)

کہوں کیا نقل مہندی کی جو مہندی لانے والے تھے — سپاہ شام کی شمشیر، خنجر، تیر بھالے تھے (〃)

سہرے کے تار رُخ پہ مشابہ نقاب کے — منہ آفتاب اور وہ خطوط آفتاب کے (ضمیر)

دستِ حنائی پنجۂ مرجاں سے ہم عناں — کنگنا وہ موتیوں کا کلائی کے درمیاں (")

یہ کہہ کے سکینہ نے غرض مہندی لگائی — قاسم سے کہا نیگ مرا دیجئے بھائی (انیس)

اِن شعروں میں ہندوستانی شادیوں کی مختلف رسموں کے نام ہیں اور یہ نام ہندوستانی زندگی کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ لیکن ہماری شادیوں میں جو کچھ ہوتا تھا اُس کا تفصیلی ذکر ہمیں مثنویوں میں ملتا ہے۔ میر حسنؔ شادی کے باجوں گاجوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؎

ٹکوڑے وہ نوبت کے اور اُن کے بعد — گرجنا وہ دھونسوں کا مانندِ رعد

وہ شہنائیوں کی سُہانی دھنیں — جنہیں گوشِ زہرہ مفصّل سنیں،

وہ طبلوں کا بجنا اور اُن کی صدا — یہ گانا کہ اچھا بنا لاڈلا،

پھر دولہا گھوڑے پر سوار ہوتا ہے ؎

وہ نوشہ کا گھوڑے پہ ہونا سوار — وہ موتی کا سہرا جواہر نگار

پھر ؎

وہ اربابِ عشرت کا آپس میں مل — جمانا کھرگ راگ کا اب کے دِل

وہ ایمن کی تانیں ادھر اور اُدھر — مِلے سُر طنبوروں کے با یک دِگر

یہ سب کچھ تو گھر کے باہر ہوتا ہے۔ اب گھر کے اندر کا حال سُنئے ؎

وہ گہری سی شادی مبارک وہ ڈھول — وہ ٹونے سلونے وہ میٹھے سے بول

اُترنے کی وہ سمدھنوں کی پھبن — کھلیں پھول جیسے چمن در چمن

قہقہے، ہنسی، شور و غل آلیاں — سُہانی سہانی نئی گالیاں

عروسی و گہنا وہ سویا لباس — وہ مہندی سہانی وہ پھولوں کی باس

دولہا کی گت اِس طرح بنتی ہے ؎

کسی نے پسائی سرو نج آن کر — کوئی گالیاں دے گئی جان کر

سہاگا گئی کاں کو کوئی لگا　　　　گئی کوئی دولھن کی جوتی چھوا

گلزارِ نسیم میں ایک شعر ہے ؎

صحبت ہے برابری میں زیبا　　　　نسبت ہے برادری میں زیبا

لیکن یہی ایک شعر شادی بیاہ کے متعلق ہندوستانی معاشرت کی مکمل تصویر ہے۔

شادی بیاہ کے کچھ اور پہلوؤں کا ذکر قصیدوں میں بھی مل جاتا ہے۔ ذوقؔ کے شعر ہیں ؎

رقعہ شادی کا ہے اس رنگ سے تحریر ہوا　　　　کہ جوانانِ چمن آئیں جو مل کر باہم

شاخِ گل پہنے کلائی میں کلی کا کنگنا　　　　زرد جوڑے پہ بسنت اپنا دکھائے عالم

عطرداں میں گلِ نرگس وہ بھیجے عطرِ سہاگ　　　　سارے گل بھرنے لگیں بلبلِ بیتاب کا دم

یہ چڑھاوے کی ہو کثرت کہ جڑے ہے ہر صبح　　　　دگدگی پر گلِ داؤدی کے ہیرے شبنم

توہم پرستی اور دنیائے آب وگل کی ابتدا شاید ساتھ ہی ساتھ ہوئی ہے۔ اس لئے کہ تہذیب وتمدّن کی ساری منزلیں طے کر لینے والی قوموں کے اعمال وافعال میں بھی بڑی حد تک یہ جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو زندگی کا بہت سارومان ختم ہو جائے۔ اگر ہم توہم پرستی چھوڑ دیں۔ زندگی کی شاعری — ہماری معاشرت کے رگ وپے میں خون کی لہروں کی طرح جذب ہے۔ اور خون کی ان بہتی ہوئی لہروں اور زندگی کی نبض کی جان، توہم پرستی ہے۔ اسی لئے جہاں کہیں اس رومانی اور شاعرانہ حقیقت کی حکمرانی ہوتی ہے، پاسبانِ عقل، بھی آنکھ بچا کر نکل جاتا ہے۔ اور عقل وخرد کی دست بُرد سے دور یہ شاعرانہ حقیقت اپنی جلوہ ریزی کرتی رہتی ہے۔

میرؔ نے اپنی ایک مثنوی میں ایک بلّی کا ذکر کیا ہے۔ بلّی گھر میں پلی ہوئی تھی۔ اُس کے برابر بچے ہوتے تھے۔ لیکن مر جاتے تھے۔ سب کو ان بچوں کے مرنے کا رنج ہوتا تھا۔ اس لئے گھر والوں نے اپنے عقیدے کے مطابق طرح طرح کی ترکیبیں کیں۔ اس سلسلے میں جو جو باتیں ہوئیں ہماری اوہام پرستی کی بڑی اچھی مثال ہیں ؎

مستقل ایسا ہوا جو اتفاق | مرگ اِن بچوں کی گذری سب پہ شاق
حفظ اُس کی کوکھ کا لازم ہُوا | جھاڑے پھونکے کا ہر اک عازم ہُوا
نذریں مانیں نقش لائے ڈھونڈھ کر | نیل کے ڈوروں میں باندھے پیٹ کر
چھیچھڑوں پر بعضوں نے افسوں لکھے | بعضوں نے تعویذ لے کر خوں لکھے
گوشت کی چیلوں کو پھینکیں بوٹیاں | ماش کی موٹی پکائیں روٹیاں
بوبریرہ کے تئیں مانا بہت | بلّیوں کو بھی دیا کھانا بہت

جھاڑ پھونک، نقش، نیلے ڈورے، چھیچھڑوں پر افسوں، خوں سے لکھے ہوئے تعویذ، گوشت کی بوٹیوں اور ماش کی روٹیوں کا صدقہ ـــــ یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو آئے دن ہمارے گھروں میں ہوتا ہے۔

اِسی عمل اور افسوں کا ایک رومانی پہلو مومن کی ایک مثنوی میں ہے ؎

لاتا گُل و عطر میں کبھی گر | فرماتے یہ مجھ سے مسکرا کر
یہ گُل تو عمل کیا ہُوا ہے | یہ عطر فسوں پڑھا ہُوا ہے
نہ سونگھوں میں نہ میں لگاؤں | ممکن نہیں تیرے دم میں آؤں (مومنؔ)

شادی بیاہ سے پہلے یا بچوں کی پیدائش کے وقت، بڑے بڑے گھروں میں نجومیوں اور پنڈتوں کو بُلا کر اُن سے ہونے والی خوشی یا آنے والی زندگی کے متعلق طرح طرح کی باتیں پوچھی جاتی ہیں۔ بچہ نہیں ہوتا تو پنڈتوں اور نجومیوں سے رجوع کیا جاتا ہے۔ نجومی اور پنڈت آتے ہیں تو جو کچھ کہتے ہیں اُس کا انداز اس طرح ہوتا ہے ؎

کیا پنڈتوں نے جو اپنا بچار | تو پھر انگلیوں پر کیا کچھ شمار
جنم پتر اشاہ کا دیکھ کر | تولا اور ہر چھیک پر کر نظر
مقدّر ترے چاہیئے ہو پسر | کہ دیتی ہے یوں اپنی پوتھی خبر (میر حسنؔ)

مثنوی زہرِ عشق میں ماں اپنے بیٹے کو اس طرح نصیحت کرتی ہے ؎

پالا کس کس طرح تمہیں جانی | کون منت تھی جو نہیں مانی
روشنی مسجدوں میں کرتی تھی | جا کے درگاہ چوکی بھرتی تھی
کالا دانہ ذرا اُتروا لو | رائی لون اس سمجھ پہ کر ڈالو

اولادوں کی منتیں ماننا، مسجدوں میں جاکر روشنی کرنا، درگاہوں پر چوکیاں بھرنا ان چیزوں سے ہماری سوسائٹی کے ایک طبقے کے عقیدوں پر روشنی پڑتی ہے۔ اور رائی لون اور کالے دانے سے نظر اُتروانا تو ایک نہیں بہت سے طبقوں میں عام ہے۔

ہمارے رسم و رواج، اور ہمارے عقیدے ــــ ان دو چیزوں سے ملی جُلی ایک اور چیز ہے جس میں شادی بیاہ کی چہل پہل بھی شامل ہوتی ہے اور عقیدوں کی رنگینی بھی۔ اور یہ دونوں چیزیں مل کر ہندوستان کے تیوہاروں میں ایک بے حد دلکش فضا پیدا کر دیتی ہیں ــــ ہولی دیوالی، عید، شب برات، ہندوستان میں رنگینی اور خوشی کے تیوہار ہیں اور ان کا ذکر بھی دل کو لبھانے کی تاثیر رکھتا ہے۔ نئی شاعری میں تو ہماری زندگی کے اس پہلو کی مصوری طرح طرح کی گئی ہے۔ لیکن پرانے شاعر پر بھی ان پر بہار اور کیف آفریں مناظر کا گہرا اثر پڑا ہے۔ اسی لئے انہوں نے غزلوں تک میں ان فضاؤں میں پلی ہوئی تشبیہیں استعمال کی ہیں۔ جاں باز عاشقوں کو دیوالی کے جواریوں سے تشبیہ دینا اور خونِ شہیدِ ناز کو گلال اور عبیر کا ہم رنگ قرار دینا اس تاثر کی مثالیں ہیں۔ لیکن ہمارے پرانے شاعروں نے مثنویوں میں ان تیوہاروں کے مختلف پہلوؤں کے مرقعے کھینچے ہیں۔ میر کی ایک مثنوی کے جستہ جستہ شعر ہیں ؎

آؤ ساقی بہار پھر آئی | ہولی میں کتنی شادیاں لائی
جس طرف دیکھو معرکہ سا ہے | شہر ہے یا کوئی تماشہ ہے

ــــــــــ

پھر لبالب ہیں آب گیر میں رنگ | اور اُڑے ہے گلال کس کس ڈھنگ
پگڑیاں جامے بھیگے سو سو ہیں | اُن کو گلہائے تر کہیں تو ہیں

قمقمے بھر گلال کے مارے — مہوشاں لالہ رُخ ہوئے سارے
خوان بھر بھر عبیر لاتے ہیں — گُل کی پتی ملا اُڑاتے ہیں
جشنِ نوروزِ ہند ہولی ہے — راگ رنگ اور بولی ٹھولی ہے

آئے شکلیں بنا کے صورتِ باز — ڈوم ڈھاری بنے بجا کر ساز
کوئی جوگی کوئی فقیر بنا — کوئی ڈاڑھی لگا کے پیر بنا
کوئی بنیا بنا کوئی اوباش — نقل کرتے تھے ان سبھوں کی معاش
کچھ سپاہی بنے تھے کچھ تجّار — کوئی زاہد ہوا کوئی خمّار
جس کی تقلید کی سو ویسی طرح — اصل ہوتی نہیں ہے ویسی طرح (میرؔ)

اب سے دو سو برس پہلے کی دیوالی کا منظر بھی دیکھیے

جہاں میں یارو عجب طرح کا ہے یہ تیوہار — کسی نے نقد لیا اور کوئی کرے ہے اُدھار
کھلونے کھیلوں بتاشوں کا گرم ہے بازار — ہر اک دُکاں میں چراغوں کی ہو رہی ہے بہار

مٹھائیوں کی دکانیں لگا کے حلوائی — پکارتے ہیں کہ "لالہ دیوالی ہے آئی"
بتاسے لے کوئی، برنی کسی نے تلوائی — کھلونے والوں کی ان سے زیادہ بن آئی

صرف حرام کی کوڑی کا جن کا ہے بیوپار — اُنہوں نے کھایا ہے اس دن کیواسطے اُدھار
کہیں ہیں ہنس کے قرضخواہوں سے ہر اک اک بار — دوالی آئی ہے سب دیں چکائیں گے اک بار
خدا کے فضل سے ہے آسرا دوالی کا
کسی نے گھر کی حویلی گرو رکھا ہاری — جو کچھ تھی جنس میسّر بنا بنا ہاری
کسی نے چیز کسی کی چرا چھپا ہاری — کسی نے گٹھری پڑوسن کی اپنی لا ہاری (میرؔ)

کھلونے، کھیلیں، بتاسے، مٹھائیاں، جوًا، ہار جیت، چور چکاری اور ان سب کے ساتھ ساتھ دیوالی کے جگمگ کرتے ہوئے دیئے، اب سے دو سو برس پہلے بھی دیوالی میں یہی ہوتا تھا۔ اور اب سے دو سو برس پہلے کے شاعر کی نظر بھی انہیں چیزوں پر پڑتی تھی۔ لیکن اُس کی نظر میں کہیں کہیں ایک اخلاقی مبصر و مصلح کا تیکھا انداز مل کر، ان سچی تصویروں کو بامقصد بھی بنا دیتا تھا۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ زندگی ہے۔

نظیر اکبر آبادی کے کلام میں ہندوستان کے ان سب تیوہاروں کا حال بڑی تفصیل سے نظم کیا گیا ہے۔ اور ان نظموں کو پڑھ کر تیوہاروں کے اچھے اور بُرے دونوں پہلوؤں کی برہنہ تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ چونکہ نظیر کا کلام کسی نظر سے چھپا ہوا نہیں اس لئے اُن کے کلام کی مثالوں سے مضمون میں زبردستی طول پیدا ہونے کے سوا اور کچھ حاصل نہیں۔ صرف ایک مثال سے اس بات کا اندازہ کیجیئے کہ نظیر ان تفصیلوں کے کتنے شائق تھے ــــ تفصیلیں، جنہیں نئے ادب، نئے شعر اور ان دونوں چیزوں کی ترقی پسند روایات میں سب سے زیادہ دخل ہے ؎

کچھ طبلے کھٹکے، تال بجی، کچھ ڈھولک اور مردنگ بجی
کچھ چھیڑ بین ربابوں کی کچھ سارنگی رچھا اور چنگ بجی
کچھ تار طنبوروں کے جھنکے، کچھ دھمدھی اور مرچنگ بجی
کچھ گھنگھرو چھم چھم چھم چھم چھم کچھ گت گت پر آہنگ بجی
ہے ہر دم ناچنے گانے کا یہ رنگ دکھایا ہولی نے

گھروں سے باہر کے مناظر فطرت اور گھروں کے اندر کی زندگی، ناچ رنگ، کھانا پینا، پہننا اوڑھنا، شادی بیاہ، ٹونے ٹوٹکے، بولی ٹھولی، تیوہاروں کی رنگینیاں، ہولی، دوالی کے مزے، یہ سب ہماری زندگی ہے۔ ایسی زندگی جو ہزاروں برس سے بدلتی بڑھتی چلی آرہی ہے، جسے ہمارے اجداد نے بڑی جاں جوکھوں سے پال پوس کر ایسا بنایا ہے جیسا ہم اُسے دیکھ رہے ہیں۔ یہ زندگی جس میں ہر قدم پر نئی بات، نئی رونق اور نئی رنگینی ہے۔ جو بدلتی رہنے پر بھی بدلی ہوئی نہیں معلوم ہوتی۔ ہمارے وہموں نے، ہمارے عقیدوں نے، ہمارے مذہب کی روائتوں نے اس میں آئے دن نئے رنگ بھرے ہیں۔ لیکن ہم ان بدلتی ہوئی حالتوں اور رنگوں سے مانوس ہیں۔ اس لئے یہ

نئی تبدیلیاں نہ ہمیں یکبارگی محسوس ہوتی ہیں اور نہ ان کا ہم پر کوئی اثر ہوتا ہے۔ لیکن اس ہمواری اور تسلسل کے ساتھ چلنے اور آگے بڑھنے والی زندگی میں کبھی کبھی کوئی ایسا روڑا اٹکتا ہے کہ نہ وہ ہمواری باقی رہتی ہے اور نہ وہ تسلسل۔ اور اس زندگی میں ایسی اُلٹ پلٹ ہوجاتی ہے کہ اُس کی شکل پہچاننی بھی مشکل ہوجاتی ہے۔ سیاسی انقلابات اور تاریخ کے اہم ورقوں کا اُلٹنا —— یہی وہ روڑا ہے، جو ہر آگے بڑھتی ہوئی چیز کو یا تو پیچھے بہت پیچھے لوٹا دیتا ہے اور یا ایک ٹھوکر لگاکر آگے اور بہت آگے بڑھا دیتا ہے۔ اور زندگی اُس سے بالکل مختلف ہوجاتی ہے جیسی وہ تھی، سیاسی انقلاب، زندگی کے لہو میں کبھی تو ایسی روانی پیدا کردیتے ہیں کہ اس کے ہر مسام سے خون اُبلنے لگتا ہے اور کبھی ان رگوں کا خون ایسا جمتا ہے کہ ہر مسام سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتا ہے اور دیکھنے میں چلتی پھرتی، آگے بڑھتی ہوئی زندگی، ادھ موئی ہوکر سسک سسک کر آگے بڑھتی ہے۔ اس کے دل کی دھڑکنوں اور نبضوں کی آوازوں میں ایسی کمزوری پیدا ہوجاتی ہے کہ جینے والوں کو اُس کے جینے کی آس تک نہیں رہتی۔ یہی جینے والے —— شاعر —— دیکھی ہوئی چیزوں کا حال اپنے شعروں میں بیان کرتے ہیں —— کبھی رو کر اور کبھی خفا ہوکر اور کبھی ایک ایسی آواز میں جس میں کسی اور چیز سے زیادہ درد کی ٹیسیں ہوتی ہیں۔

غزل گو شاعروں نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا ہے اُس پر ہر جگہ جذبات کا رنگ چڑھا ہوا ہے اور ان شعروں کے سمجھنے والوں کو تاویلوں سے کام لینا پڑتا ہے، ادبی نزاکتوں کے پردے ہٹانے پڑتے ہیں، جب کہیں اصل بات سامنے آتی ہے۔ لیکن شاید "ترقی پسندی" کا تقاضا کچھ اور ہے۔ وہ تاویلوں اور پردوں کے قائل نہیں۔ اُسے بے رنگ برہنہ تصویریں چاہئیں، اور بیچارے پرانے شاعروں کے یہاں ان کی کمی نہیں۔

اٹھارویں صدی کا آغاز ہے۔ اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب کے پرشوکت و پرحشم دورِ حکومت کا خاتمہ ہوچکا ہے۔ اور اس مٹتے ہوئے شوکت و حشم کی پاسبانی ایک بوڑھا اور نحیف انسان کر رہا ہے۔ جو کہنے کو تو بادشاہ ہے، اور شاہی محلوں میں رہتا ہے اور جہاں تک ہوسکتا ہے

گذری ہوئی حشمت وشوکت کی رکھوالی کرتا ہے۔ لیکن اس کھوکھلے گھُن لگی ہوئی شوکت وحشمت کی پاسبانی بھی اُس کے بس کی نہیں۔ اِس لئے کہ اُس کا سارا دبدبہ اُس کی ساری بادشاہی صرف قلعۂ معلیٰ کی دیواروں کے اندر گھری ہوئی ہے۔ قلعہ کے باہر اس کھوکھلی بادشاہت کے سائے تلے پلنے والے بچے، بوڑھے، عورت، مرد مرہٹوں کے ظلم کے نیچے دبے دبائے، قلعہ کی دیواروں میں گھری ہوئی بادشاہت کے لئے دعا کر رہے ہیں۔ لیکن دبی ہوئی آوازیں شاید اثر نہیں ہوتا۔ اور دنوں کے ساتھ، اِس بوڑھے نحیف بادشاہ کا دبدبہ تک دلوں سے اُٹھ جاتا ہے اور اُس کی جان و مال کو دعا دینے والے بھی اُس کی بے بسی کی کہانی اپنی زبانوں سے کہنے لگتے ہیں

انہیں دنوں کی بات ہے۔ ایک امیر زمانہ کی چیرہ دستیوں سے تنگ آکر دلّی کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اِس بے بسی میں بھی اکیلے نہیں چلا جاتا، نوکر، غلام ساتھ ہیں۔ چلتے چلتے رات ہو جاتی ہے اور یہ شہر بدر مسافر ایک سرائے میں پہنچتے ہیں۔ بھٹیاری ان کے لاؤ لشکر کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ پاس آتی ہے۔ پوچھتی گچھتی ہے، کیا کرے اور کیا دھرے؟ امیر سب کے لئے کھانے کا حکم دیتے ہیں بھٹیاری کا بھی زمانے کے اُونچ نیچ کو جانتی ہے۔ اُن سے کہتی ہے کہ کچھ پیشگی مرحمت فرمایئے۔ امیر کو جیسے سکتہ ہو جاتا ہے۔ بے سرو سامانی ہی نے تو گھر چھڑایا۔ اب اُن کے پلّے کیا دھرا تھا۔ بھٹیاری سے سب کچھ صاف صاف کہہ دیا۔ میر نے اِس واقعہ کی کیفیت چار شعروں میں بیان کی ہے ؎

سُن کے اِک دل سے اُن نے کھینچی آہ　　اور بولی کہ واہ صاحب واہ
ہم تو جانا تھا آدمی ہو بڑے　　چار پانچ آدمی ہیں پاس کھڑے
کچھ یہ کھاویں گے کچھ کھلاویں گے　　ہم کچھ اِن کے سبب سے پاویں گے
سو تو نکلے ہو کورے بالم تم　　ہو گدا جیسے شاہ عالم تم

یہ شعر اُس نحیف، بوڑھے، پرانی شوکت وحشمت کے پاسبان کی بے بسی کی دردناک کہانی ہے ہندوستان کے ماضی کی یہ درد بھری کہانی، میر، سودا، نظیر، حالی، راسخ اور داغ وغیرہ شاعروں نے اپنے "شہر آشوبوں" میں کہی ہے۔ کہنے کو تو یہ نظمیں صرف شعر و شاعری ہیں لیکن

اِس شاعری کے پردے میں شاعروں نے اپنے زمانے کی زندگی کے حالات بیان کئے ہیں، ہر ایک نے اپنی اپنی فطرت کے مطابق ـــــ کوئی رویا ہے، کوئی ہنسا ہے اور کسی نے سخت طنز اور تمسخر کا لہجہ اختیار کیا ہے۔ لیکن ان آنسوؤں میں، اِس ہنسی میں اور طنز، تمسخر کے لہجے میں ہر جگہ ایک مسلسل کہانی کا کوئی نہ کوئی ٹکڑا چھپا ہُوا ہے۔

زمانہ وہی ہے جس کا ذکر میرؔ نے مثنوی کے چار شعروں میں کیا ہے۔ دہلی کے تاج و تخت لُٹ چکے ہیں۔ حکومت کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ اور ایک نام نمود کا بادشاہ اس بکھرے ہوئے شیرازے کو جوڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن حکومت کا شیرازہ محلوں کے اندر بیٹھ کر جوڑا جائے تو وہ اور بکھرتا ہے۔ تخت و تاج کے رکھوالے کی بے بسی کی آگ کی لپٹیں رعایا تک پہنچتی ہیں اور زندگی کا ہر گوشہ ان لپٹوں میں ڈھک کر جھُلس جاتا ہے۔ یہی حالت دِلّی کی تھی۔ اس دِلّی کی حالت سوداؔ کی زبان سے سُنئے ؎

لے گھوڑا اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی — تنخواہ کا پھر عالمِ بالا پہ نشاں ہے
کوئی سر پہ کئے خاک، گریباں کسی کا چاک — کوئی رووے ہے منہ پیٹ کوئی نعرہ زناں ہے
سوداگری کیجے تو ہے اِس میں یہ مشقت — دکھن میں ہے وہ جو خبہ بدیہ صفہاں ہے
بے جا جو کسی عہدہ کی سرکار میں دے جنس — یہ ورد جو سُنئے تو عجب طرفہ بیاں ہے
قیمت جو چکاتے ہیں تو اِس طرح کہ ثالث — سمجھے کہ فروشندہ پہ دزدی کا گماں ہے
جب مول مشخّص ہُوا مرضی کے موافق — پھر بیسوں کا جاگیر کے عامل پہ نشاں ہے
پروانہ لکھا کر گئے عامل کنے جس وقت — کہتا ہے وہ بیسا ابھی مجھ پاس کہاں ہے
آخر کو جو دیکھو تو نہ پیسے ہیں نہ وہ جنس — ہر اک متصدّی سے میاں اور تیاں ہے

شاعروں کا حال یہ ہے ؎

شاعر جو سُنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال — دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یاں ہے
گر عید کا مسجد میں پڑھے جاکے دوگانہ — نیّت قطعۂ تہنیت خان زناں ہے

تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر — گر رحم میں بیگم کے سُنے نطفہ خاں ہے

اور ؎

ملا اگر کیجئے تو ملا کی ہے یہ قدر — ہو دو روپے اُس کے جو کوئی مثنوی خواں ہے
دن کو تو بچارا وہ پڑھایا کرے لڑکے — شب خرچ لکھے گھر کا اگر ہندسہ داں ہے

یہ اُس زمانے کی زندگی ہے جب انسانیت دال روٹی سے بھی زیادہ سستی تھی۔ انسانیت کو بیچ کر بھی پیٹ کی آگ بجھانی مشکل تھی۔ اٹھارویں صدی کے شروع کی دلّی۔

وہی دلی کے وہ امیر جنہیں خلق اپنا مرجع سمجھتی تھی، جہاں جاکر سب دلوں کا درد دور ہو جاتا تھا۔ جہاں دُکھ درد کا مول اشاروں میں چلتا تھا اب ایسے ہیں کہ ؎

چار سپتے ہیں مستعد کار — دس تلنگے جو ہوں تو ہے دربار
ہیں وضیع و شریف سارے خار — لوٹ سے کچھ ہے گرمیِ بازار
سوکھی فندِ سیاہ ہے پاماش

یا ؎

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولتمند — سو آمد ان کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند — جو ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند
رہی نہ اُس کے تصرف میں فوجداری کول

میرؔ اور سوداؔ کی دلّی ایسی مٹی کہ پھر نہ بنی۔ بنتی کیا اور بگڑتی ہی گئی۔ وطن کی خاک پر نثار ہونیوالے امیر، غریب، سپاہی، شاعر، مزدور، پیشہ ور خاکِ وطن پر آنسو بہاتے، ایک شہر سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے شہر میں گھومتے پھرتے اور در در کی ٹھوکریں کھاتے رہے اور آخر قدرت نے، جو انسان سے زیادہ رحم دل ہے، انہیں ابدی نیند سُلا دیا۔ لیکن سونے والوں کو کیا خبر کہ اُن کی نیند نے بھی دنیا کی مصیبتیں کم نہیں کیں۔ قدرت کی رحم دلی ساری دنیا کے کام نہ آئی اور یہ بلا دلّی سے آگرے، آگرے سے لکھنؤ، مرشد آباد اور نہ جانے کہاں کہاں پھیلی اور پرانی یادوں کو

مٹاتی اور زندگی کو پہلے سے بھی بدتر بناتی رہی۔ غدر سے کچھ پہلے کے آگرہ کی حالت شاعر کی زبان سے سنئیے ؂

بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی — کوٹھی کی چھت نہیں ہے یہ چھائی ہے مفلسی
دیوار و در کے بیچ سمائی ہے مفلسی — ہر گھر میں اس طرح سے بھر آئی ہے مفلسی
پانی کا ٹوٹ جاوے ہے جوں ایک بار بند

آمد نہ خادموں کے تئیں مقبروں کے بیچ — باامن بھی سر ٹپکتے ہیں سب مندروں کے بیچ
عاجز ہیں علم والے بھی سب مدرسوں کے بیچ — حیراں ہیں پیرزادے بھی اپنے گھروں کے بیچ
نذر و نیاز ہو گئی سب ایک بار بند

کیا چھوٹے کام والے، کیا پیشہ ور نجیب — روزی کے آج ہاتھ سے عاجز ہیں سب غریب
ہوتی ہے بیٹھے بیٹھے جب شام عنقریب — اُٹھتے ہیں سب دُکان سے کہہ کر کہ یا نصیب
قسمت ہماری ہو گئی بے اختیار بند

اب سو برس بعد بھی ہم ان شعروں کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہماری زندگی کے مرقعے ہیں ــــ زندگی کے مرقعے، زندگی کی تصویریں، اگر کوئی پچھلے شاعروں کا کلام پڑھ کر گذری ہوئی زندگی کے تصور کو یکجا کرنا چاہے تو اُسے اِس تصور میں طرح طرح کے رنگ دکھائی دیں گے ــــ جنگل میں کھڑا ہوا ڈھاک، کچی سڑکوں کے کنارے کانٹوں کے بیچ میں پلنے والے ببول کے زرد پھول، ان ببولوں سے دور، بہت دُور پہاڑ کی چوٹیوں پر دھونی رمانے، رنگ پر بھبوت جمائے ایک بیراگی، اس بیراگی کے سر پر سے اُڑنے والے بگلوں کی قطاریں اور آس پاس پھُدکنے، چہچہانے والی کوئلیں اور پپیہے۔ اِن پہاڑیوں میں بل کھاتی، اٹھلاتی ہوئی ندی، جو آگے جا کر میدانوں کو سیراب کرتی، پریاگ اور کاشی کے تیرتھوں میں ہوتی اور پوجا کرنے والوں سے نذر عقیدت وصول کرتی سمندر میں جا ملتی ہے، اسی سمندر سے کالی بدلیاں اُٹھتی ہیں، پھوار پڑتی ہے، ندی نالے بہانے والی، چھتیں ٹپکانے والی مردہ زمین میں جان لانے والی برکھا رُت آتی ہے۔ ساون کی بہاریں، گرمی کی اُمس، سردی میں

بدن کا ٹھٹھرنا۔ دِوالی، ہولی، شادی، بیاہ اور ان سب کے باجے گاجے، ناچ رنگ، کھانے پینے، پھر رنگین لباس، بھاری گہنے، پنڈت، ملّا، نجومی، جادوگر، تعویذ، ٹوٹکے، منتیں، دعائیں اور ان سب چیزوں کے ساتھ چلنے والی امیری، غریبی، محل، جھونپڑے، شاہی، فقیری، خون کی ندیاں، انقلاب تاریخوں کے سنہری اور خونیں ورق اور ان ورقوں میں دبی ہوئی بے جان، اُبھرنے کی کوشش کرتی ہوئی زندگی —— ہمارے پُرانے شاعروں کے یہاں یہ سب کچھ ہے۔ اور اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ یہ شاعری اکثر جگہ زندگی سے بھاگنے کی کوشش کرنے پر بھی، اُس سے بھاگ نہیں سکی۔ زندگی جیتے جی کسی کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اور مرنے والوں کے لئے زندگی اور موت برابر ہے۔ ہمارے شاعر بھی جب تک زندہ رہے، زندگی سے بھاگ نہ سکے۔ اُن کے شعر اُن کی اپنی اور اُن کے زمانے کی زندگی کی تصویریں ہیں —— "شاعری کا ترقی پسند عنصر"

محمد حسن عسکری

ذکرِ انور

بہ سعیِ بلیغ و فکرِ عمیق بندۂ کمترین حافظ محمد متین

حمد بیحد اس خدائے پاک کو   نورِ ایماں جس نے بخشا خاک کو

بعد حمد و ثنائے واحد القہار و نعتِ احمد مختار و صلوات و سلام بر آل و اصحاب حقیر فقیر کج لج زبان ننگِ اسلاف بندۂ ناچیز و کمترین حافظ محمد متین خلف الصدق حضرت والد ماجد مولوی نور علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ منصرم پنشن یافتہ و اسیسر و ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ رئیس اعظم قصبہ چونڈھری تحصیل کھکیٹر ضلع [1] خدمت میں ناظرین با تمکین کے عرض کرتا ہے کہ یہ پُر تقصیر مدت دراز سے اِس تمنا میں گھلتا تھا اور اِس لگن میں جلتا تھا کہ کسی طور حالات بے کم و کاست اس خاندانِ مشہورِ دیار امصار و معروف خلق و انام کے۔ اور اس کے واقعات صحیح و کارہائے نمایاں جن کی بدولت اس کو یہ عزت و افتخار نصیب ہوا معہ سلسلۂ نسبِ محققہ اور کیفیت مولد و مسکن بہ اضافہ چشم دید واردات حیطۂ تحریر میں ضبط ہو جائیں تاکہ دشمنانِ بد انجام کی زبانِ بے لگام بند ہو اور چشمِ بینا کو نور حاصل ہو۔ مقصود اس سے آگاہئ خاص و عام

[1] سوراخ تھا اس لئے نام نہ پڑھا جا سکا۔

اور بالخصوص خیر خواہئ اہلِ اسلام تھا۔ زمانے کی حالت دگر گوں ہے۔ نہ دلوں میں خوفِ خدا ہے نہ رسول کی محبت۔ نہ چھوٹوں کو بڑوں کا پاس اور نہ بڑوں کو چھوٹوں کا خیال۔ اپنے بیگانے ہوئے ہیں۔ عالم نفسی نفسی کا طاری ہے۔ دنیا کو کیا روئیں اپنا ہی غم کھائے جاتا ہے۔ یہ خاندان جو کل تک ماویٰ و ملجا اقارب و اجانب کا تھا اور جس کی دھاک قریب و دور بیٹھی ہوئی تھی۔ آج اسے نکبت نے ایسا گھیرا ہے اور ادبار نے ایسا ڈیرا ڈالا ہے کہ ہر اپنا پرایا در پے آزار بلکہ مارِ آستین بنا ہوا ہے۔ جو کل تک جوتیوں میں بیٹھنا فخر سمجھتے تھے آج منہ آتے ہیں۔ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ۔ فَاعْتَبِرُوْا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ۔ جو ساکھ برادری میں تھی وہ گئی تو گئی۔ دُھنے جلاہے بلکہ رعیّت کے لوگ چوڑھے چمار تک آمادۂ شر و فساد رہتے ہیں۔ جن کی عورتیں چوبیس گھنٹے آٹھ پہر خدمت کے لئے حاضر رہتی تھیں۔ اب اسے باعثِ شرم و عار سمجھتے ہیں اور اپنی عورتوں سے شریف زادیوں کی طرح پردہ کراتے ہیں سلام کرنا تو درکنار سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ کہاں تک لکھوں دل میں غم و غصّہ کا دریا موجزن ہے۔ لکھنے بیٹھوں تو دفتر کافی نہ ہوں ناچار لہو کے سے گھونٹ پی پی کر چپ ہو رہنا پڑتا ہے۔ مختصر یہ کہ چودھویں صدی ہے۔ قیامت کا قرب ہے یہ سب آثار اسی کے ہیں خاندان کے نوجوانوں پر نظر ڈالتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے خاندان کی دولت و ثروت نہیں رہی تھی تو عزّت آبرو تو برقرار رہتی مگر اس کا ذرّہ بھر خیال نہیں سب اپنی دُھن میں مست ہیں رذیلوں کی شوریدہ سری اور فتنہ انگیزی سے ایسے خائف ہیں کہ ایک لفظ منہ سے نکالنے نہیں دیتے بالکل بلّی کا گھر بن گئے ہیں۔ اس سے چوڑیاں پہن کر گھر ہی میں بیٹھ رہیں بلکہ عورت ہوتے تو کسی کا گھر تو بستا اب تو اس کام کے بھی نہیں اور باپ دادا سے انہیں مطلب ہی کیا جیسے خود پیدا ہو گئے تھے شب و روز یہی فکر دامن گیر ہے کہ آج موئے کل دوسرا دن۔ میری آنکھیں بند ہوئیں تو کوئی یہ بھی نہ جانے گا کہ بزرگوں کی ہڈیاں کس گڑھے میں پڑی ہیں یہی عجلت تھی کہ جو سانس آتا ہے اسے غنیمت شمار کیا جائے اور جس طرح بن پڑے حالات خاندان کے جو کچھ بزرگوں سے سننے میں آئے یا خود

تحقیق کے یکجا ضبط ہو جائیں تا کہ نام اس دودمان عالی مرتبت کا صفحہ روزگار پر باقی رہے اور کیفیت دوام کی پیدا ہو میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں میرے بعد چاہے باپ دادا کا نام باقی رکھیں چاہے بھلا دیں لیکن مکروہات دنیوی اور اہل بغی وعناد کی شرانگیزی اتنی مہلت ہی نہ دیتی تھی کہ اس فرض عظمیٰ کیطرف توجہ کر سکوں بالآخر بعد کاوش بسیار و انتظار بیشمار بہ توفیق ایزدی یہ امر خاطر خواہ وحسب مراد بمصداق کُلُّ اَمْرٍ مَرْهُوْنٍ بِاَوْقَاتِهَا ظہور میں آیا ہر چند کہ خاندان کا نام حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی بدولت روشن ہوا اور ان ہی کے دم سے یہ عزت وتوقیر قائم رہی لہٰذا اس رسالہ کا نام بھی اُن ہی کے نام نامی کی مناسبت سے ذکرِ انور قرار پایا۔

وَمَا تَوْفِيْقِىْ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

بزرگوں کا مسکن و مولد قدیم سے قصبہ جونڈھری رہا ہے یہ قصبہ بلحاظ آب وہوا اور اپنی سرسبزی وشادابی کے یگانہ ہے پُر رونق اور پُر فضا تین طرف بھوڑ کا میدان ہے جس کی وجہ سے گرمیوں کی راتیں بہت سُہانی ہوتی ہیں اور جاڑوں میں دھوپ علی الصباح پھیل جاتی ہے۔ دور دور تک کھجُور کے درخت چلے گئے ہیں جو چاندنی میں عجب بہار دکھاتے ہیں تربوز بکثرت ہوتے ہیں اور جھڑبیری کے بیر اور گولر تو یہاں کے دور دور مشہور رہیں مولوی عبد الغفور صاحب اس علاقے کے تحصیلدار رہتے عجب خوش خلق اور نیک سیرت انسان تھے جب دَورے پر آتے تھے۔ ہمارے ہی یہاں قیام کرتے تھے اور دونوں چیزیں باصرار منگوا کر کھاتے تھے۔ میں عرض کیا کرتا تھا کہ صاحب ہمیں کیوں شرمندہ کیا کرتے ہیں کچھ اور فرمایئے تو حاضر کیا جائے مگر ہمیشہ بکمال خندہ پیشانی فرماتے تھے بھئی حافظ صاحب یہ سب باتیں نہ کیا کرو کھاتے جاتے تھے اور سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے جاتے تھے کسی زمانے میں یہ قصبہ ملیو سواد اور رشک جناں تھا اسے راجہ جونڈھیر اہل نے آباد کیا تھا سننے میں آیا ہے کہ کورو پانڈو کی راجدھانی بھی رہ چکا ہے اسلامی عہد میں بھی یہاں حاکم رہتا تھا اور ایک مرتبہ شکار کھیلتے ہوئے راستہ بھول گئے تھے تو انہوں نے ایک شب یہاں قیام کیا تھا اور قصبے کو بہت پسند فرمایا تھا چنانچہ جانب شمال دو اونچے اونچے ٹیلے موجود

ہیں جہاں پہلے شاہی قلعہ تھا خود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ لوگ اپنا گھر بنانے کو اس میں سے اینٹیں نکال نکال کرلے جایا کرتے تھے اور نیچے کنکروں میں روپے پیسے تلاش کرتے پھرا کرتے تھے بلکہ ایک بھنگن صبح سویرے کوڑا اُٹھانے جارہی تھی اُسے ایک چاندی کی ہنسلی ملی۔ بعد میں لوگوں نے بہت کچھ ڈھونڈا ڈھانڈا مگر پھر کوئی چیز دستیاب نہ ہوئی ٹیلوں کے دائیں جانب کھیت کی مینڈھ پر محکمہ آثارِ قدیمہ کا تختہ گڑا ہوا ہے کہ جو کوئی ان عمارتوں کو نقصان پہونچانے کی کوشش کرے گا وہ مستوجب سزا کا ہوگا اپنی یاد کی بات ہے کہ قوم کے لوگ بکثرت آباد و شاد تھے بازار میں ہر وقت چہل پہل رہتی ہے اوروں کا تو ذکر کیا صرف بزازوں کی چار دُکانیں تھیں۔ اور ایک عطار بھی تھا قانون گو کا صدر مقام تھا اور ایک پولس کی چوکی بھی تھی اب اس عمارت میں پرائمری سکول آگیا ہے ان گئے گذرے حالوں پر بھی رونق باقی ہے آبادی ساڑھے تین سو ہے باشندے مرفہ حال۔ پابند وضع، وبندار اور غریبی مزاج ہیں ایک مقام شکر کا یہ ہے کہ اس دورِ ادبار و انحطاط میں بھی کہ جب اسلام کو بلاؤں نے گھیرا ہے اور اعدائے دین کا نرغہ ہے قصبے میں بحمد اللہ مسلمانوں کا رعب ہنود پر اسی طرح قائم ہے حالانکہ تعداد میں وہ مسلمانوں کے برابر ہیں اور مسلمانوں میں سے اکثر ان کے مقروض بھی ہیں مگر یہ ہمت نہیں کر سکتے کہ برات باجے کے ساتھ نکال لیں یا مسلمانوں کے محلّے میں ہولی کھیل لیں پہلے تو پالکی میں دلہن لانے کی مجال بھی نہ تھی مگر اس زمانے میں جو کچھ ہے وہی بہت غنیمت ہے۔ جب تک کچھوّ بھٹر بوجا زندہ تھا اس کے گڑ کے سیو بھی بہت قابلِ تعریف ہوا کرتے تھے۔

الغرض اب میں اصلی مقصد کی طرف رجوع کرتا ہوں ہمارے مورثِ اعلیٰ کا نام قبولِ اسلام سے پیشتر بھُلّی مل تھا قوم ویش گوت اہلِ دولت و ثروت تھے اور قصبے میں ان کا بڑا اثر تھا ان کے آبا و اجداد کا وطنِ مالوف فی الحقیقت کاشی بنارس تھا اور ذات برہمن تھی بوجہ وبا وطن چھوڑنا پڑا اور یہاں آکر آباد ہوئے چونکہ معیشت کے لئے سامان خورد و نوش کی دکان کرلی تھی اس لئے رفتہ رفتہ ویشوں میں مل جل گئے اور وہیں شادی بیاہ بھی ہونے لگا

اسلام لانے کے بعد شیخ قبولی کے نام سے موسوم ہوئے حاسدین و بدخواہ یہ تہمت طرازی کرتے ہیں کہ حاکم کے ڈرانے دھمکانے سے مسلمان ہوئے مگر یہ محض ان کی افترا پردازی اور بد اندیشی ہے۔ شیخ قبولی ان کی افواہ کے بموجب عالمگیر کے زمانے میں نہیں بلکہ جہانگیر کے زمانے میں مشرف بہ اسلام ہوتے تھے اور تبدیلی مذہب کا سبب تخویف و تحریص قطعاً نہیں تھا۔ شیخ کو سنِ طفولیت ہی سے اہلِ اسلام سے مناسبتِ قلبی اور رغبتِ دلی تھی اور ان ہی کے ساتھ مجالست و موانست کو پسند کرتے تھے عمر کے ساتھ ساتھ یہ شغف بھی بڑھتا چلا گیا خصوصاً اولیاء اللہ سے بہت ارادت و عقیدت تھی جب کبھی کسی خدا رسیدہ بزرگ کا گذر ہوتا تو فوراً حاضرِ خدمت ہوتے اور جتنے دن وہ قیام کرتے دونوں وقت اپنے آپ کھانا پہنچاتے۔ ایک مرتبہ علاقے کا حاکم کہ مردم آزار و بد طینت تھا آمادۂ مخاصمت ہوا اور کوئی طریقہ گزند پہنچانے کا نہ چھوڑا شیخ کے لئے عرصۂ حیات تنگ ہوا اور زندگانی وبالِ دوش ہوئی آخر ایک شب بہت خضوع و خشوع سے دعا مانگی اور حضرت پیرانِ پیر دستگیر سے رجوع کر کے سوئے۔ خواب میں بشارت ہوئی اے شخص وسواس کو دل میں جگہ نہ دے اُٹھ اور اسلام لا، سب مشکلیں آسان ہونگی فوراً بیدار ہو کر غسل کیا اور باقی رات توبہ و استغفار میں گزاری فجر کے وقت مسجد میں پہنچکر ایمان لائے اُسی شب حاکم نے بھی خواب دیکھا کہ ایک بزرگ نورانی شکل کے تشریف لائے ہیں، چہرے پر آثار غیظ و غضب کے ہیں اور پیشانی عرق آلود ہے، بال داڑھی کے بکھرے ہیں اور فرماتے ہیں تو بیگناہوں اور معصوموں کو ستاتا ہے اس کا نتیجہ اپنے حق میں اچھا نہ پائے گا۔ وہ شخص صاحبِ ایمان ہے اُس سے معافی مانگ اور توبہ کر ورنہ دن قیامت کے دیدارِ رسول سے محروم رہے گا۔ حاکم بہت مخوف ہوا اور اپنے انجام سے لرز گیا۔ صبح ہوتے ہی شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر خواستگار معافی کا ہوا اور اپنے افعال سے تائب ہوا۔

ہر چند کہ یہاں الف سے لیکر یے تک سلسلہ بہ سلسلہ تمام افرادِ خاندان کا تذکرہ مقصود نہیں بلکہ صرف اہم اور ضروری واقعات کو یکجا کرنا مدِ نظر ہے، لہذا چھوٹی چھوٹی باتوں کو چھوڑا جاتا ہے

کیونکہ اُن میں سے اکثر کو تو شجرے سے معلوم کیا جا سکتا ہے جو بحمد اللہ بہمہ حسن و خوبی طبع ہو چکا ہے اگر تفصیلات بیان کرنے بیٹھوں تو دفتر کافی نہ ہوں۔

شیخ قبولی کے پوتے شیخ مُرادی شاہ عالمگیر کے ساتھ مہم دکن میں شامل ہوئے اور انتظام رسد کا اُن کے سپرد تھا۔ ہر قسم کی تکلیفیں اور مصائب برداشت کئے، یہاں تک کہ بعض وقت تو گھوڑے کی لید نچوڑ نچوڑ کر حلق تر کرنا پڑا، مگر بادشاہ کا ساتھ نہ چھوڑا، اس جانفشانی اور وفاداری کے صلے میں ایک قطعہ زمین اور عہدہ پٹواری کا پایا۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جس طرح آج کل اس عہدے کی قدر و منزلت نہیں رہی اور بے وقعت ہو گیا ہے یہ بات شاہی عہد میں ہرگز نہ تھی۔ اُس زمانے میں پٹواری رُتبہ وہی تھا جو آج کل تحصیلدار یا حاکم علاقہ کا ہوتا ہے جس شخص کو یہ عہدہ ملتا اُسے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ چنانچہ یہ گمان نہ کیا جائے کہ اس میں خاندان کی تحقیر ہے، بلکہ اس کے برخلاف یہ تو جائے فخر و ناز ہے، پہلے پٹواری کے اختیارات اتنے تھے کہ اب حاکم علاقہ کے بھی نہیں ہوتے، مختصراً یہ کہ پٹواری اپنے حلقے میں مالک سیاہ و سفید کا ہوتا تھا اور اُس کے سامنے کسی کو مجال دم مارنے کی نہ ہوتی تھی۔ یہ واقعہ ہر خاص و عام کو معلوم ہے کہ غدر سے پہلے شیخ دلاور بخش پٹواری تھے۔ مزاج کے بہت مغلوب الغضب تھے اور تن و توش بھی ایسا پایا تھا کہ جب شام کو اپنے دستور کے مطابق مکان کے سامنے کیکر کے درخت کے نیچے چارپائی پر بیٹھتے تو یہ معلوم ہوتا جیسے کوئی شیر نر بیٹھا ہے۔ اُن کے متعلق مشہور ہے کہ ایک شخص بد طینت و بد اندیش تھا جو کسی طرح مخالفت و معاندت سے باز نہ آتا تھا، آخر جب لاچار ہوئے تو ایک کوٹھڑی میں اُپلوں کا ڈھیر کر کے جلوا دیا، جب خوب دھوآں بھر گیا تو اُس شخص کو بلوا کر دو چماروں کو حکم دیا کہ کوٹھری میں چھت سے اُلٹا لٹکا دیں۔ دوپہر تک وہ اسی طرح لٹکا رہا۔ اور جب اُسے اُتارا تو وہ تقریباً نیم مردہ تھا، اور رو رو کر معافی مانگ رہا تھا۔ اس کے بعد اُس کی کبھی ہمت نہ ہوئی کہ سرکشی یا حکم سے سرتابی کرے، اسی طرح یہ بھی مشہور و معروف واقعہ ہے کہ یہ لال محل والے جو اب اتنا اتراتے ہیں اور مشیخت بگھارتے ہیں ان کے

خاندان میں کسی کی شادی تھی۔ جب دُلہن کی پالکی سامنے سے گزری تو حُسنِ اتفاق سے شیخ دلاور بخش اپنے حسبِ معمول کیکر کے نیچے بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ پالکی دیکھتے ہی طیش میں آ کر کھڑے ہو گئے، مارے غصّے کے چہرہ لال بھبُوکا ہو رہا تھا۔ آواز تو اُن کی تھی ہی بہت گرجدار، معلوم ہوتا تھا کوئی شیر چنگھاڑ رہا ہے۔ زور سے ڈانٹا، اچھا اب انکی یہ ہمت بھی ہوئی کہ ہمارے سامنے سے دُلہن کو پالکی میں سوار کر کے لے جائیں، سڑک پر راستہ روک کر کھڑے ہو گئے کہ خبردار جو قدم آگے بڑھایا، آخران لوگوں کو اپنی برات پھیرنی پڑی اور دوسرے راستے سے لے گئے غرض کہنے سے یہ ہے کہ ایک زمانہ تھا کہ جب خاندان کا یہ دبدبہ اور اثر تھا، اور آج وہی لوگ برابری کے دعویدار ہیں۔ بلکہ تحقیر و تذلیل کے کوشاں رہتے ہیں۔ مگر بات کہنے کا فائدہ جب ہی ہے کہ اُس سے عبرت حاصل کی جائے۔ ورنہ لاکھ طوطے کو پڑھایا پھر بھی حیوان ہی رہا۔ یہی بات قوموں کے حال اور ان کے عروج و زوال پر بھی صادق ہے۔ گو عزت اور ذلت سب خدا کی طرف سے ہے مگر خدائے تعالیٰ خود فرماتا ہے۔ کہ نہیں بدلی ہم نے کسی قوم کی حالت جب تک کہ نہیں چاہا خود اُس نے۔ خیر اپنی تو وہی بات ہے کہ گذر گئی گذران کیا جھونپڑی کیا میدان۔ یہ سب نوجوانوں کو سمجھنا چاہیئے۔ لیکن اُنہیں تو خدا ہی عقل دے تو دے۔ وَاللّٰہُ عَلیٰ کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر۔ اُسی کے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔ کیا عجب وہی دن پھر آئیں۔

شیخ دلاور بخش کے چھوٹے بھائی سعادت بخش تھے۔ انہوں نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی صوفی منش اور آزادہ رو طبیعت پائی تھی۔ سارا وقت اہل اللہ کی خدمت اور صوفیا کے ساتھ مجالست میں گذرتا تھا۔ اسی دُھن میں پاپیادہ چلتے چلتے بنارس جا پہنچے تھے۔ چنانچہ اسی مناسبت سے اُن کا نام شیخ بنارسی پڑ گیا تھا۔ وجیہہ صورت اور جامہ زیب تھے۔ کاکلیں بڑھا رکھی تھیں اور آخر میں مہندی کا خضاب کرنے لگے تھے۔ طبع میں سخن سنجی کے ساتھ نغز گوئی کا مادہ بھی تھا۔ عجب پاکیزہ اور لطیف شعر نکالتے تھے۔ زمینیں ہمیشہ شگفتہ پسند کرتے تھے کہتے تھے کہ مجھے ایک درویش نے اپنا جھوٹا پانی دیا تھا۔ جس کی بدولت شعر گوئی کا یہ سلیقہ حاصل ہوا۔ تخلّص

زندگی کرتے تھے۔ ایک دیوان سبؔ رس کے نام سے ترتیب دیا تھا۔ جس میں یہ رعایت ملحوظ رکھی تھی کہ سعادت کے سؔ اور بخش کے ب کو ملانے سے سب بنتا ہے۔ نہ جانے وہ دیوان کہاں اور کس طرح تلف ہوگیا۔ اگر موجود ہوتا تو یقیناً ایک درجہ خاص کا مستحق ٹھہرتا۔ دنیا سے تو کنارہ کشی اختیار کر ہی لی تھی۔ کیا تعجب ہے کہ اپنی دریادلی کے جوش میں اور چیزوں کی طرح دیوان بھی کسی کو بخش دیا ہو۔ اور اس نے اپنے نام سے طبع کرا کے اُن کے طفیل بقائے دوام حاصل کی ہو۔ بزرگوں سے اکثر اُن کے شعر سُننے میں آئے ہیں۔ اب صرف ایک یاد رہ گیا ہے وہی تبرکاً نقل کئے دیتا ہوں ؎

یار میرے تپنگ اُڑایا کر — یہ کٹی وہ کٹی بتایا کر

ایک مصرع اور یاد آگیا۔

لب کی سُرخی مجھے دکھایا کر

سرکار انگریزی کے تسلط کے بعد بھی یہ عہدہ اُسی طرح برقرار رہا۔ بلکہ خاندان کے وقار میں روز افزوں اضافہ ہُوا۔ غدر میں پردادا صاحب مرحوم یعنی منشی برکت علی نے ایک انگریز افسر کی جان بچائی تھی۔ وہ کوئی بہت بڑا فوجی افسر تھا اور باغیانِ سرزندہ دشتی اُسے زخموں سے نڈھال مردہ جان کر ایک درخت کے نیچے چھوڑ گئے تھے۔ مگر ابھی اس میں ایک رمق جان باقی تھی۔ زخموں کے ضعف اور پیاس کی شدّت سے جانکنی کی حالت تھی۔ اور سوکھی ہوئی زبان لبوں پر حسرت سے ملتا تھا کہ پردادا صاحب کا اُدھر سے گذر ہوا۔ آواز کراہنے کی سُن کر متوحش ہوئے اور چونکہ حالت زمانے کی مخدوش تھی۔ لہذا درختوں کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھے۔ پاس پہنچے تو یہ منظر دیکھا۔ چاروں طرف دیکھ کر اطمینان کرلیا۔ کہ کوئی نہیں ہے تو جاکر افسر کو درخت کے سہارے سیدھا بٹھایا۔ اور حال پوچھا۔ اُس کے لبوں سے سوائے لفظ پانی کے اور کچھ نہ نکلتا تھا۔ جنگل بیابان میں پانی ملنا محال تھا۔ باغیوں کے ڈر سے کاشتکار کھیت چھوڑ چھاڑ کر بھاگ گئے تھے۔ آخر بعد خرابیٔ بسیار ایک کچّا کنواں دستیاب ہُوا۔ تو اب یہ مشکل ہے کہ

پانی کیسے نکالا جائے۔ سوچنے سے ایک ترکیب ذہن میں آئی۔ پیپل کے چوڑے پتّے لیکر ایک
ڈونا تیار کیا اور اپنا صافہ پھاڑ کر اُس میں بطور رسّی کے باندھا۔ اور اسی تدبیر سے پانی نکال کر افسر
کو پلایا۔ پانی پی کر جان میں جان آئی اور وہ بولنے کے قابل ہوا۔ تو کہا دیکھو جلدی کرو۔ میرے
زخموں سے خون بند نہیں ہوا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اب میں زندہ نہیں بچ سکتا۔ تم نے میرے
اُوپر بڑا احسان کیا ہے۔ اور میں اس صلے میں تمہیں ایک تحریر دینا چاہتا ہوں کوئی چیز دو۔ کاغذ
قلم تو وہاں مل نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ ایک پیپل کے پتہ پر اُس نے انگلی اپنے خون میں ڈبو ڈبو
کر ایک سارٹی فیکٹ لکھ کر پردادا صاحب کو دیا۔ لکھتے ہی زمین پر بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اور
تھوڑی دیر بعد جان دیدی۔ اُس نے لکھا تھا کہ اس شخص نے میری جان بچائی ہے۔ اس لئے
اس کا اور اس کی اولاد در اولاد کا احسان سلطنتِ برطانیہ پر ہمیشہ قائم رہے گا۔ اور کبھی نہیں
بھلایا جا سکتا۔ سلطنتِ برطانیہ پر اس کی اولاد کی پرورش فرض ہو گی۔ اور جب کبھی کوئی اس
تحریر کو لیکر حاضر ہو گا۔ اُس کو فوراً ملازمت دی جائے گی۔ مگر افسوس ہے کہ دوستان دشمن صفت
اور محبّان عقرب کیش کی نیش زنی کی بدولت یہ سارٹی فیکٹ رہنے نہ پایا۔ اور ان حضرات
کی مہربانی سے سے جو چوری ہوئی تھی اُس منجملہ زیورات پارچہ جات وغیرہ کے یہ نادر و نایاب
سند بھی جاتی رہی کہ جو مثل ایک گنجینۂ زر کے حفاظت سے رکھنے کے قابل تھی۔ خصوصاً اس کی
گمشدگی کا رنج اُس وقت ہوتا ہے۔ کہ جب کوئی ضرورت آپڑتی ہے۔ مثلاً اُس وقت کہ جب
کلکٹر سفلہ پروری پر اُتر آیا تھا۔ اور نمبرداری لال محل والوں کی طرف منتقل کرا دی تھی۔
اگر یہ سارٹیفیکٹ ہوتا اور سلطنتِ برطانیہ پر اپنے حقوق ثابت کئے جاتے۔ تو ناممکن تھا کہ سخت
سے سخت حاکم بھی اِس تحریر کا پاس نہ کرتا۔ اسی کی بدولت پردادا صاحب کو صدر مقام میں
نقل نویسی کی خدمت ملی تھی۔ اس کے علاوہ اور بہت سی اسناد و سارٹی فیکٹ پردادا صاحب
دادا صاحب مرحوم و مغفور اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حاصل کئے جو ایک سے ایک
بڑھ کر ہیں۔ اگر اور کسی کے پاس ہوتے۔ تو بلا مبالغہ لوبان کی دھونی دے دے کر رکھے

جاتے۔ اِن میں سے گاشٹن صاحب بہادر کا سارٹی فیکٹ ایک ندرت خاص رکھتا ہے۔
گاشٹن صاحب کلکٹر ضلع تھے۔ اور بعد میں صاحب گورنر کے ایڈی کانگ ہو گئے تھے۔ اس
سارٹی فیکٹ کا ادنیٰ کرشمہ یہ ہے اور قابل یاد رکھنے کے ہے کہ چچا صاحب مرحوم اسے لے کر
کلکٹر کے پاس گئے۔ وہ ابھی تازہ ولایت تھا۔ اور مزاج میں شیخی باقی تھی۔ اردلی نے دروازے
پر روک لیا۔ کہ صاحب کسی سے نہیں ملتے ہیں۔ بہت حجت اور تکرار کے بعد چچا صاحب نے
کہا کہ اچھا۔ مجھے نہیں جانے دیتے تو کم سے کم یہ سارٹی فیکٹ ہی پیش کر دو اردلی مان گیا
اور سارٹی فیکٹ لیکر اندر چلا گیا۔ اِسے دیکھتے ہی صاحب نے چچا صاحب کو اندر بلا لیا۔ بلکہ
اردلی کو بہت ڈانٹا کہ تم نے انہیں کیوں نہیں آنے دیا۔ صاحب نے بڑے تلطف و مہربانی
کا برتاؤ کیا اور غور سے سب کچھ سنا۔ اور کہا کہ ہمیں بڑا افسوس ہے کہ تمہاری عمر زیادہ ہو گئی
ہے۔ اس لئے جگہ نہیں دے سکتے البتہ اگر تمہارا کوئی لڑکا ہو تو بتاؤ چچا صاحب کے اولاد
نرینہ تھی ہی نہیں۔ اِس لئے کیا ہو سکتا تھا۔ مگر صاحب آخر تک کہتا رہا ہمیں بڑا افسوس ہے
ہم تمہارے لئے کچھ کر نہیں سکتے۔ یہ یقینی ہے کہ سارٹی فیکٹ کا صاحب پہ اتنا اثر ہوا تھا کہ
اگر چچا صاحب کا کوئی لڑکا ہوتا۔ تو اُسے ضرور بالضرور کوئی عمدہ ملازمت ملجاتی یہ سارٹیفیکیٹ
سارٹی فیکٹوں کے مجموعے میں چھپا ہوا شامل ہے۔ اور ہر وقت ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ حاکموں
کی اس عنایت کا راز یہی ہے کہ ہمارا خاندان ہمیشہ وفادار رہا۔ اور حاکم وقت کی فرمانبرداری
کو جزوِ ایمان جانا ہے۔ بلکہ حکم حاکم کو امر اللہ اور امر رسول کے بعد برحق سمجھا ہے۔ ہمیں فخر ہے
کہ ہمارے خاندان کا کوئی فرد خلافت کے فتنے یا گاندھی کی شورش سے اثر پذیر نہیں ہوا اور
ہمیشہ سرکار کا ساتھ دیا۔ خلافت والے ایک مرتبہ قصبے میں چندہ مانگنے آئے تھے۔ مگر والد صاحب
قبلہ نے صاف انکار کر دیا۔ کہ ہم جس کا نمک کھاتے ہیں اُس کے ساتھ غداری نہیں کر سکتے۔
نہ صرف اپنے آپ چندہ دیا بلکہ اوروں کو بھی باز رکھا۔ سوائے چند مفسدہ پرداز ہندوؤں کے
جبکے ہاں وہ لوگ آکر مقیم ہوئے تھے۔ گو اب قصبے کے زیادہ تر ہندو کانگرسی خیال رکھتے ہیں۔

حتیٰ کہ لال محل والے جو خود ملازم سرکار ہیں۔ جب گھر آتے ہیں تو باتیں مخالفانہ کرتے ہیں۔ مگر وہی مثل ہے کہ کوؤں کے کوسنے سے ڈھور نہیں مرا کرتے۔ کسی کا کیا بگاڑتے ہیں اپنی دنیا اور عاقبت دونوں خراب کرتے ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہمارے خاندان میں ابھی تک کسی نے یہ نمک حرامی نہیں کی اسی وجہ سے ہمیشہ ہماری سرپرستی ہوتی رہی۔ اور انشاء اللہ جاری رہے گی۔

دادا صاحب نے اپنے والد کی خدمات کے صلے میں گرداور قانون گو کا عہدہ پایا قصبے کی عیدگاہ دادا صاحب ہی کی بنائی ہوئی ہے۔ اب دعویدار پیدا ہو گئے ہیں کہ ہم نے بھی چندہ دیا تھا مگر یہ سراسر جھوٹ ہے۔ سارا خرچ عیدگاہ کی تعمیر کا دادا صاحب نے اپنے ذمے لیا تھا۔ اور ہمارا حق عیدگاہ پر بہ نسبت اوروں کے زیادہ ہے اور در اصل ہمیں اس کا متولی ہونا چاہیئے۔ اگر کوئی ثبوت چاہے تو ہمارے پاس ثبوت بھی موجود ہے۔ جتنا روپیہ عیدگاہ کی تعمیر پر خرچ ہؤا۔ دادا صاحب اُس کا تمام و کمال حساب لکھتے گئے تھے۔ اور وہ محفوظ ہے۔ اُس کی موجودگی میں اگر کوئی دعویٰ کرے تو وہ باطل ٹھیرے گا۔

اب میں حضرت والد ماجد کے ذکرِ انور بلکہ نورٌ علیٰ نور کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ حالانکہ اُنھوں نے ابتدا محض عرائض نویس کی حیثیت سے کی تھی، مگر آخر میں منصرمی کے عہدے تک پہنچے، اور پنشن لینے کے بعد بھی سرکار نے اسیسر اور ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ نامزد کیا۔ افترا پردازوں نے یہ بے پر کی اُڑائی ہے کہ وہ خدانخواستہ خاکم بدہن رشوت لیتے تھے حقیقت تو یہ ہے کہ اُس ذاتِ بابرکات کے متعلق ایسا تصوّر کرنا بھی گناہ میں داخل ہے۔ خود رشوت لینا تو کیا معنی، اگر معلوم ہو جاتا کہ یہ شخص رشوت لیتا ہے تو اُس سے ملاقات ترک کر دیتے تھے۔ ہاں اگر کوئی از راہِ خلوص نذرانہ یا تحفہ پیش کرتا تو قبول کرنے میں تامّل نہ کرتے تھے کہ یہ سُنّتِ رسول ہے۔ پابندِ شرع ایسے تھے کہ کبھی تہجد تک قضا نہ کی، ایک مرتبہ کلکٹر سے اسی بات پر اختلاف ہو گیا تھا کہ سرکاری کام چھوڑ کر نماز پڑھنے چلے گئے تھے، مگر پھر وہ اُن کا قائل بھی بہت ہو گیا

تھا حضرت شاہ مبارک حسین سجادہ نشین چرولی شریف سے بیعت تھے، اور اُن کے خاص الخاص مُریدوں میں شامل تھے۔ سنا ہے کہ اپنا خلیفہ بھی بنانا چاہتے تھے مگر والد صاحب نے ہی عذر کر دیا۔ حضرت کے ملفوظات میں درج ہے کہ وصال کے وقت والد صاحب ہی کو یاد کر رہے تھے اور بار بار فرماتے تھے کہ اگر وہ یہاں ہوتا تو تجہیز و تکفین کا ذمّہ خود لیتا اور کسی کو ہاتھ نہ لگانے دیتا۔

اور والد صاحب سے متعلق کرامتیں تو اکثر ہیں جو حضرت سے ظہور میں آئیں۔ یہ سب حضرت کے ملفوظات میں مل سکتی ہیں۔ صرف ایک بطور مثال کے پیش کرتا ہوں۔ ایک مرتبہ والد صاحب زیارت کے لئے تشریف لئے جا رہے تھے، مگر آسمان ابر آلود تھا اور کیچڑ اس قدر تھی کہ گھوڑے کے قدم نہ اُٹھتے تھے، آخر ایک جگہ گھوڑا دلدل میں پھنس ہی گیا، وہاں نہ آدمی نہ آدم زاد، والد صاحب حیران و پریشان کھڑے دعائیں مانگ رہے تھے کہ یکایک بڑے زور سے بجلی چمکی کہ آنکھیں چُندھیا گئیں۔ جب آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ گھوڑا دلدل سے باہر کھڑا ہے۔ خدا کا شکر کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ اور حضرت کی خدمت میں سارا ماجرا عرض کیا۔ حضرت مریدوں کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور خاموش ہو رہے۔ ایک مُرید نے کُل واقعہ سُنایا۔ کہ ٹھیک جس وقت والد صاحب اس مصیبت میں مبتلا تھے۔ حضرت پر ایک تشنّجی کیفیت طاری ہوئی۔ اور فوراً چادر اوڑھ لی جب چادر اُتاری تو مسکرا رہے تھے۔ لوگوں کے دریافت کرنے پر بتایا کہ ہمارا ایک مُرید دلدل میں پھنس گیا تھا۔ اُسے نکال کر آرہے ہیں۔ اور واقعی حضرت کی کمر پر گھوڑے کی ٹاپوں کے نشان موجود تھے۔ یہی خصوصیت جو والد صاحب کو حضرت سے حاصل تھی۔ اسی کی بنا پر

(رسالے کے باقی صفحے مل نہیں سکے جب ملیں گے تو پیش کئے جائیں گے)

کنہیّا لال کپُور

بلیک اینڈ وائٹ

"تو پہلی بات جو میں ہندوستانیوں کے متعلق جانتی ہوں" اُس نے چائے بناتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے کہ تمام ہندوستانی چور ہوتے ہیں۔"

"چور!" میں نے دُزدیدہ نگاہوں سے اُس کے نیم برہنہ سینے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں میڈم؟"

اُس نے میری اس حرکت کو نظر انداز نہ کرتے ہوئے دُہرایا "چور۔ سو فیصدی چور"

دل ہی دل میں مجھے اُس کی بیباکی پر غصہ آیا۔ کتنا سطحی مشاہدہ ہے اس عورت کا۔ میں نے سوچا۔ اور جب یہ لندن واپس جائے گی۔ تو ہندوستانیوں کے خلاف اس قسم کی غلط افواہیں پھیلا کر ہر انگریز کو بدظن کرنے کی کوشش کریگی۔ نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ تمام ہوٹلوں کے مالک اپنے ہوٹلوں پر یہ سائن بورڈ لٹکا دیں گے۔ "اس ہوٹل میں ہندوستانیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔"

میں نے صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے کہا۔ "یقیناً۔ میڈم! آپ زیادتی کر رہی ہیں دیکھئے نا اگر آپ کا بیرا سبزی یا گوشت خریدتے وقت چار۔ پانچ آنے کی رقم ہضم کر جائے۔ یا کسی انتقامی جذبہ

کے زیر اثر آپ کے سیگرٹ کیس سے دو چار سیگرٹ اُڑائے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں۔ کہ تمام ہندوستانی چور ہوتے ہیں"

"میرا یہ مطلب نہ تھا" اُس نے اپنے سیگرٹ کیس پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"تو غالباً آپ کا مطلب یہ ہے۔ کہ اگر کوئی بیوقوف ہندوستانی طالب علم لندن کی کسی لائبریری سے ایک آدھ کتاب یا کسی رسالہ سے دو چار تصاویر چُراتا ہُوا پکڑا جائے۔ تو آپ کو یہ کلیہ گھڑنے کا حق ہے کہ تمام ہندوستانی عادی چور ہوتے ہیں"

"نہیں۔ میرا یہ بھی مطلب نہیں"

"تو پھر؟"

"ہر ہندوستانی" اُس نے سیگرٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا "کسی نہ کسی قسم کی چوری کرتا ہے اگر وُہ ادیب ہے۔ تو مغربی ادبا کے شاہکار چُراتا ہے۔ اگر کسی کمپنی کا ڈائریکٹر ہے۔ تو حصّہ داروں کا روپیہ اور اگر کلارک ہے۔ تو دفتر سے سٹیشنری"

"مگر اس قسم کی حرکات تو سفید فام لوگ بھی کرتے ہوں گے"

"سفید فام لوگ اور چوری!" اُس نے چمک کر کہا "یہ سراسر جھوٹ ہے بالکل جھوٹ۔ یا جیسا کہ انگریزی میں کہتے ہیں۔ سفید جھوٹ"

خیر جانے دیجیئے اِس بات کو۔ مجھے یہ بتایئے۔ کہ اگر کوئی کسی کے جاہ و جلال ....

"اب آپ سیاسیات پر اُتر آئے" اُس نے بات ٹالتے ہوئے کہا "اچھا چھوڑیئے یہ قصّہ"

دو چار منٹ تک مکمل سکوت کا عالم رہا۔ اِس عرصہ میں مَیں چھت کی طرف اور وہ میرے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ اُس نے دوسرا سیگرٹ سلگایا۔ اور ایک لمبا کش لگاتے ہوئے بولی "ہاں۔ دوسری بات جو میں آپ سے کہنا چاہتی تھی۔ یہ ہے کہ ہندوستانی حد سے زیادہ شور مچاتے ہیں"

اِس بار مَیں کچھ جھینپ سا گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے مجھ سے اس الزام کا کوئی جواب نہ بن پڑے گا۔ میں سوچنے لگا۔ کہ شور و غل کو واقعی ہماری زندگی میں کتنا دخل ہے۔ در اصل یہ ہمارا

محبوب ترین شغل ہے۔ مجھے لیجسلیٹو اسمبلی کا وہ اجلاس یاد آگیا جہاں میں ایک دفعہ موجود تھا میں نے دیکھا۔ کہ مجلس کے ارکان گلا پھاڑ پھاڑ کر شور مچا رہے تھے۔ اور صاحب صدر چلا چلا کر انہیں خاموش رہنے کو کہہ رہے تھے۔ شور و شغب کا یہ عالم تھا۔ کہ اگر میں اپنی جگہ پر کھڑا ہو کر ہر ایک ممبر کو گالیاں دینا شروع کر دیتا۔ تو کسی قسم کی مداخلت کے بغیر یہ شغل جاری رکھ سکتا۔ دراصل مجلس کے ارکان تقاریر کم کرتے اور گالیاں زیادہ دے رہے تھے۔ کمینہ۔ بدذات اور احمق کی قبیل کے الفاظ کا نہایت فراخدلی کیساتھ استعمال کیا جا رہا تھا۔ معاً مجھے خیال آیا۔ کہ ہماری مجالس میں واقعی کتنا شور مچایا جاتا ہے۔ اور درسگاہوں میں، میلوں میں، سینما ہالوں میں فلم کے شروع ہونے سے پہلے، میت پر بین کرتے وقت۔ گذشتہ ہفتہ میرے ہمسائے میں ایک بوڑھے کی موت واقع ہو گئی تھی۔ اور اُس کے لواحقین نے چیخ چیخ کر نہ صرف مجھے بلکہ میلوں تک کسی آدمی کو رات بھر سونے نہیں دیا تھا۔ اور کل شام میں نے چند خوش باش لوگوں کو سڑک پر چلتے وقت اس طرح شور مچاتے دیکھا تھا۔ کہ مجھے کچھ شرم سی آنے لگی تھی۔ وہ ازراہِ تمسخر ایک دوسرے کو بلند آواز میں گالیاں دے رہے تھے... چنانچہ میں نے اعترافِ شکست کرتے ہوئے کہا۔" میڈم۔ یہ بات ایک حد تک صحیح ہے۔ ہم ہندوستانی ذرا فریادی قسم کے انسان واقع ہوئے ہیں۔ ہم خاموشی کی نسبت نالہ و شیون کے قائل ہیں۔ آپ لوگ ہوٹلوں میں اور سڑک پر چلتے وقت سرگوشی کے انداز میں بات چیت کرتے ہیں۔ جس سے شبہ ہوتا ہے۔ کہ آپ کسی کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ ہمیں یہ طریقہ پسند نہیں۔ چنانچہ ہم جو بات کہتے ہیں، علانیہ کہتے ہیں۔ تاہم کبھی کبھی تو آپ لوگ بھی شور مچانے میں ہندوستانیوں کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔"

"مثلاً؟" اُس نے اظہار تعجب کرتے ہوئے پوچھا۔

"مثلاً گاتے وقت یا کرکٹ کے میچ کے دوران میں، یا جب آپ گھوڑ دوڑ دیکھ رہے ہوں۔"

وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔ میں نے بیرا کو اور چائے لانے کا آرڈر دیا۔

"اچھا۔ تو آپ ہندوستانیوں کے متعلق اور کیا جانتی ہیں؟"

"جانتی تو بہت کچھ ہوں۔ مگر آپ کی خفگی کا خیال آتا ہے۔"

"میں اتنا زود رنج نہیں۔"

"تو میں یہ کہونگی کہ ہندوستانی مرد بالعموم اور ہندوستانی عورتیں بالخصوص حد سے زیادہ بزدل اور ڈرپوک واقع ہوئی ہیں۔"

مجھے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے اُس نے میرے مُنہ پر چٹاخ سے طمانچہ جڑ دیا ہو۔ "میڈم" میں نے ذرا ترشروئی سے کہا۔ "آپ ہندوستانی عورتوں کے متعلق جو چاہیں کہہ سکتی ہیں۔ مگر اُن پر بزدلی کا الزام نہیں لگا سکتیں۔ ضرورت پڑنے پر ہندوستانی عورتیں جان پر کھیل جاتی ہیں۔ یقیناً آپ نے بہادر راجپوت عورتوں کے کارنامے پڑھے ہونگے۔ ستی کی رسم کا سارے یورپ میں جواب نہیں۔"

"ہندوستانی عورتیں" اُس نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ "موت سے بیشک نہ ڈریں۔ مگر چوہوں اور خاوندوں سے ضرور ڈرتی ہیں۔ اس کے علاوہ مرد کے بغیر سفر کرنے سے کتراتی ہیں اندھیرے میں جانے سے خوف کھاتی ہیں۔ بھوتوں اور چڑیلوں سے نہ صرف خود ڈرتی ہیں۔ بلکہ اپنے بچوں کو بھی ڈراتی ہیں۔ اور سانپ یا بچھو کو دیکھ کر تو چیخ ہی اٹھتی ہیں۔"

"آپ مبالغہ سے کام لے رہی ہیں۔"

"مگر بزدلی صرف عورتوں تک ہی محدود نہیں۔" اُس نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہندوستانی مرد بھی تو غایت درجہ بزدل واقع ہوئے ہیں۔"

میں نے اپنی جنس کے حقوق کی حفاظت کرتے ہوئے کہا۔ "یہ سراسر بہتان ہے۔ کذب ہے افترا ہے۔ ہندوستانی سورماؤں کی شجاعت کا لوہا تمام دنیا مانتی ہے۔ گذشتہ اور موجودہ جنگ میں ہندوستانی سپاہیوں نے بہادری کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔"

"مگر ان تمام باتوں کے باوجود ہندوستانی مرد ڈرپوک ہیں۔"

"کیسے"

"وہ یوں۔ کہ تمام ہندوستانی ایک دوسرے سے ڈرتے ہیں۔ مثلاً اچھوت ہندوؤں سے

ہندو مسلمانوں سے مسلمان انگریزوں سے!"

"اور کیا انگریز کسی سے نہیں ڈرتے؟"

"ہرگز نہیں۔"

"سرخ خطرہ" سے بھی نہیں؟"

"سرخ خطرہ پر لعنت"۔ اُس نے شوخی سے کہا۔

"اور 'زرد خطرہ' کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔"

"آپ پھر فضول باتیں کرنے لگے۔"

چند ثانیے خاموشی میں گذرے۔ وہ اپنے بال سنوارنے لگی۔ اور میں اُس کے کُتے کو پچکارنے لگا۔ "ہاں۔ تو آخری بات جس کا میں آپ سے ذکر کرنا چاہتی ہوں۔ یہ ہے کہ . . . . ." وہ یک لخت رُک گئی۔

"کہئے۔ کہئے۔"

"آپ بُرا تو نہ مانیئے گا۔"

"ہرگز نہیں۔"

"تو وہ بات یہ ہے۔ کہ ہندوستانی ضرورت سے زیادہ بچے پیدا کرتے ہیں۔"

اس مرتبہ مجھے پھر خجالت کا احساس ہوا۔ آخر اس شوخ اور چابکدست لڑکی کا مشاہدہ اتنا سطحی نہیں۔ جتنا میں نے سمجھا تھا۔ وہ ایک حقیقت کا اظہار کر رہی تھی۔ آپس میں لڑنے جھگڑنے کے بعد بچے پیدا کرنا ہی تو ہماری سب سے بڑی دل لگی ہے۔ خود میں نے سات سال کی ازدواجی زندگی میں . . . . . خیر میں تو اس معاملے میں تو گرفتار ہوں۔ میرے ایک دوست ہیں۔ جو کسی دفتر میں ملازم ہیں۔ دس گھنٹے روزانہ کام کرتے ہیں۔ عدیم الفرصت اتنے کہ ایک لمحہ کی فراغت نہیں۔ اس قدر مصروف زندگی بسر کرنے پر بھی وہ تیس سال کی معمولی سی عمر میں آٹھ بچوں کے باپ ہیں۔ میرے ذہن میں ہر رنگ اور ہر قسم کے ہندوستانی بچے گھومنے لگے۔ خاک رو بول

کے بچے۔ میراسیوں کے بچے۔ کلرکوں کے بچے۔ ننگ دھڑنگ۔ یتیم۔ نیم مردہ۔ زرد رُو۔ نہ جانے کیوں مجھے بے اختیار چند اعداد و شمار یاد آ گئے۔ "ہندوستان میں اوسطاً ایک منٹ میں دس بچے پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا کے ہر پانچ آدمیوں میں ایک ہندوستانی ہے۔" اور بچوں کا تصور کرتے ہی مجھے وہ ٹڈی دل آ گیا۔ جسے میں نے ایک کھیت کا دس منٹ میں صفایا کرتے دیکھا تھا۔ لیکن میں نے اس شوخ و شنگ یوروپین لڑکی کو نیچا دکھانے کا تہیہ کر لیا۔ "میڈم" میں نے کہا۔ "ہم ہندوستانی ہر بات سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ بچے پیدا کرنے کا مسئلہ ہی لیجئے۔ بلاشبہ۔ یہ ہماری سب سے بڑی اور مرغوب صنعت ہے۔ مگر یہ نہ سمجھئے۔ کہ ہم بغیر کسی مطلب کے بچے پیدا کئے جا رہے ہیں۔ دیکھئے آپ کے ملک میں کچھ تو ضبطِ تولید کے اصولوں پر عمل کرنے سے اور کچھ جنگ کی وجہ سے روز بروز مردوں کی تعداد گھٹ رہی ہے۔ اگر یہی حال رہا۔ تو ایک وقت ایسا آئیگا جب یوروپ میں بچوں اور مردوں کا قحط پڑ جائیگا۔ اُس وقت ہم ہندوستانی بچوں کی تجارت شروع کر دیں گے۔ اور جس طرح اب رُوئی اور جیوٹ کے جہاز انگلینڈ بھیجتے ہیں۔ اسی طرح بچوں کے جہاز انگلستان کی بندرگاہوں کو روانہ کریں گے۔ اس سے تین فائدے ہونگے۔ ایک تو ہندوستان میں آبادی کا بڑھتا ہوا دباؤ کم ہو جائیگا۔ دوسرے ہندوستانی لوگ بچے فروخت کر کے بے اندازہ دولت سمیٹیں گے۔ تیسرے انگلستان اور ہندوستان کے تعلقات مستحکم ہو جائیں گے۔" کیوں کیسی رہی"۔ میں نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ جیسے میں اس دلیل کے بودے پن کا خود ہی مضحکہ اُڑا رہا تھا۔

"دیکھو۔" اُس نے شرارت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "فی الحال مجھے ہندوستانی بچے کی ضرورت نہیں۔" اور اُس نے اپنے کُتے کو گود میں بٹھا لیا۔ "لیکن شاید مستقبل میں۔ جب میں واپس لندن چلی جاؤں۔ تو مجھے ضرورت پڑ جائے۔ وعدہ کرو کہ تم مجھے ایک ہندوستانی بچہ ارسال کرو گے۔"

"ایک چھوڑ دس!"

"نہیں صرف ایک۔ مگر سُنو۔ دو باتوں کا خیال رہے۔"

"کہیے"

"پہلی بات یہ کہ وہ بچہ تمہارا نہ ہو"

"اور دوسری؟"

"دوسری یہ کہ اُس کا رنگ کالا نہ ہو"

پیشتر اس کے کہ میں اُسے گالی دے سکتا وہ باہر سڑک پر کھڑی اشارے سے ٹانگے والے کو بلا رہی تھی۔

علی جواد زیدی

ہولی

پہلے زمانہ اور تھا، مے اور تھی، دور اور تھا
وہ بولیاں ہی اور تھیں، وہ ٹولیاں ہی اور تھیں، وہ ہولیاں ہی اور تھیں
لیکن، مرے پیرِ مغاں!
کل تو نیا انداز تھا،
اِک دور کا تھا خاتمہ، اک دور کا آغاز تھا۔
تیرے وفاداروں نے جب کھیلیں گلابی ہولیاں!
نِکلے بنا کر ٹولیاں،
ہنستے چلے، گاتے چلے،
اپنے گلابی رنگ سے دنیا کو نہلاتے چلے۔
مسجد سے منھ موڑے ہوئے،
مندر کا سنگِ آستاں چھوڑے ہوئے،

گرجا سے کتراتے ہوئے،
جیسے کہ ہوں روحانیت کی زندگانی ہی سے گھبرائے ہوئے۔
دورِ وفاداری کا یہ انجام تھا،
فکرِ گنہگاری کا تازہ، ولربا پیغام تھا،
تیرے ہی کوچے میں یہ سب عہدِ وفا توڑے گئے۔
رشتے نئے جوڑے گئے۔
اور پھر گنہگاروں نے کیا رندانہ ہنگامے کئے
اُس وقت اُن کو یاد تھا، بس ایک ترسانا ترا
مفلس وفاداروں کو للچانا ترا
جب میکدے کی گود میں،
تیری جفا، تیری سزا کے نام پر ساغر چلے
سوکھے ہوئے کاسے لبالب بھر چلے،
سب اپنے لب تر کر چلے۔
پھر توڑ دیں وہ پیالیاں جن میں سوا پی آئے تھے،
شیشے چھنا چھن، چھن، چھنا، چھن، ٹوٹتے،
اور رند لذّت لوٹتے۔
ٹوٹے ہوئے شیشوں کا اک انبار تھا۔
شیشوں ہی کے انبار میں اک وہ بھی کہنہ جام ہے،
جس کو سکندر کے قوی ہیکل جوان،
بھاگے تھے پورس کی زمیں پر چھوڑ کر۔
ان میں وہ کاسے بھی تو ہیں جن کو عرب لے آئے تھے،

اپنی عبا سے ڈھانک کر،
پینے سے پہلے دیکھتے تھے محتسب کو جھانک کر۔
لیکن، کبھی،
پینے سے باز آتے نہ تھے، فاتح جو تھے!
اِن میں ایسے جام بھی
جن پر پٹھانوں کے قوی ہاتھوں کے دھندلے سے نشاں
کچھ آج بھی موجود ہیں
اور اِن نشانوں میں ہے خوں مفتوح ہندوستان کا
اور اِن میں ہیں وہ جام بھی جن کو مغل لے آئے تھے
شیراز سے، قندھار سے، کابل سے، رکنا باد سے
مفتوح ہندوستان میں
جن کو وہ اپنے قصرِ عالیشاں میں چھلکاتے رہے
تیغوں سے کھنکاتے رہے۔
اور وہ حسیں، نازک، سبک، ہلکی صُراحی کس کی ہے۔
پیرس کے میخانوں میں یہ مشہور تھی،
لایا تھا اک تاجر اسے جو بعد میں فاتح بنا۔
یہ ہلکے شیشوں کے گلاس اور یہ نئے ہلکے سے "پگ"
جن پر لکھا ہے یہ بنے تھے ملک انگلستان میں
اور حال کی صدیوں میں یہ چلتے رہے،
پینے کو مل جاتی تھی پی لیتے تھے ہم
لیکن تہی دستی کا یہ عالم تھا دل جلتے رہے۔

ہم آج گھبرا ہی گئے
اور اِن سبھی شیشوں کو چکنا چور کر ڈالا دفورِ جوش میں،
چھَن چھَن چھنا چھن توڑ کر!
جیسے کہ بربادی کی دیوی چھم چھما چھم ناچتی
ہولی منانے کے لئے میخانے میں آ ہی گئی
ٹوٹے ہوئے شیشوں کے اِس انبار پر
ہم نے جلائی آگ یوں
زردشت کا پاکیزہ دل سچائیوں پر ہنس دیا
جیسے کہ یہ کہنے لگا،
"جلنے دو جلنے دو یونہی شیشہ پگھلنے دو یونہی"
تیرے وفاداروں نے یُوں، پیرِ مغاں!
شب بھر جلائیں ہولیاں
نعرے وہ مستانہ لگے اس جوش میں
دل گر پڑے احساس کی آغوش میں
اور بول اُٹھے، "تسلیم اے پیرِ مغاں! جاتے ہیں ہم
"کل پھر پلٹ کر آئیں گے
"اُس وقت اِس میخانے میں ساماں ہوں گے دوسرے
"کل شیشہ و پیمانہ و ادزان ہونگے دوسرے
"تیرے پُرانے ذہن کے معیار توڑے جائیں گے۔
"تعمیرِ نَو، کی جائے گی۔
"لیکن ہمارے سالخوردہ، مہرباں، پیرِ مغاں!!

”تجھ کو بُرا لگتا ہے کیوں ؟
”غیروں کا گیا، تیرا بھی کیا ؟
”یہ میکدہ ہم سب کا ہے، پنچایتی۔
”تو کیا ہے، تیرا خوف کیا ؟
”کہہ تو دیا پیرِ مغاں! کل پھر پلٹ کر آئیں گے۔
”ہرگز نہ ہم باز آئیں گے
”کس کو ڈراتا ہے کہ تم اس کی سزا پا جاؤ گے
”گاتے تھے ہم، گاتے ہیں ہم، گائیں گے ہم
”ہرگز نہ باز آئیں گے ہم
”جو عمر بھر پیتے تھے پیتے جائیں گے
”جھیلیں گے، جینے جائیں گے
”پیروں میں زنجیر لیکن ٹوٹ بھی سکتی ہے یہ!
”ہاں آج مستی قید ہے، کل چھوٹ بھی سکتی ہے یہ!
”گانے دے، گانے دے ہمیں!

”دھومیں مچانے دے ہمیں
”شیشے کو شیشے سے لڑانے دے ہمیں
”چھن چھن چھنا چھن کی صدا
”بڑھنے دے، بڑھنے دے ابھی
”ہم مست و بیخود، ناچتے، گاتے، جلاتے، توڑتے
”ہنستے رہیں، چلتے رہیں
”اور تو بھی خود، پیرِ مغاں!

"ہولی کے نغمے سُن ذرا، اور دیکھ اپنی آنکھ سے،
"تیرے وفاداروں نے کیا کھیلیں گلابی ہولیاں!!

منھ میکدے سے موڑ کر ہولی کی یہ ٹولی چلی
گلزار ہیں،
سبزے، لچکتی ڈالیاں، گنجان، سندر جھاڑیاں
پانی کی سینچی کیاریاں، کانٹوں میں چبھتی ہتّیاں
یہ سب سہی، لیکن یہاں وہ شے کہاں؟
جس کے لئے مشہور ہے بیتِ شراب،
سرچشمۂ انگورِ ناب!
ہاں، کیا کہا پیرِ مغاں؟
"تلووں کے نیچے پھول ہیں
خالی ہیں گلدستے مرے اِن میں سے دو اک چُن بھی لوں!"
تجھ کو نہیں معلوم ابھی
خالی یہ گلدستے ترے، خالی ہی رہ جائیں گے اب
پھُولوں نے ٹھانی ہے کہ باغوں ہی میں مرجھائیں گے اب
اور تیرے کمروں میں نہ وہ آئیں گے اب!
منھ بند کلیاں اب کہاں؟
جو اپنی سندر موہنی مُسکان کر دیں رائگاں!
اور اپنا گلشن چھوڑ دیں سینے میں خوشبوئیں لئے
اور اجنبی ماحول میں

طاقِ نظر کی کانپتی زینت بنیں
خوشبوئیں پھیلانے لگیں
کلیوں کے منہ اب کھل چکے منہ بند کلیاں اب کہاں ؟
کلیاں کہاں یہ پھول ہیں !
خاکِ چمن کی گود میں آرامِ جاں یہ پھول ہیں
آتش زباں یہ پھول ہیں۔
اور دیکھ تو یہ پھول کتنے شوخ ہیں
جو ٹوٹ کر شاخوں سے گر جاتے ہیں تیری راہ میں
اے دل شکن پیرِ مغاں !
اور دیکھ ان کی ہمتیں
یہ چاہتے ہیں روک دیں گلزار میں راہیں تیری
تیرے لئے چارہ ہی کیا اب رہ گیا
اِن بے حیا پھولوں کی آنکھوں کا تو پانی بہ گیا
اب یہ ہیں اِن کی جرأتیں ــــ روکیں گے تیرے راستے
تو بھی خدا کے واسطے
اِن کو کچل دے پیس دے، ورنہ خدا نا خواستہ
یہ روک ہی لیں راستہ
کلیاں نہیں، کانٹے ہیں یہ
کانٹوں سے بھی بدتر ہیں یہ نشتر ہیں یہ، خنجر ہیں یہ
گلزار میں تیرے قدم کچھ آج تو آتے نہیں
تو نے انہیں سنبزوں پہ کی ہے مے کشی

گلزار پرحق ہے ترا

توڑ گیا، اے دل شکن، پیرِ مغاں!
کتنا بھیانک خواب تھا
تعبیر کچھ بھی ہو مگر
تیرے وفاداروں نے کل
کس آن سے، کس بان سے، کس شان سے
کھیلیں گلابی ہولیاں

جذبی

طوائف

اپنی فطرت کی بلندی پہ مجھے ناز ہے کب ہاں، تری پست نگاہی سے گِلا ہے مجھ کو
تُو گرا دے گی مجھے اپنی نظر سے ورنہ ترے قدموں پہ تو سجدہ بھی روا ہے مجھ کو

تُو نے ہر آن بدلتی ہوئی اِس دُنیا میں مری پائندگیِ غم کو تو دیکھا ہوتا
کلیاں بیزار ہیں شبنم کے تلوّن سے مگر تو نے اِس دیدۂ پُرنم کو تو دیکھا ہوتا

ہائے جلتی ہوئی حسرت یہ تری آنکھوں میں کہیں مل جائے محبّت کا سہارا، تجھ کو
اپنی پستی کا بھی احساس، پھر اتنا احساس کہ نہیں میری محبّت بھی گوارا تجھ کو
اور یہ زرد سے رُخسار، یہ اشکوں کی قطار
مجھ سے بیزار، مری عرضِ وفا سے بیزار

یُوسف ظفر

اِنصاف

بادشاہوں کی حکومت کے فسانوں کے سوا
اِن تواریخ کے اوراق میں کیا رکھا ہے
وہ حکومت جسے کمزوروں نے طاقت بخشی،
جس نے کمزوروں کا خون پینا روا رکھا ہے

جب بھی یہ شاہوں کے افسانے نچوڑے میں نے
اِن سے بہتے ہوئے دیکھے ہیں لہو کے دریا
جب بھی اِس ساز کو مضرابِ نظر سے چھیڑا
میرے کانوں نے سُنا نغمۂ جامِ و مینا

تیری تاریخ نے دوہرایا ہے جن قِصّوں کو
اُن میں شاہوں کے سِوا کوئی بھی انسان نہیں
وہی انسان کہ جن سے یہ شہنشاہی تھی
جن کی مٹی سے گُزدں اُبھری ہے یہ بخرِ زیاں

چھوڑ یہ شاہد و مینا و سبُو کے قصّے
دیکھ یہ ٹوٹے ہوئے جبڑے کئی صدیوں کے
یہی تاریخ ہے اُن لوگوں کی — یہ اُونچے پہاڑ
ٹوٹے پھوٹے ہوئے یہ دانت، یہ خم ندیوں کے

دیکھ! یہ پُشتے کہ ہے ان میں لہو پُشتوں کا
دیکھ! اِن دانتوں کی یہ بیخوں میں رگوں کے ریشے
اِن کا صیقل عرق آلود جبینوں سے ہے
اِن کے سینوں میں ابھی گونج رہے ہیں تیشے

اِن میں اُن لوگوں کی تاریخ کے افسانے ہیں
کس طرح اُن کی گراں ڈیل، قوی باہوں نے
توڑ دی تھیں یہ حدیں، اور پھر اُن سے ڈر کر
کھولے تھے خیبر و بولان گذرگاہوں نے

آریاؤں کے جواں قافلے وہ آتے ہیں،
کارواں بڑھتے ہیں دل توڑتے کوہساروں کے
اُن کے قدموں کے دھماکوں سے دہلتے ہیں پہاڑ
اُن کی آنکھوں میں تصوّر بھی ہیں گلزاروں کے

۲

کتنے انسان ہیں گم نام گڑے مُردوں میں
جن کے سانسوں نے تمدّن کے جلائے تھے چراغ
اپنی تاریخ کے اوراق پلٹ کر پھر دیکھ
دیکھ! کیا اُن کا کہیں ملتا بھی ہے کوئی سُراغ

سرمئی صدیوں کی محرابوں میں آویزاں ہیں
سینکڑوں شاہوں کی تصویروں کے فانوسِ دوام
جو مری پھونک بھی برداشت نہیں کر سکتے
تُو مگر ڈھونڈتا ہے اِن میں حدیثِ ایّام

ایک ہی نغمۂ جاوید ہے، وہ نغمہ کہ جو
کِسی تیشے نے جگایا ہے کِسی پتھّر میں
ورنہ یہ شاہ ـــــ یہ دولت کے تراشے ہوئے بُت
درحقیقت ہیں اس افسانے کے پس منظر میں

محی الدّین مخدوم

اندھیرا

رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے
یہ دمکتا ہُوا چاند
بھیک کے نور میں، مانگے کے اُجالے میں مگن
یہی ملبوسِ عروسی ہے، یہی ان کا کفن
اِس اندھیرے میں وہ مرتے ہوئے جسموں کی کراہ
وہ عزازیل کے کتّوں کی کمیں گاہ
وہ تہذیب کے زخم
خندقیں ——
باڑ کے تار
باڑ کے تاروں میں اُلجھے ہوئے انسانوں کے جسم

اور انسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہوئے گدھ
وہ تڑختے ہوئے سر
میتیں، ہاتھ کٹی، پاؤں کٹی،
لاش کے ڈھانچے سے اِس پار سے اُس پار تلک
سرد ہوا
نوحہ و نالہ و فریاد کناں
شب کے سنّاٹے میں رونے کی صدا
کبھی بچّوں کی
کبھی ماؤں کی
چاند کے تاروں کے ماتم کی صدا
رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

مجید امجد

ایک نظم

دوست، یہ سب سچ ہے، لیکن زندگی — کاٹنی تو ہے بسر کرنی تو ہے
گھات میں ہوں منتظر چلّے پہ تیر — ہرنیوں کو چوکڑی بھرنی تو ہے
ہم نے بھی اپنی نحیف آواز کو — شاملِ شورِ جہاں کرنا تو ہے
زندگی اک گہری کڑوی لمبی سانس — دوست، پہلے جی بھی لیں، مرنا تو ہے

موت کتنی تیرہ و تاریک ہے — ہو گی، لیکن مجھ کو اس کا غم نہیں
قبر کے اندھے گڑھے کے اس طرف — اس طرف، باہر، اندھیرا کم نہیں

ہاں اسی گُم سُم اندھیرے میں ابھی — بیٹھ کر وہ راکھ چُننی ہے ہمیں
راکھ، ان دنیاؤں کی جو جل بجھیں — راکھ، جس میں لاکھ خونی شبنمیں
زیست کی پلکوں سے ٹپ ٹپ چھوٹتی — جانے کب سے جذب ہوتی آئی ہیں

کتنی روحیں، اِن زمانوں کا خمیدہ   اپنے اشکوں میں سموتی آئی ہیں

جانتا ہُوں میرے دل کی آگ کو
چند ماہ و سال کے ایندھن کا ڈھیر
دیر تک تابندہ رکھ سکتا نہیں

زلیست امکانات کا اک ہیر پھیر
کیا عجب ہے میرے سینے کا شرر
اک تمنائے بغل گیری کے ساتھ
وقت کے مرگھٹ پہ باہیں کھول دے
اِک نرالی صبح بن جائے یہ رات

(خواجہ) احمد عبّاس

زندگی

ایک بچّہ

زندگی اور موت۔

مقابلہ سخت تھا۔

موت لشکر کے لشکر ساتھ لیکر آئی تھی۔ کمزوری، بیماری، خون کی کمی، گھراز خم، زہر بلا مادّہ، نو برس کا بچّہ، غریب بچہ، کمزور بچّہ، کبھی اس کو پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہی نہیں ہوا تھا چند مہینے ہی کا تھا کہ باپ مر گیا۔ ماں نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلا باپ شرابی تھا اور بدمزاج۔ جب رات کو نشہ میں چور آتا تو بیوی اور سوتیلے لڑکے دونوں کو مارتا۔ ہنٹر، لکڑی، جوتا جو بھی ہاتھ میں آ گیا۔

ایک دن صبر کا پیالہ چھلک گیا۔ اگلے دن سُورج نکلنے سے پہلے ہی بچّہ گھر سے بھاگ نکلا۔

اس وقت اس کی عمر سات برس کی تھی۔

دو سال تک وہ مارا مارا پھرتا رہا۔ اخبار بیچے، جوتوں پہ پالش کیا، برتن دھوئے، نالیاں صاف

کیں۔ بوجھ ڈھویا۔ بھیک مانگی۔

اس کا رنگ کالا تھا۔ اس کے باپ کا رنگ بھی کالا تھا اور ماں کا بھی۔ اس کو معلوم تھا کہ کالے ماں باپ کے بچے ہمیشہ کالے ہی ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی وہ اکثر سوچتا" کاش میرا رنگ کالا نہ ہوتا" معلوم ہوتا تھا کہ کالے آدمیوں کو خدا نے گوروں کی خدمت کرنے، ان کی گالیاں اور ٹھوکریں کھانے کے لئے ہی بنایا ہے۔ نہ جانے ان سب کالوں نے کیا خطا کی تھی۔ خدا کی پرستش میں وہ گوروں سے کہیں زیادہ انہماک دکھاتے تھے۔ گرجا جاتے۔ پادریوں کے وعظ سُنتے۔ یسوع مسیح پر ایمان لاتے صدیوں کے غم سے بھری ہوئی دردناک آوازوں میں مذہبی گیت گاتے پھر بھی خدا کے دربار میں انکی شنوائی نہ ہوتی۔ پھر بھی گورے رنگ کے عیسائی ان کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے اس کو وہ واقعہ اب تک یاد تھا جب اس نے غلطی سے ایک گوری عورت کے سفید ریشمی لباس کو چھولیا تھا۔ وہ سڑک کے نکڑ پر اخبار بیچ رہا تھا۔ گوری عورت نے اس سے اخبار لیا اور اپنے بیگ میں ریزگاری تلاش کرنے لگی۔ بچّہ کی نگاہیں بے اختیار اس عورت کے سفید لباس پر جم گئیں کتنا سفید تھا وہ فراک۔ دودھ سے بھی زیادہ سفید۔ ان بطخوں سے بھی زیادہ سفید جن کو اس نے ایک دفعہ جھیل میں تیرتے ہوئے دیکھا تھا۔ کتنا سفید تھا وہ فراک! سفید اور چکنا۔ نظر بھی پھسلی جاتی تھی " نرم بھی ضرور ہوگا" اس نے فراک کی چمکیلی سطح کو غور سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ اور پھر نہ جانے کیوں اس کا جی چاہا کہ اس کپڑے کو چھو کر دیکھے۔ نرم نرم چکنی چکنی چیزوں کو چھو کر، ان پر ہاتھ پھیر کر کتنا مزا آتا تھا! ایک دفعہ اس کو کالے ریشم کا ایک ٹکڑا پڑا مل گیا تھا۔ چکنا اور چمکدار۔ وہ اس نے اپنے چھوٹے سے بے قفل صندوقچے میں چھپا کر رکھ چھوڑا تھا اور جب موقعہ ملتا اس ٹکڑے کو نکالکر اس پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیر کر دیکھتا کہ اس کی ملائمت باقی ہے یا نہیں۔ مگر اس گوری عورت کا یہ فراک تو اس سے بھی کہیں زیادہ چکنا اور چمکدار تھا۔ اور پھر سفید تھا۔ دودھ سے بھی زیادہ سفید۔ جھیل کی بطخوں سے بھی زیادہ سفید۔ اور سفید چیزوں میں نہ جانے کیا خوبی تھی کیا جادو تھا کہ دیکھتے ہی وہ بے قرار ہو جاتا۔ اس فراک کو چھونے میں تو اور بھی مزا آئیگا۔ اس نے اپنا

کالا ہاتھ اُٹھایا اور گوری عورت کے دامن کو چھو لیا۔

گوری عورت بیگ سے پیسے نکال کر دینے ہی والی تھی کہ اس نے ایک کالے ہاتھ کو اپنے کپڑوں سے مس ہوتے دیکھا اور اپنی چھتری بند کر کے بچّہ کو مارنا شروع کر دیا۔

"بدتمیز۔ ذلیل کتّے۔ تیری یہ مجال! چل تجھے پولیس کے حوالے کرتی ہوں۔" اور پولیس کے ڈر سے وہ سر پر پاؤں رکھ کر ایسا بھاگا کہ اخباروں کا بنڈل بھی وہیں رہ گیا۔ اس کی سزا میں اخبار والے نے اگلے دن سے اس کو اخبار دینے بند کر دیئے۔

شہر میں چاروں طرف اُونچی اُونچی عمارتیں تھیں۔ آسمان تک اونچی۔ سڑک پر کھڑے ہو کر وہ اُوپر نظر کرتا تو معلوم ہوتا کہ ہر عمارت کی چوٹی بادلوں میں تیر رہی ہے۔ بادل چلتے ہوئے نہ معلوم ہوتے بلکہ ایسا نظر آتا جیسے عمارت آہستہ آہستہ ڈھلک رہی ہے۔ اور وہ ڈر کے مارے پھر سیدھا کھڑا ہو جاتا کہ کہیں اینٹ اور پتھر کا یہ پہاڑ اس کے سر پر نہ آ پڑے۔

جب اخبار بیچنے کا سلسلہ بند ہو گیا تو اس نے سڑکوں پر آوارہ پھرنا شروع کر دیا۔ کتنا خوبصورت شہر تھا۔ صاف صاف سڑکیں۔ کالی کالی چکنی چکنی چمکدار موٹریں۔ اِدھر اُدھر دھڑ دھڑ اِدھر چلنے والی بجلی کی ریلیں۔ جگمگاتے ہوئے سینما اور تھئیٹر۔ بڑے بڑے ہوٹل۔ لذیذ کھانوں سے بھرے ہوئے ریستوران۔ وہ گھنٹوں شیشے کی دیواروں میں سے اندر سجے ہوئے کیک، پیسٹری، پھل، بھُنی ہوئی مرغیوں اور شراب کی بوتلوں کو دیکھتا رہتا۔ وہ سب نعمتیں اس کے سامنے موجود تھیں۔ اتنی قریب کہ وہ چاہے تو ان کو چھو سکتا تھا۔ ایک دن اس نے بے اختیار ہاتھ بڑھا دیا۔ کھٹ سے شیشے کی موٹی چادر سے ٹکرایا۔ ایک پولیس والے نے کرخت آواز میں کہا "او کالے بدمعاش چلتا پھرتا نظر آ نہیں تو ڈنڈا رسید کرتا ہوں۔" اور لال سبز کیک پر حسرت بھری نظر ڈال کر بچّہ آگے بڑھ گیا۔

نہ جانے کیوں دنیا کی سب اچھی اچھی چیزیں گورے آدمیوں ہی کے لئے ہیں؟ بچّہ کے ننھے دماغ میں یہ سوال ایک شہد کی طرح بھنبھناتا رہتا۔ آخر کیوں؟ ہوٹل، سینما، عالیشان مکان، سب جگہ

گورے آدمی ہی رہتے تھے۔ کالے اگر اس دنیا میں تھے تو نوکروں کی حیثیت سے۔ ہوٹلوں میں ویٹر، سینما گھروں کے سامنے پہرے دار۔ عالیشان مکانوں میں ملازم۔ جب گورا مالک اور مالکن اپنی موٹر میں بیٹھنے کے لئے گھر سے نکلتے تو کالا نوکر ادب سے ان کے لئے موٹر کا دروازہ کھولے کھڑا رہتا۔ آخر کیوں؟ آخر کیوں؟

دنیا کی سب چیزیں گوروں کے لئے تھیں مگر آسمان پر جہاں خدا رہتا ہے وہاں ضرور کالوں اور گوروں کے ساتھ یکساں سلوک ہوتا ہوگا۔ بچے کو اس کا یقین تھا۔ اور رات کو جب وہ پھرتے پھرتے تھک جاتا تو سڑک کے کنارے بیٹھ کر سر اوپر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتا۔ ستارے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے اور وہ بھی اپنی بھوک، اپنی تھکن کو بھول جاتا۔ اس نے سنا تھا کہ مر کر انسان آسمان پر خدا کے پاس چلے جاتے ہیں۔ وہ سوچتا اچھا ہی ہو اگر میں مر جاؤں۔ پھر میں وہاں جہاں ستارے ہیں مزے سے رہونگا۔ میرا باپ میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ میں وہاں جاؤں گا وہ کتنا خوش ہوگا۔

مگر زندگی کا ان تھک چکر ان خیالات کی فرصت ہی کب دیتا تھا۔ پھر کوئی پولیس کا سپاہی پتھر کی سڑک پر اپنے قدموں سے کھٹ کھٹ کرتا اور ڈانٹ کر کہتا۔ "چلو — چلو — اٹھو۔ یہاں کیا چوری کا ارادہ ہے۔ اپنے گھر جاؤ۔ ایک دم"

اس کا "گھر" شہر کے اس حصے میں تھا جہاں سب کالے ہی کالے رہتے تھے۔ ایک پرانا اصطبل۔ کسی زمانے میں یہاں گھوڑے بندھا کرتے تھے مگر اب موٹروں کی وجہ سے گھوڑا گاڑیوں کا رواج جاتا رہا تھا۔ اصطبل مدت سے بیکار پڑا تھا اور بہت سے غریب کالے لوگ جن کا کہیں ٹھکانا نہیں تھا، یہاں آکر سو جاتے تھے۔

رات کو جب وہ "گھر" واپس آتا تو اسے ایسا معلوم ہوتا وہ جنت سے جہنم میں آگیا ہے۔ کہاں گورے آدمیوں کے وہ عالیشان مکان۔ کہاں یہ گندی، بدبودار، اندھیری بستیاں۔ یہاں کی سڑکیں بھی خراب تھیں۔ اور روشنی کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے کالوں کے لئے رات بھی کالی رہتی۔ ہاں مگر اس اندھیری اور تکلیف دہ دنیا میں بس ایک جگہ تھی جہاں کالوں کو بھی

راحت نہیں تو کم سے کم خود فراموشی نصیب تھی۔ وہ تھا شراب خانہ۔ وہ کئی بار وہاں گیا تھا۔ وہاں اس کو چاروں طرف اپنے جیسی کالی شکلیں ہی نظر آتی تھیں۔ کالے مرد۔ کالی عورتیں جن کے دانت گوری عورتوں سے کہیں خوبصورت تھے۔ ویٹر، ڈرائیور، خانگی ملازم، چپراسی، بوٹ پالش کرنیوالے، خادمائیں، مامائیں، انائیں، باورچی اور باورچنیں، مگر یہاں تو وہ صرف مرد تھے اور عورتیں۔ مرد اور عورتیں۔ عورتیں اور مرد۔ کھانا اور شراب۔ سگریٹ کا دھوآں۔ اور اس دھوئیں کو چیرتی ہوئی قہقہوں کی لہریں۔ اور پھر کوئی پیانو پر بیٹھ جاتا اور اس پرانے، بغیر پالش کے پیانو میں سے موسیقی کا ایک طوفان اٹھتا جس میں سب ڈوب جاتے۔ مرد اور عورت ناچنا شروع کر دیتے۔ تھرک تھرک کر، مٹک مٹک کر، ہنس ہنس کر، مسکرا کر، قہقہے لگا کر، اچھل کر، کود کر، تالیاں بجا کر۔ موسیقی اور سگریٹ کا دھواں اور شراب کی بو اور کالے کالے چہروں پر پسینہ کی چمک۔ اور پھر کوئی گانا شروع کر دیتا اور اس موسیقی اور اس گانے میں نو برس کے کالے بچے کو نو ہزار برس کی داستان سنائی دیتی۔ اس کی قوم کی داستان، ایک درد بھری کہانی۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا کہ موسیقی کی لہروں میں بہتا ہوا وہ دور کسی ساحل پر پہنچ گیا ہے۔ اندھیری رات ہے اور سناٹا۔ جنگل سائیں سائیں کر رہا ہے۔ چاروں طرف خوفناک جانوروں کی آتشیں آنکھیں نظر آ رہی ہیں۔ پھر کہیں دور سے ڈھولک کی آواز آتی جو آہستہ آہستہ اور قریب ہوتی جاتی۔ ایک ہولناک آہنگ جس کو سن کر دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ اور ایک نامعلوم خوف اس کے روئیں روئیں میں سما جاتا۔ آسمان کا خوف بجلی اور بادلوں کا خوف۔ سمندر کا خوف۔ طوفان کا خوف۔ بھوت پریت اور جادو کا خوف۔ شیر، چیتے اور گھڑیال کا خوف۔ ان سب خوفوں سے بڑھ کر انسان کا خوف۔ اور بچے کو اس موسیقی میں ایک نئی خوفناک دھن سنائی دیتی۔ زنجیروں کی جھنکار۔ غلامی کے احساس سے دم گھٹنے لگتا۔ مگر پھر کہیں زمین کی لامحدود وسعتوں میں سانس آتا اور کپاس کے کھیتوں میں ہزاروں گلوں سے ایک دردناک نغمہ اٹھتا اور آسمان کی اونچائی میں کھو جاتا۔

بچہ اس کہانی کو کچھ سمجھتا اور کچھ نہ سمجھتا۔ مگر جب تک پیانو بجنا بند نہ ہو جاتا وہ نسلی جذبات

اور محسوسات کے اس سمندر میں غوطے کھاتا رہتا۔ اور جب پیانو بجنا بند ہو جاتا تو اس کو ایسا معلوم ہوتا جیسے ایک زوردار لہر نے اس کو ساحل پر پٹک دیا ہو۔

شراب خانے میں سب اس سے اچھا سلوک کرتے تھے۔ کوئی کھانے کو دیتا، کوئی پینے کو، روٹی کا ایک توس، گوشت کا ایک ٹکڑا، کافی کی پیالی۔ اس کا پیٹ بھر ہی جاتا۔ مگر ایک رات کو ایک شرابی نے اس کو ایک گلاس شراب کا زبردستی پلا دیا۔ نچے کو ایسا معلوم ہوا جیسے چاقو سے اس کے گلے کو چیرا جا رہا ہے۔ چند لمحوں کے بعد گلے کی چرمراہٹ جاتی رہی۔ مگر اس کا سر پھولنے لگا۔ فٹ بال کی طرح۔ کم سے کم اسے محسوس ایسا ہی ہوا۔ فٹ بال سے بڑھتے بڑھتے سر کپا بن گیا اور وہ ڈرا کہ کہیں سر اتنا بڑا نہ ہو جائے کہ میں دروازے میں پھنس جاؤں۔ اس لئے وہ باہر نکل گیا۔ مگر دریا کی ٹھنڈی ہوا کا ایک تھپیڑا ہی پڑا تھا کہ سر پھر اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ مگر اس کے بدن میں جو بھوک اور بخار سے بالکل کمزور ہو گیا ایک دم نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی۔ بدن میں طاقت اور دل میں ہمت۔ اس نے سوچا۔ میں ابھی سوؤں گا نہیں۔ شہر کی سیر کرونگا۔ اور اس کے قدم سڑک پر نہیں، ہوا پر چل رہے تھے!

چلتے چلتے وہ پھر گوروں کی دنیا میں پہنچ گیا۔ روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ ہوٹل اور شراب خانے ناچ گھر، سب گورے مردوں اور گوری عورتوں سے بھرے ہوئے تھے۔ مگر ایک نکڑ پر یہ اتنے بہت سے کالے آدمی کہاں سے آ گئے تھے؟ ان کا یہاں کیا کام؟ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔ "ہمارے ایک ساتھی کو مارا ہے تو ہم دس کا خون کریں گے۔" نچے کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا بات ہے۔ اس لئے وہ دیوار کے سایہ سے لگا لگا آگے بڑھ گیا۔

چھن سے شیشے ٹوٹنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی ایک شور۔ پولیس کی سیٹی۔ کچھ لوگ بھاگ رہے تھے۔ کچھ لوگ ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ دور سے اور شیشوں کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ پولیس کی سیٹیاں۔ عورتوں کی چیخیں۔ اور ان سب ملی جلی آوازوں کو چیرتی ہوئی گولی چلنے کی تڑاخے دار آواز۔ پھر چھن سے شیشے ٹوٹنے کی آواز۔

بچے کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ لوگ کیوں بھاگ رہے ہیں۔ عورتیں کیوں چیخ رہی ہیں گولیاں کیوں چل رہی ہیں۔ اس کے دماغ میں تو بس ایک ہی خیال تھا۔ ریستوران کی وہ شیشے کی دیوار جس کے پیچھے دنیا کی سب نعمتیں رکھی ہوئی ہیں۔ اگر اور شیشے کی دیواریں ٹوٹ رہی ہیں تو وہ بھی توڑی جاسکتی ہے! یہ خیال آتے ہی وہ بھاگا۔ ٹھوکر کھائی۔ گرا، اٹھا، پھر بھاگا، بے تحاشا بھاگا، پولیس کی سیٹی سنائی دی، مگر وہ نہ رُکا۔

وہ رہی شیشے کی دیوار۔ اندر رنگ برنگ کے کیک اسی طرح جگمگا رہے تھے۔ لال لال سیب زرد زرد سنگترے، سبز رنگ کے کیلے۔ اور ان میں اور اس میں صرف ایک شیشے کی دیوار حائل تھی۔ اگر اور شیشے کی دیواریں توڑی جا رہی ہیں تو یہ بھی توڑی جاسکتی ہے۔ اس نے ایک پتھر اٹھایا اور پورے زور سے دے مارا۔

چھن سے شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ اس کے اور دنیا کی نعمتوں کے درمیان جو دیوار حائل تھی وہ ٹوٹ گئی۔

وہ کیک اور پھل اُٹھانے کے لئے لپکا۔

ایک تڑاخہ ہوا۔ بچے کو اپنے بائیں پہلو میں ایک ٹیس محسوس ہوئی۔ ایک دفعہ اس کو ایک شہد کی مکھی نے کاٹ لیا تھا۔ اس لمحے اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے ایک شہد کی مکھی اس کے گوشت کو گولی کی رفتار سے چیر کر اندر گھس گئی ہے۔ اس کے بعد اس کے دماغ پر ایک سیاہی چھا گئی جو اس کے رنگ سے بھی زیادہ تاریک تھی!

جب اسے ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں تھا۔ بائیں پہلو میں شہد کی مکھی اب بھی کاٹ رہی تھی ڈاکٹر — ایک گورا ڈاکٹر — کہہ رہا تھا "بچہ بہت کمزور ہے۔ اور زخم بہت گہرا ہے۔ شاید سیپٹک بھی ہو گیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں صبح تک مر نہ جائے۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب۔ ایسا کیوں کہتے ہیں" نرس — ایک گوری نرس — نے کہا "کوشش تو کرنی چاہیئے۔ شاید بچ جائے۔ کتنا بھولا ہے۔ بیچارہ۔"

اور بچے کو ڈاکٹر کا کہنا اچھا معلوم ہؤا اور نرس کا کہنا بُرا۔" اب بھی میرے بچنے کی امید ہے!" اس نے سوچا" نہیں نہیں۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ اس زندگی میں مجھے کوئی سکھ نہیں ہے۔ یہاں زہریلی شہد کی مکھیاں کاٹتی ہیں۔ میں تو مرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ آسمان پر اللہ میاں کے پاس آرام سے رہوں۔ میرا باپ مجھے دیکھ کر کتنا خوش ہوگا۔" اور ہلکی سی آہ کے ساتھ اس کے منہ سے یہ آواز نکلی" وہ دیکھو ستارے۔ اچھے اچھے ستارے۔ مجھے بلا رہے ہیں۔"

موت نے زندگی کی طرف دیکھ کر فاتحانہ انداز سے مسکراتے ہوئے کہا" بس چند گھنٹوں کی اور دیر ہے۔ یہاں ہی نہیں دنیا کے کونے کونے میں میرا ہی راج ہے۔"

ایک بوڑھا

زندگی اور موت

مقابلہ سخت تھا۔

موت لشکر کے ساتھ لیکر آئی تھی۔ بڑھاپا، کمزوری، بھوک، جب پیٹ میں خوراک کا ایک دانہ نہ جائیگا تو زندگی کا چکر کیسے چل سکتا ہے۔

ستر برس کا بوڑھا ایک پلنگ پر پڑا تھا۔ اس کا بدن سُوکھا ہؤا تھا۔ نہ گوشت نہ خون۔ بس ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ۔ پیٹ کمر کو لگ گیا تھا۔ سات دن سے اس نے کچھ نہ کھایا تھا۔ بڑھتے ہوئے لشکر کی طرح کمزوری اس پر آہستہ آہستہ غلبہ پا رہی تھی۔ آواز بھی مشکل سے نکلتی تھی۔

مگر بوڑھے کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں زندگی کی ایک عجیب چمک تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بچوں کی سی مسکراہٹ۔ اس کے دل کی حرکت بے قاعدہ ہوگئی تھی مگر اس کا دماغ ایک لاجواب مشین کی طرح اب تک بالکل ٹھیک کام کر رہا تھا۔ اس کا سکرٹری پائنتی بیٹھا ہؤا اخبار پڑھ کر سُنا رہا تھا۔ تمام ملک میں بوڑھے کے فاقے نے ہلچل مچا دی تھی۔ ہزاروں نے حکومت سے اپیل کی تھی کہ اس کو چھوڑ دیا جائے۔ ہزاروں نے اِس سے اپیل کی تھی کہ وہ اکیس دن کے فاقے سے

اپنی جان جوکھوں میں نہ ڈالے۔ اخبار کے ایڈیٹر نے افتتاحیہ مضمون میں لکھا تھا "ہم امید کرتے ہیں کہ وہ اپنے ملک اور قوم کی خاطر اس فاقے کو توڑ ڈالیں گے اور اپنی قیمتی زندگی کو موت سے بچالیں گے۔ ہم کسی حالت میں اپنے محبوب قائد کی ہلاکت گوارا نہیں کر سکتے۔"

بوڑھے نے یہ سُنا اور مسکرا دیا۔

ایک نوجوان خطوں اور تاروں کا ایک انبار لیکر داخل ہوا۔ سب کا مضمون ایک ہی تھا۔ "خدا کے لئے فاقہ توڑ ڈالئے۔" "آپ کی جان قوم کی امانت ہے۔ اس کو ضائع نہ کیجیئے۔" بوڑھے نے سُنا اور مسکرا دیا۔

کئی ڈاکٹر داخل ہوئے اور بوڑھے کا معائنہ کرنے لگے۔ نبض، دل کی حرکت، زبان، آنکھیں اور بوڑھا دھیمی آواز میں ان سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتا رہا۔ ایک ڈاکٹر کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر بوڑھا بولا "ارے بھئی فاقہ میں کر رہا ہوں یا تم؟" اور اس کی آنکھیں ہنسنے لگیں۔

ڈاکٹر دوسرے کمرے میں مشورے کے لئے چلے گئے۔

ایک نے کہا "کمال ہے۔ سات دن ہو گئے۔ ایک دانہ پیٹ میں نہیں گیا۔ ایسی حالت میں زندہ رہنا بھی ایک معجزہ ہے۔"

دوسرے نے کہا "مگر دل کی حرکت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔"

تیسرے نے کہا "اسی سے تو میں بھی پریشان ہوں۔ بدن میں طاقت ہی نہیں ہے۔ کیسے موت کا مقابلہ کر سکتا ہے؟"

موت قریب ہی کھڑی یہ سب سُن کر فاتحانہ شان سے مسکرائی اور پھر بوڑھے کے کمرے میں جا کر اس کے سرہانے کھڑی ہو گئی۔

موت کو کوئی نہ دیکھ سکتا تھا۔ مگر بوڑھے کی بوڑھی بیوی نے محبّت کی آنکھوں سے جب اپنے شوہر کی طرف دیکھا تو اس کو سرہانے موت کھڑی ہوئی نظر آئی۔ اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے موت مسکرا رہی ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا سے دعا کی۔ "اے خدا میرے خاوند کی جان بچاؤ

میری جان لے لے۔ میری لاج تیرے ہاتھ ہے اے خدا۔ ایسا نہ ہو کہ میری موت سے پہلے میرا خاوند مجھ سے بچھڑ جائے۔"

پھر وہ بوڑھے کے پلنگ کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔ اس کا جی چاہتا تھا اپنے شوہر کے آگے ہاتھ جوڑے اور کہے۔ "میری خاطر یہ فاقہ توڑ ڈالو۔ اپنی جان سے نہ کھیلو" مگر اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ ساٹھ برس کی ازدواجی زندگی میں اس نے کبھی اپنے شوہر کے ارادوں کی مخالفت نہ کی تھی۔ اپنے مذہب کے قانون توڑے۔ متاہلی زندگی کو خیرباد کہا۔ دھن دولت کو تیاگ دیا۔ حکومت سے دشمنی مول لی۔ درجنوں بار قید ہوا۔ پھر بھی بیوی نے کبھی اُف نہ کی۔ اس کا پریم اس منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں "میں" اور "تو" کا سوال ہی نہیں رہتا۔ اس نے اپنی خودی کو شوہر کی خودی میں تحلیل کر دیا تھا۔ اب اس کا شوہر سے کہنا کہ وہ برت توڑ دے ایسا ہی تھا۔ جیسے وہ اپنے آپ سے کہے۔ وہ خاموش رہی مگر اپنی آنکھوں پر اس کو قابو نہ تھا۔ آنسوؤں سے اُمڈ آئیں۔

بوڑھے نے بیوی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے اور مسکرا کر بولا۔ "پگلی۔ پریشان مت ہو۔ میں مرونگا نہیں۔"

بیوی نے آنسو پونچھ ڈالے اور مسکراہٹ کی ہلکی سی جھلک سے جھریوں دار چہرہ چمک اُٹھا۔ یہ اُس نے بیوی کی پریشانی دُور کرنے کے لئے ہی نہیں کہا تھا۔ وہ واقعی زندہ رہنا چاہتا تھا۔ زندہ رہنے پر تُلا ہوا تھا۔ وہ زندگی کا قائل تھا۔ زندگی سے منہ موڑنا اس کے ایمان کے خلاف تھا۔ جبھی تو وہ موت سے اتنے اطمینان کے ساتھ کھیل سکتا تھا۔

بوڑھا تمام دنیا میں اپنی خصوصیات کے لئے مشہور تھا۔ کوئی اِس کو پاگل کہتا تھا کوئی چالاک سیاستدان، روحانی شعبدے باز، ننگا فقیر، اس کو کیا کیا خطاب نہ ملے تھے۔ حکومت نے اس کو باغی قرار دیکر پھر قید کر دیا۔ اس کے دشمن اسے غدّار، مکّار، دھوکے باز اور نہ جانے کیا کیا کہتے تھے مگر اس کی قوم کے کروڑوں انسان اس کے نام پر جان قربان کرتے تھے، اسکی پوجا کرتے تھے۔ مگر اس کی قوم کے لوگ، خود اس کے دوست اور رفقائے کار بھی اس بوڑھے کی بعض حرکتوں

کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ وہ کہتا تھا کسی جاندار کو دُکھ دینا پاپ ہے۔ اس نے اپنی قوم کو ہتھیاروں کے بغیر جنگ کرنا سکھایا تھا۔ دشمن کو سچائی اور عدم تشدد سے زیر کرنے کا گُر بتایا تھا کسی حد تک اِس میں کامیابی بھی ہوئی تھی مگر ایسے وقت میں جب چاروں طرف دنیا میں جنگ کے دیوتا کا دور دورہ ہو، جب خون کے دریا بہہ رہے ہوں، جب ہلاکت اور ظلم اور تشدد انسانی زندگی کے اصول بن چکے ہوں، اس کا عدم تشدد کی تعلیم دینا حماقت نہیں تو مضحکہ انگیز ضرور معلوم ہوتا تھا۔ وہ دشمن کو مارنا نہیں اپنانا چاہتا تھا۔ وہ بمبار ہوائی جہازوں، ٹینکوں، مشین گنوں، زہریلی گیس کا مقابلہ روحانیت اور سچائی کے مظاہرے سے کرنا چاہتا تھا۔ وہ مشینوں کیطرح سدھے ہوئے بے روح بے دماغ سنگدل ظالموں کے احساس انسانیت کو بیدار کرنا چاہتا تھا کوئی کہتا تھا وہ مہاتما ہے۔ کوئی کہتا وہ پاگل ہے۔

اس کی روحانیت سے انکار ہو مگر اس کی قیادت سے کسی کو انکار نہ تھا۔ وہ اپنی قوم کے جذبۂ آزادی کا مظہر تھا اور ان کی جنگِ آزادی میں ان کا جرنیل۔ اس نے کروڑوں انسانوں کو آزادی کے لئے کٹ جانا، مر جانا سکھایا تھا۔

حکومت نے بوڑھے، اور اس کے ساتھیوں کو قید کر دیا۔ ملک میں ایک آگ سی لگ گئی حکومت کے ظلم کا جواب لوگوں نے تشدد سے دیا۔ جان کا بدلہ جان اور آنکھ کا بدلہ آنکھ سے لیا۔ بوڑھا برسوں سے انقلابی تشدد کے طوفان کو روکے ہوئے تھا۔ جب وہ قید ہو گیا تو یہ طوفان قانون کی بندشوں کو توڑ کر تمام ملک میں پھیل گیا۔

اخباروں میں لمبے چوڑے بیان شائع ہوئے۔ مضمون لکھے گئے۔ کتابیں چھاپی گئیں۔ اور ان سب میں اعلان کیا گیا کہ اس تشدد کا تمام تر ذمہ دار یہ ننگا بوڑھا فقیر ہے۔ اہنسا کے پجاری کو ایک خونی بھیڑیئے کے رُوپ میں پیش کیا گیا۔ اس کے عمر بھر کے کام کو ملیامیٹ کرنے کی کوشش کی گئی۔ دنیا یہ سُن کر دنگ رہ گئی کہ عدم تشدد کے بھیس میں یہ بوڑھا تشدد پھیلا تا رہا تھا۔ اور بوڑھا خود قید میں تھا۔ ان الزامات کو پڑھ کر اس کی رُوح تلملا گئی۔ اس نے اپنی خودی

میں سے غصّہ اور نفرت نکال پھینکے تھے۔ وہ اپنے دشمنوں سے بھی پریم کرتا تھا۔ اس کا دل رنج اور افسوس سے بھر گیا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اس کے ساتھ اتنی سخت بے انصافی کی جائیگی۔ مگر وہ قید میں تھا۔ نہ کوئی خط لکھ سکتا تھا نہ بیان شائع کر سکتا تھا۔ دنیا کی نظر میں اپنے اصولوں کی لاج رکھے تو کیونکر؟ اپنے بدن کو بھوک کی سزا دے کر۔ موت سے مقابلہ کر کے۔ اس کے پاس تو بس ایک ہی نسخہ تھا جو پہلے بھی وہ پانچ بار استعمال کر چکا تھا۔

اس نے ملک کے حکمران کو لکھ بھیجا "آپ نے اور آپ کے افسروں نے مجھ پر عجیب عجیب الزام لگائے ہیں حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ چالیس برس سے میں سچائی اور عدم تشدد کے اصولوں کی تبلیغ کر رہا ہوں۔ اور مجھے جواب دہی کا کوئی موقع نہیں دیا گیا۔ ایسی حالت میں میرے لئے صرف ایک ہی راستہ ہے۔ وہ ہے فاقہ کر کے اپنے نفس کو مارنا۔ لہٰذا میں نے طے کر لیا ہے کہ میں اکیس دن فاقہ کرونگا۔ میرا مقصد اپنے آپ کو ہلاک کرنا نہیں ہے۔ نہ سیاسی اغراض کے لئے آپ کو اس طریقہ سے مجبور کرنا۔ بلکہ بے انصافی کے خلاف اس عدالت میں اپیل کرنا ہے۔ جو آپ کی اور دنیا کی ہر عدالت سے اونچی ہے۔ اگر میں اس دوران میں مر گیا تو میں اپنی بے گناہی پر پورا ایمان رکھتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہونگا۔ آئندہ نسلیں فیصلہ کر سکیں گی کہ کون انصاف پر تھا۔ آپ یا میں۔ دنیا کی ایک عظیم الشان سلطنت کا نمائندہ یا میرے جیسا ایک فقیر شخص جو اپنے ملک اور تمام انسانیت کا ادنیٰ خادم ہے۔"

اور اب اس تاریخی برت کے سات دن گذر چکے تھے۔ بوڑھا لمحہ بہ لمحہ کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ چالیس کروڑ انسان اس کی زندگی کے لئے دعا مانگ رہے تھے۔ ہزاروں اس سے درخواست کر رہے تھے کہ برت توڑ ڈالے۔ ڈاکٹر پریشان تھے۔ موت انتظار کر رہی تھی کہ کب اس لافانی روح کو سمیٹ کر عالم بالا کی طرف لے جائے۔

مگر بوڑھا بدستور مسکرا رہا تھا۔

ایک شہر

زندگی اور موت

مقابلہ سخت تھا۔

موت لشکر کے ساتھ لیکر آئی تھی۔ بمبار ہوائی جہاز، ٹینک، سینکڑوں میل کی مار کرنے والی توپیں، مشین گنیں، رائفلیں اور بندوقیں اور ریوالور، زہریلی گیس۔ اور سپاہیوں کے دَل بادل۔ بے روح اور بے دماغ سپاہی جن کو زندگی کے بجائے موت کی تعلیم دی گئی تھی، جن کے دلوں کو انسانیت، رحم، ہمدردی کے جذبات سے اس طرح خالی کر دیا گیا تھا جیسے لیموں کو آہنی انگلیوں سے نچوڑ کر سارا رس نکال دیا گیا ہو۔

ایک شہر، نوجوان شہر، موت کا مقابلہ کر رہا تھا۔

ایک شہر، فولاد کا شہر، جس کا نام اس دیش کے سب سے بڑے سورما کے نام پر رکھا گیا تھا۔ بے جگری سے دشمن کا مقابلہ کر رہا تھا۔ پورا شہر لڑائی کے میدان میں اترا ہوا تھا۔ مرد، عورتیں، بچے، فوجی سپاہی، ہوا باز، انجنیئر اور ڈاکٹر، مصنّف اور شاعر، اخبار نویس اور آرٹسٹ، موٹر ڈرائیور اور باورچی، معمار اور مزدور۔

شہر کی عمارتوں میں کوئی دیوار سالم نہ تھی۔ ہر جگہ بم کے لوگوں کے گھاؤ نمایاں تھے مگر گوشت اور پوست کی انسانی دیوار فولاد کی طرح اٹل کھڑی تھی۔ اس دیوار کو دشمن کے پے در پے حملے نہ ہٹا سکے تھے، نہ ہلا سکے تھے۔

شہر دریا کے کنارے بسا ہوا تھا۔ دریا کا پانی انسانی خون سے مل کر لال ہو گیا تھا۔

شہر میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ فیکٹریاں، کارخانے، سکول، کالج، ہسپتال، رہنے کے مکان، دکانیں، سڑکیں، باغات، پارک، وہ آج ہر جگہ تباہی ہی تباہی تھی۔ جہاں کبھی زندگی کا دور دورہ تھا وہاں آج موت کا راج بموں نے آگ لگا دی تھی۔ شہر کے کونے کونے سے دھوئیں کے کالے بادل اُٹھ کر آسمان کی طرف جا رہے تھے۔

اس شہر کے رہنے والے مہینوں سے اپنی زندگی، اپنے شہر کی زندگی کے لئے لڑ رہے تھے۔ ان کے رہنے کے مکان بمباری سے کھنڈر ہو گئے تھے۔ وہ دن رات خندقوں میں رہتے تھے۔ ہر لمحے شہر پر گولوں اور گولیوں کی بارش ہوتی رہتی تھی۔ وہ نہ سوتے تھے نہ آرام کرتے تھے۔ نہ ہنستے تھے نہ مسکراتے تھے۔ کپڑے پھٹ گئے تھے۔ داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں۔ آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں، پپوٹے پھولے ہوئے تھے۔ کئی کئی وقت فاقے سے گزر جاتے۔ بھوک اور پیاس کا احساس ہی رہ جاتا رہا تھا دن اور رات میں کوئی فرق نہ رہا تھا۔ دن میں دھوئیں کے بادلوں میں سورج چھپا رہتا اور رات کو شعلوں کی روشنی ہوتی! دن، تاریخ، وقت سب بے معنی ہو گئے تھے

اس شہر کی تاریخ عجیب تھی۔ ایک زمانہ میں یہ ایک معمولی قسم کا قصبہ تھا۔ اس کا نام ایک جابر اور ظالم بادشاہ کے نام پر رکھا گیا تھا۔ ان دنوں میں دنیا کے اور شہروں کی طرح یہاں بھی امیر بیکار پڑے پڑے عیش کرتے تھے اور غریب مزدور باوجود سخت محنت کرنے کے بھوکے مرتے تھے۔ پھر انقلاب کا طوفان اٹھا۔ مزدوروں اور کسانوں نے تخت و تاج کو مٹی میں ملا دیا۔ عوام کی حکومت قائم کی۔ مگر ظالم اور جابر، رجعت پسند اور سرمایہ دار یوں آسانی سے ماننے والے تھوڑے ہی تھے۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ خانہ جنگی کے شعلے ملک بھر میں بھڑک اٹھے۔ اسی شہر میں، اسی دریا کے کنارے، اس انقلابی جنگ کا ایک فیصلہ کن معرکہ ہوا۔ شہنشاہ پرستوں نے شہر پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر ایک مردِ میدان کے زیر کمان انقلابی فوجوں نے حملہ کیا، شہر کے لوگ استبداد اور ظلم کے خلاف کھڑے ہو گئے اور رجعت پسندوں کو شکست فاش ہوئی۔ شہر کا نام بدل کر اسی مردِ میدان کے نام پر رکھا گیا جس نے اس کو انقلاب اور آزادی کی خاطر دشمن کے پنجے سے بچایا تھا۔

پچیس برس میں اس شہر کی صورت ہی بدل گئی۔ جو مزدور اندھیرے، گندے، شکستہ مکانوں میں رہتے تھے ان کے لئے شاندار، خوبصورت عمارتیں بنائی گئیں۔ ان کے بچوں کے لئے سکولوں کالجوں کے دروازے کھول دیئے گئے۔ نوابوں، زمینداروں، سرمایہ داروں کے محلوں

میں مزدوروں کے لئے کلب اور ہسپتال قائم کئے گئے۔ نئے کارخانے قائم ہوئے۔ ریلیں، ٹرامیں
بجلی، تار، ٹیلیفون، پارک، تھیئٹر، سینما، لائبریریاں ـــــ اور ہر چیز کام کرنے والوں کے لئے۔
زندگی کی ایک نئی لہر شہر میں دوڑ گئی۔ نہ صرف اس شہر میں بلکہ اس دیش کے ہر شہر میں، ہر گاؤں
میں۔ آخر کار، ہزاروں برس کے بعد، انسان نے اپنی دنیا کی دولت پر خود قبضہ کر لیا۔ غاصبوں
اور ظالموں کو مار بھگایا۔ مزدور راج قائم ہوا۔ زندگی کی فتح ہوئی۔

مگر موت اور ہلاکت کے دیوتا کب خاموش بیٹھتے ہیں۔ دنیا میں امن اور چین، مساوات
اور عوام کی بہبودی دیکھ کر وہ جل جاتے ہیں۔ کوشش کرتے ہیں کہ پھر زندگی پر موت غلبہ پالے،
انصاف پر بے انصافی، مساوات پر استبداد، اجالے پر اندھیرا۔ موت کے لشکروں نے زندگی کے
اس عظیم الشان مظہر پر حملہ کر دیا، امن عالم کو پھر جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا۔

قتل و غارت کا طوفان خوفناک رفتار سے بڑھا۔ شیطانی دماغوں نے سائنس کی مدد سے
وہ وہ ہتھیار تیار کئے تھے کہ ان کے سامنے کوئی طاقت نہیں ٹھیر سکتی تھی۔ شہر ویران ہو گئے،
کھیتیاں جلا دی گئیں، لاکھوں کا خون ہوا، عورتیں بیوہ ہو گئیں اور بچے یتیم، زندگی کے قدم اکھڑ گئے

مگر اس شہر پر زندگی نے پھر قدم جمائے۔ موت کے لشکروں کو روک کر دشمن نے شہر کا
محاصرہ کر لیا۔ زندگی موت کے طوفانوں میں گھِر گئی۔

اور یونہی کئی مہینے سے مقابلہ ہو رہا تھا۔ دشمن اپنی بے پناہ قوت کو لئے شہر کے سامنے
پڑا تھا۔ شہر پر بمباری ہو رہی تھی۔ چاروں طرف آگ اور تباہی کے آثار نظر آتے تھے۔ شہر جل رہا
تھا۔ اور موت فاتحانہ انداز سے مسکرا رہی تھی۔

زندگی خاموش تھی۔ مگر زندگی کے قدم مستحکم تھے۔

ایک بچہ

زندگی نے اپنے ہتھیار اُٹھائے۔

صبح ڈاکٹر آیا تو اس نے دیکھا کہ بچّہ تکلیف سے کراہ رہا ہے۔ باوجود رنگ کالا ہونے کے اس کے چہرے پر خون کی کمی سے زردی جھلک رہی تھی۔ سانس بھی مشکل سے آ رہا تھا۔

"نرس!"

"جی، ڈاکٹر صاحب۔"

"آکسیجن!"

موت رنگیس کا زندگی بخش سلنڈر آتے دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ نلکی لگا ہوا قیف بچّے کی ناک پر رکھ دیا گیا۔ سانس آسانی سے آنے لگا۔ مگر چہرے پر زردی کی جھلک بدستور تھی۔

"نرس!"

"جی، ڈاکٹر صاحب!"

"نقلِ خون کرنا پڑیگا۔"

"میں حاضر ہوں۔"

"تمہارے خون کا امتحان ہو چکا ہے۔"

"جی ہاں۔ اس بچّے کے خون کا امتحان کرا کے مقابلہ بھی کرا لیا ہے۔"

"تمہیں اپنا خون ایک کالے بچّے کو دینے میں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

"جی نہیں۔ میں نسل و رنگ کے امتیاز کو نہیں مانتی۔"

"شاباش۔"

نرس کے گورے گداز بازو میں ایک موٹی سوئی گھسا دی گئی۔ ایک ربڑ کی نلکی میں سے ہو کر لال لال خون ایک بوتل میں جمع ہوتا گیا۔ بچّہ حیرت سے یہ سب دیکھتا رہا، جیسے کوئی نئی قسم کا کھیل ہو۔ پھر اس کے بازو پر سے آستین اُلٹ دی گئی۔

"ڈرنا مت۔ شاباش۔ بس ذرا سی تکلیف ہوگی۔"

بازو میں ایک ہلکی سی ٹیس ہوئی اور بوتل میں خون کم ہونے لگا۔

موت پریشان ہوگئی۔اس کے لشکر کے قدم اکھڑنے والے ہی تھے کہ اس نے نیا داؤ کھیلا بچّے کے کان میں کہا۔" زندہ رہنے سے کیا فائدہ۔دنیا میں کالے رنگ والوں کے لئے دکھ ہی دکھ ہے۔گندے، سڑے مکان، گوروں کی گالیاں اور ٹھوکریں۔اور پھر کوئی زہریلی شہد کی مکھی کاٹ لیگی۔زندہ رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔آسمان پر ستارے تمہیں بُلا رہے ہیں اور خود اللہ میاں انتظار میں کھڑے ہیں۔"

"نقل خون کا عمل ختم ہوگیا تو ڈاکٹر نے پوچھا۔

"کیوں بیٹا اب کچھ بہتر معلوم ہوتا ہے؟"

میں زندہ نہیں رہنا چاہتا، ڈاکٹر صاحب۔مجھے ستارے بُلا رہے ہیں ستارے اور اللہ میاں"

"نہیں بیٹا ایسی باتیں نہیں کرتے۔"تم جلد اچھے ہو جاؤ گے۔"

مگر بچّے کو اپنے تلخ تجربات یاد آرہے تھے۔اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بھیک مانگنے اور گالیاں کھانے کے لئے اس کو زندہ رکھنے پر کیوں ہر شخص تُلا ہوا تھا۔اس نے ڈاکٹر کی طرف سے منہ موڑ لیا۔

ڈاکٹر نے نرس سے کہا۔"جب تک وہ تعاون نہ کرے ہم مریض کو کیسے اچھا کر سکتے ہیں۔صحت کے لئے دوا سے زیادہ قوت ارادی کی ضرورت ہے۔"

یہ سن کر موت پھر فاتحانہ انداز سے مسکرادی۔"ہر جگہ میری ہی فتح ہے۔"

ایک بوڑھا

ایک بوڑھا مر رہا تھا۔ایک قوم زندہ ہو رہی تھی۔

انسان کے جسم کی مشین بھی عجیب ہے۔جب تک بدن کے سب اعضا ٹھیک اپنا اپنا کام نہ کریں کل پرزوں میں خرابیاں پیدا ہو ہی جاتی ہیں۔معدے میں اگر خوراک نہ جائے تو علاوہ کمزوری کے بدن میں زہریلے اثرات پیدا ہو جاتے ہیں۔

بارھویں دن ڈاکٹروں نے بوڑھے کے قارورہ کا کیمیائی معائنہ کیا تو اس میں ایک تشویشناک زہریلا مادہ پایا۔ اگر دو تین دن اور اسی طرح گذرے تو پھر جان کی خیر نہیں۔

ایک ڈاکٹر جو بوڑھے کا دوست بھی تھا اس کے پاس گیا اور کہا۔ "دیکھئے۔ اس وقت میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ نہ آپ کا دوست نہ چیلا۔ میرا فرض انسان کی جان بچانا ہے۔ آپ کے جسم میں خوراک نہ جانے سے زہریلے اثرات پیدا ہو رہے ہیں۔ آپ کی جان خطرے میں ہے۔ اس لئے مجھے آپ کو فاقہ توڑنے پر مجبور کرنا ہوگا۔"

بوڑھا کچھ سوچ کر ہلکے سے مسکرایا۔ طاقت اتنی کم ہوگئی تھی کہ وہ اب زور سے بول بھی نہ سکتا تھا ڈاکٹر نے اپنے کان سوکھے ہوئے ہونٹوں کے پاس لگا دیئے۔

"ڈاکٹر۔ یہ میری عزت کا معاملہ ہے۔"

"نہیں یہ آپ کی جان کا معاملہ ہے۔"

"اچھا کب تک مہلت دے سکتے ہو۔"

"چوبیس گھنٹے۔ اگر کل صبح بھی قارورہ میں یہ زہریلا مادہ نکلا تو آپ کو برت توڑنا ہی پڑیگا"

"اچھا بھئی۔ تمہاری مرضی۔" اور یہ کہہ کر بوڑھے نے آنکھیں بند کرلیں اور دل ہی دل میں پرارتھنا کی۔ "اے خدا میری لاج تیرے ہی ہاتھ ہے۔"

بوڑھے کا برت اس وقت نہ صرف ایک ملک بلکہ تمام دنیا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ دور دراز کے غیر ملکی اخباروں کے نمائندے ہوائی جہازوں سے اِس برت کی رپورٹ بھیجنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ ہر چند گھنٹوں کے بعد ڈاکٹر بوڑھے کی صحت کے متعلق بیان دے رہے تھے۔ چالیس کروڑ آنکھیں ادھر ہی لگی ہوئی تھیں۔ تار، ٹیلیفون، اخبار، ہر ممکن ذریعے سے منٹ منٹ کی خبر تمام ملک میں پھیل رہی تھی۔

ایک بوڑھا مر رہا تھا۔ ایک قوم زندہ ہو رہی تھی۔

ملک کے کونے کونے میں قوم پرستوں کے انقلابی مظاہرے۔ جلسے۔ جلوس۔ ریزولیوشن۔

حکومت کے نام تار۔ بوڑھے کی رہائی کے مطالبے، اخباروں میں مضامین، سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں کے بیان۔ ہر دل میں دھڑکن، جوش اور بوڑھے کی محبت۔

ایک صبح خبر آئی کہ خود دشمن کے کیمپ میں پھوٹ پڑ گئی۔ بوڑھے کے تین ہم قوموں نے جواب تک غیر ملکی حکمران کے مشیر خاص بنے ہوئے تھے استعفےٰ دیدیا۔

بوڑھے کو پلنگ پر لیٹے لیٹے یہ سب خبریں مل رہی تھیں۔ اس کا مشن کامیاب ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے ملک کو، اپنے اصولوں کو، پھر دنیا کے سامنے سرخرو کر دکھایا تھا۔ اس نے جان کی بازی لگا کر پھر پانسہ جیت لیا تھا۔ مگر اس کے تن اور من میں ایک زبردست جنگ ہو رہی تھی۔ اس نے ڈاکٹر سے وعدہ کر لیا تھا کہ اگر صبح تک زہریلے اثرات دُور نہ ہوئے تو وہ برت توڑ دیگا۔ برت ٹوٹ جائیگا۔ اس کا سب کیا کرایا کام خراب ہو جائیگا۔ اس کی عزّت خاک میں مل جائے گی۔ دنیا اس پر ہنسے گی۔ خیر اس کا اس کو کوئی خاص افسوس نہ تھا۔ مگر دنیا اس کے اصولوں پر ہنسےگی۔ نہیں وہ ایسا کبھی نہ ہونے دیگا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی قوتِ ارادی بدن کی گھٹتی ہوئی طاقت کے باوجود آستین چڑھا کر زہر کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔ مگر کیا بدن کا کیمیائی عمل ایک ستر برس کے بوڑھے کی رُوحانی قوت سے رُک جائیگا؟

موت زندگی کی امید پرستی پہ ہنس رہی تھی۔

ایک شہر

موت کے لشکر برابر بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ مگر زندگی نے ہار نہ مانی تھی۔

شہر کے مضافات پر دشمن کا قبضہ ہو گیا تھا۔ خود شہر کے آدھے حصّے میں گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ ہر سڑک، ہر گلی، ہر مکان پر بہادر ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے۔ ایک ایک اِنچ پر خون بہا رہے تھے، جان دے رہے تھے۔ عورتیں اور بچّے بندوقیں لئے لڑ رہے تھے۔ دشمن کے ہزاروں سپاہی کام آئے۔ مگر ان کے ٹینکوں، ہوائی جہازوں، توپوں کا آہنی

سیلاب بڑھتا ہی چلا آرہا تھا۔

موت خوش تھی ہنس رہی تھی۔ "چند روز کی بات ہے۔ فتح یقینی ہے۔"

مگر زندگی نے ابھی ہمت نہ ہاری تھی۔ شہر کے باشندے قسم کھائے ہوئے تھے کہ دشمن کو ہماری لاشوں پر سے اپنے ٹینک گزارنے ہونگے۔ گوشت اور خون کی ایک چٹان تھی جو دشمن کے راستے میں کھڑی تھی۔

آخر کونسا جذبہ تھا وہ، جو ان شہریوں کی ہمتوں کو اُبھارے ہوئے تھا؟ آزادی کا جذبہ مساوات اور انسانیت کا جذبہ۔

ایک سپاہی سے کسی غیر ملکی اخبار نویس نے پوچھا "کونسی وہ طاقت ہے جو تمہارے شہر کو اب تک دشمن کے بے پناہ لشکر دل کے خلاف لڑنے پر آمادہ کر رہی ہے؟"

سپاہی نے کہا "بھائی میری عمر چالیس برس ہے۔ معلوم ہے میں کہاں پیدا ہوا تھا۔ اسی شہر میں سوٗروں کے ایک اصطبل میں۔ وہیں سوٗکھی گھاس کے ایک ڈھیر میں ایک سورنی نے بچے دیئے تھے اور وہیں میری ماں نے مجھے جنا تھا۔ میرا باپ ایک زمیندار کا غلام تھا۔ میری ماں مجھے جنم دینے کے تیسرے دن ہی کام پر جانے کے لئے مجبور کی گئی۔ میں وہیں سورنی کے بچوں کے پاس پڑا رہتا تھا اور سردی لگتی تو ان سور کے بچوں کے ساتھ ان کی ماں کے گرم جسم سے لپٹ جاتا۔ یہ تھی ہماری زندگی اس زمانے میں۔ اور پھر انقلاب آیا اور کایا پلٹ ہوگئی۔ ہم انسان بن گئے۔ ہمارے لئے اچھے اچھے مکان بنے۔ ہسپتال اور کالج۔ میرا لڑکا اور لڑکی یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں۔ سمجھے۔ یہ ہیں انقلاب کے نتائج۔ اسی انقلاب کو بچانے کے لیے ہم آج اپنی جانیں دے رہے ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اگر دشمن کامیاب ہوگیا تو مزدوروں اور کسانوں کی حالت پھر جانوروں، کتوں اور سوٗروں سے بدتر ہو جائے گی۔ یہ موت اور زندگی کا سوال ہے، بھائی۔"

شہر کے مردوں اور عورتوں اور بچوں کی دیوار اٹل کھڑی رہی۔

اور پھر ایک دن خبر آئی کہ شمال کی طرف سے کمک آ رہی ہے۔ شہر میں ہر شخص کے چہرے پر زندگی اور بشاشت کے آثار نظر آنے لگے۔ ہمتیں بلند ہو گئیں۔ سینے تن گئے۔ موت کے لشکر کے قدم اکھڑنے لگے۔ موت گھبرا سی گئی۔

ایک بچہ

نرس پریشان تھی۔ اسکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح کالے بچے کے جذبۂ زندگی کو بیدار کرے۔ دن بھر وہ کروٹ لئے دیوار کی طرف منہ کئے ہوئے پڑا رہتا تھا۔ آکسیجن اور نقل خون نے اس کی جان بچا لی تھی۔ انجکشنوں نے زخم کے زہر کا اثر کم کر دیا تھا۔ مگر اس کی قوتِ ارادی نے زندگی سے عدم تعاون کر رکھا تھا۔ اور وہ دھیرے دھیرے موت کی تاریک گہرائیوں کی طرف پھسلتا جا رہا تھا۔

کالے بچے کے ننھے دماغ میں یہ خیال سمایا ہوا تھا۔ یہ گوروں کی دنیا ہے۔ ایک کالے آدمی کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ مر جائے۔ تمام گوری نسل کے خلاف اس کا دل نفرت اور غصے سے بھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر اور نرس دونوں اسی نسل سے تھے۔ اس لئے وہ انکی شکل بھی دیکھنا نہ چاہتا تھا۔ زبردستی دوا پلاتے تو پی لیتا۔ انجکشن کی تکلیف سہہ لیتا۔ لیکن پاس بیٹھ کر نرس اس سے بات کرنے کی، اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتی تو وہ کوئی جواب نہ دیتا اور دیوار کی طرف منہ کر لیتا۔

مگر نرس نے ہمت نہ ہاری تھی۔ وہ زندگی کی فوج کی بہادر سپاہی تھی۔ اس کا فرض موت کا مقابلہ کرنا تھا۔ اس کے علاوہ خود اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس کے دل میں ہر بچے کے لئے خواہ وہ کالا ہو یا گورا ایک مادرانہ جذبہ تھا۔ ہر بچہ اس کا بچہ تھا۔ اس کالے بچے کو بھی وہ اپنا بچہ ہی تصور کرتی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اسے مرنے نہ دے گی۔

ایک دن نرس کو بیٹھے بیٹھے ایک نئی ترکیب سوجھی۔ اس نے اپنا چھوٹا سا ریڈیو اٹھا کر

کالے بچے کے کمرے میں اس کے پلنگ کے پاس لگا دیا۔ بٹن دباتے ہی کمرہ موسیقی کی لہروں سے بھر گیا۔ بچے کے دل و دماغ میں موسیقی کے لئے ایک عجیب کشش تھی۔ شاید یہ ورثہ تھا جو اس کو اپنی نسل سے ملا تھا۔ جیسے ہی اس نے گانے کی آواز سُنی اس نے دیوار کی طرف سے منہ ہٹا کر دوسری طرف کر لیا۔ نرس ایک لکڑی کے صندوقچے کے پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔ آواز صندوقچے میں سے آ رہی تھی۔ کتنی سُریلی، کتنی میٹھی!

کتنے ہی دنوں کے بعد پہلی بار بچے کی آنکھوں میں زندگی کی چمک نظر آئی۔ وہ مسکرا دیا۔ نرس کو ایسا معلوم ہُوا جیسے اسے کسی نے دنیا کی سب سے بڑی نعمت بخش دی ہو۔

موسیقی کی نرم نرم بارش کمرے میں ہوتی رہی۔ بچے کو ایسا محسوس ہُوا جیسے اسکی روح کے زخموں پر کسی نے محبت بھرے ہاتھوں سے مرہم لگا دیا ہو۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ تاکہ ترنم کا یہ فردوسی چشمہ صرف کانوں کے ذریعے اس کے بدن کے ہر حصّے میں رس جائے۔

مگر تھوڑی دیر میں موسیقی کا پروگرام ختم ہو گیا۔ اناؤنسر کی آواز آئی۔

"اب لاسلکی کی لہروں پر ہم آپ کو ایک دور دراز ملک میں لیجاتے ہیں۔ جہاں سے ہمارا نمائندہ آپ کو دنیا کی ایک عجیب و غریب جنگ کا حال سنائیگا۔" اور پھر ایک دوسری اور کسی قدر دھیمی آواز — جیسے دُور سے آ رہی ہو — سنائی دی:۔

"میں جان سمتھ بول رہا ہوں۔ میں ایک جنگی رپورٹر ہوں۔ میں نے پچھلے بیس سال میں آدھی درجن جنگوں کی خبریں اخباروں اور ریڈیو کے ذریعے اپنے ملک والوں تک پہنچائی ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم۔ منچوریا کی لڑائی۔ جنگِ حبش۔ جنگِ ہسپانیہ۔ چین اور جاپان کی جنگ۔ اور اب یہ دوسری جنگِ عظیم۔ مگر آج میں آپ کو دنیا کی سب سے حیرتناک جنگ کا حال سناتا ہوں۔ یہ ہوائی جہازوں، توپوں، بندوقوں کی جنگ نہیں ہے۔ یہ زندگی اور موت کی جنگ ہے۔ اور میدانِ جنگ ایک بوڑھے آدمی کا کمزور جسم ہے جو سترہ دن سے فاقہ کر رہا ہے۔ . . . .

نرس نے پوچھا۔ "یہ پروگرام بدل کر کوئی دوسرا موسیقی کا پروگرام لگا دوں؟"

کالے بچّے نے کہا۔ "نہیں۔نہیں۔میں اِس بوڑھے کا حال سُننا چاہتا ہوں۔" نہ جانے کیوں اس کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اِس بوڑھے کی زندگی میں اور اس کی اپنی زندگی میں قریب کا تعلق ہے۔

ایک بوڑھا

موت ایک دفعہ پیچھے ہٹ کر پھر زور شور سے دھاوا کر رہی تھی۔

ڈاکٹر بوڑھے کی قوتِ ارادی کے معجزے پر متحیّر اور خوش تھے مگر اگلے چار دنوں کے خیال سے ہراساں تھے۔

قارورے میں جو زہر کا مادّہ پیدا ہونے لگا تھا وہ آپ سے آپ، بغیر کسی دوا کے، بغیر کسی غذا کے، دور ہو گیا تھا۔ سائنس حیران تھی، زندگی نازاں۔ اور بوڑھا مسکرا رہا تھا۔ اس کو ڈاکٹر فاقہ توڑنے پر مجبور نہ کر سکے۔ وہ اب تک زندہ تھا اس کا دماغ اب بھی کام کر رہا تھا۔ اسکی آنکھوں میں اب تک زندہ تھا۔ اس کا دماغ اب بھی کام کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی چمک تھی۔ اس کی مشہور حاضر جوابی کا اب بھی وہی حال تھا۔

مگر سترہ دن کے فاقے کا اثر ہونا ہی تھا۔ دل کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ حرکت برائے نام ہی تھی۔ ڈاکٹر آ لے لگا کر دیکھتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی گھڑی میں چابی ختم ہو رہی ہو اور اسکی رفتار اتنی دھیمی ہو جائے کہ ہر لمحے رُک جانے کا اندیشہ ہو۔

موت کو اپنی فتح کا پھر یقین ہو چلا تھا۔ مگر زندگی نے ہمّت نہ ہاری تھی۔

ایک بوڑھا مر رہا تھا۔ ایک قوم زندہ ہو رہی تھی۔

ملک کے کونے کونے میں، محلوں میں اور جھونپڑوں میں، کلب میں اور چوپال میں، ریل گاڑیوں میں، بیل گاڑیوں میں، ہر جگہ بس ایک چرچا، ایک خیال۔ ایک آرزو، صرف ایک اُمید۔ ——بوڑھے کی جان بچ جائے۔ وہ اپنے کڑے امتحان میں کامیاب ثابت ہو۔

مندروں میں اور مسجدوں میں، شوالوں میں اور خانقاہوں میں، گرجاہیں اور اگیاری میں اس کی زندگی کے لئے دعائیں کی جارہی تھیں۔ نماز کے بعد بوڑھی مسلمان عورتیں گڑگڑا کر خدا سے التجا کر رہی تھیں "اے رحیم وکریم۔ ہماری قوم کے بوڑھے باپ کی جان بخش دے"۔ پوجا اور گیتا پاٹھ کے بعد بوڑھی ہندو عورتیں بھگوان سے پرارتھنا کر رہی تھیں "اے بھگوان۔ تو بڑا دیالو ہے، ہم پر، ہمارے دیش پر، کرپا کر"۔ بچے دو دو وقت کے فاقے کر رہے تھے تاکہ کھانے کی قیمت بچا کر خیرات کر دیں۔ شادیاں اور خوشیاں، جشن اور جلسے، تہوار اور ریج اس وقت تک کے لئے ملتوی کر دیئے گئے تھے۔ جب تک بوڑھے کا فاقہ خیریت سے ختم نہ ہو

بوڑھا مر رہا تھا اور اس کا اصول، اس کا دھرم، زندہ ہو رہا تھا۔ تمام دنیا اس کے خیالات میں دلچسپی لے رہی تھی۔ اس کی کتابیں، اس کے مضامین، کو غور سے پڑھا جا رہا تھا۔ اسکی روحانی سیاست کا مقابلہ دنیا کے حکمرانوں کی چالبازی اور خودغرضی سے کیا جا رہا تھا۔ لوگ حیران تھے کہ کونسی طاقت ہے جو اس ضعیفی اور کمزوری کی حالت میں اس ستر برس کے بوڑھے کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ بوڑھے اور اس کے اصولوں کے ساتھ ساتھ اس کی قوم کی جنگ آزادی کا بھی پرچار ہو رہا تھا۔ ایک فرد کے فاقے نے دنیا کے چالاک سیاست دانوں کو پریشان کر دیا تھا۔

ایک بچہ

نرس از حد خوش تھی۔

جب سے کالے بچے کے کمرے میں ریڈیو لگا تھا اس کی حالت میں حیرتناک تبدیلی ہو گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اسے زندگی میں نئے سرے سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اب وہ کبھی دیوار کی طرف منہ کر کے نہ لیٹتا۔ اس کا مزاج بھی چڑچڑا نہ رہا تھا۔ وہ خوشی خوشی دوا پیتا۔ انجکشن لگوا لیتا، ڈاکٹر اور نرس دونوں سے ہنس کر بات کرتا۔

ریڈیو کے جادو بھرے ڈبے میں سے موسیقی کا چشمہ بہتا اور وہ گھنٹوں لیٹا لیٹا آنکھیں بند

کئے ہوئے اس کی نرم نرم لہروں میں بہتا رہتا۔ مگر بارہ بجے جب اناؤنسر کہتا۔ "اب لاسلکی
کی لہروں پر ہم آپ کو ایک دور دراز ملک میں لیجاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔" وہ آنکھیں کھول کر تکیوں کے
سہارے لگ کر بیٹھ جاتا۔ نہ جانے اس کو دور دراز ملک کے بوڑھے سے اتنا لگاؤ کیوں ہوگیا تھا
شاید اس لیئے کہ اس نے جنگی رپورٹر کی زبانی سنا تھا کہ بوڑھے کو بچّوں سے بہت محبت ہے شاید
اس لیئے کہ عمر بھر بوڑھا گوروں کی ایک زبردست حکومت کے خلاف بے ہتیاروں کی جنگ کرتا
رہا تھا۔ خود اس کا یہ فاقہ بھی اسی جنگ کا ایک معرکہ تھا۔ کالے بچّے نے سُنا تھا کہ بوڑھے نے
اپنے ملک کے کروڑوں کالے رنگ کے لوگوں کو خودداری سکھائی تھی۔ خودداری، خود اعتمادی
آزادی اور اصولوں کے لیئے لڑ جانا، مرجانا۔ ان باتوں کو سن کر کالے بچّے کے ذہن پر سے
ناامیدی اور مایوسی کے بادل چھٹ جاتے اور وہ سوچتا میں بھی جب بڑا ہو جاؤنگا تو اس
بوڑھے کی طرح اپنے ساتھیوں کو آزادی کے لیئے لڑنا اور مرنا سکھاؤں گا۔

مگر جب اس نے ریڈیو پر سُنا کہ بوڑھے کی حالت نازک ہوتی جارہی ہے اور اکیس دن کے
فاقے سے جانبر نہ ہو سکے گا تو کالے بچّے کو ایسا محسوس ہُوا جیسے خود اس کے جسم سے تندرستی اور
زندگی نکلی جارہی ہے۔ اس کا دل بجھ سا گیا۔ وہ بہت دیر تک اپنے پلنگ پر چپکا آنکھیں بند کیئے
پڑا رہا۔ اس عرصے میں ریڈیو نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ اس نے کچھ نہ سُنا۔ مگر پھر بندوقیں چلنے کی اور
بم پھٹنے کی خوفناک آواز آئی تو وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ اناؤنسر کہہ رہا تھا۔

"ڈریئے مت۔ یہ بم آپ کے گھر سے چھ ہزار میل کے فاصلے پر پھٹ رہے ہیں۔ لاسلکی
کے ذریعے صرف ان کی آواز ہم آپ تک پہنچا رہے ہیں تاکہ آپ نہ صرف اس جنگ کا حال ہی
سن سکیں بلکہ خود اپنے کانوں سے اس اصلی جنگ کی اصلی آوازوں کو بھی سن سکیں۔ یہ جنگ آپ
کے گھروں سے بہت دور ہو رہی ہے۔ مگر یہ آپ ہی کی جنگ ہے۔ آپکے اصولوں کی خاطر،
آپ کی آزادی کی خاطر، آپ کی ماں بہنوں کی عزّت کی خاطر لڑی جارہی ہے۔ لال لشکر کے
یہ بہادر سپاہی جو گاتے ہوئے میدانِ جنگ کی طرف جا رہے ہیں یہ آپ کے ساتھی ہیں۔ آپکے

یہ دشمن کو اپنے گوشت پوست کی دیوار سے روکے ہوئے ہیں۔ اپنی جان کی قربانی دے کر آپکے وطن کی حفاظت کر رہے ہیں۔ انکی آواز آپ کی آواز ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اور پھر کالے بچّے کا کمرہ ایک پُرجوش گانے سے گونج اُٹھا۔ لال لشکر کے سپاہیوں کا گیت ایک نامعلوم زبان میں تھا۔ وہ اس کا مطلب نہ سمجھ سکتا تھا مگر ان آوازوں میں وہی خود فراموشی، وہی جوش، وہی خلوص تھا جو اس کو اپنے کالے لوگوں کے گانوں میں ملتا تھا۔ اس کا جی چاہا وہ بھی ان سپاہیوں کے ساتھ ہوتا اور اسی طرح گاتا ہوا میدانِ جنگ کی طرف جاتا۔

گانا آہستہ آہستہ دور ہوتا گیا۔ پھر اناؤنسر کی آواز آئی۔

"آیئے آپ کو ہم اس شہر کی سیر کرائیں جو اپنی شجاعت کی وجہ سے دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیگا۔ وہ شہر جو سال بھر سے دشمن کی بے پناہ فوجوں کے خلاف ڈٹا ہوا ہے، وہ شہر جس میں کوئی عمارت سالم نہیں، جہاں رات دن موت کی بارش ہوتی ہے، جہاں چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے، مگر جہاں کے مرد، عورتیں اور بچّے اپنے شہر اور اپنے ملک کی آزادی کی خاطر ایک ایک انچ پر کٹ رہے ہیں، مر رہے ہیں، مگر پیچھے نہیں ہٹ رہے۔"

ریڈیو میں سے گڑگڑاہٹ کی آواز آئی۔ ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ۔ ہوائی جہازوں کی خوفناک گونج۔ گولوں کے دھماکے۔ گولیوں کی سنسناہٹ۔ اور کالا بچّہ اپنے زخم کی تکلیف بھول گیا۔ اس کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک ہسپتال میں نہیں ہے بلکہ اس شہر میں ہے، جہاں لال لشکر دشمن کے خلاف ڈٹا ہوا ہے۔ اور اس کو یقین ہوگیا کہ نہ لال لشکر پیچھے ہٹیگا نہ وہ خود موت کے سامنے ہار مانے گا۔

ایک شہر

شہر سے میل بھر باہر دشمن کی فوجیں خندقوں میں پڑی تھیں۔ وہ وہاں سال بھر سے پڑی ہوئی تھیں۔ برسات کی بارش، کیچڑ، جاڑے کی برفباری، خون کو جما دینے والی سردی — کیا کچھ ان کو برداشت نہ کرنا پڑا تھا۔ مگر جس چیز نے ان کے قدم اکھاڑ دیئے تھے، ان کے

حوصلے پست کر دیئے تھے، وہ شہر والوں کی ہمّت تھی جو باوجود ہتیاروں کی کمی کے لڑتے ہی جاتے تھے۔ دشمن کی فوج کے ہر سپاہی کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا مقابلہ معمولی اِنسانوں سے نہیں بلکہ ایسی مافوق البشر ہستیوں سے ہے۔ جن پر کوئی ہتیار کارگر ثابت نہیں ہوتا۔

ایک دفعہ نہیں، دو دفعہ نہیں، درجنوں بار، سینکڑوں بار دشمن کی فوج نے شہر پہ دھاوا کیا تھا۔ ہوائی جہازوں سے بمباری کر کے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ ٹینکوں کے آہنی ہاتھیوں کو ساتھ لیکر حملہ کیا تھا۔ مضافات کو تاخت و تاراج کرتے ہوئے شہر کے بیچوں بیچ پہنچ گئے تھے۔ مگر پھر شہر والوں نے ان کو مار بھگایا تھا اور انہیں دوبارہ اپنی خندقوں میں، بڑی بڑی توپوں کے سائے میں، پناہ لینی پڑی تھی۔ یہ شہر والے فوجی اصولوں سے بالکل ناواقف تھے۔ ان کو معلوم ہی نہیں تھا کہ قاعدے سے وہ ہار چکے تھے۔ لڑے ہی جاتے تھے۔ مرے ہی جاتے تھے۔ اور لڑتے بھی تو کتنے اوٹ پٹانگ طریقے سے۔ نہ کوئی باقاعدہ باوردی فوجی دستے۔ نہ ٹینک۔ نہ ہوائی جہاز۔ بس ہر ایک شہری ایک بندوق ہاتھ میں لئے اس طرح لڑ رہا تھا جیسے یہ اس کی اپنی لڑائی ہو۔ جب دشمن کے ٹینک اور فوجی دستے سڑکوں پر سے گذرتے ہوئے شہر کے بیچ میں پہنچ جاتے تو ہر ٹوٹے پھوٹے مکان، ہر کھنڈر، ہر دروازے، ہر کھڑکی، ہر سوراخ میں سے ان پر گولیوں کی بارش ہوتی۔ اور شہر والوں کے جُھنڈ کے جُھنڈ انقلابی نعرے لگاتے ہوئے، اپنی جان کی پروانہ کرتے ہوئے ٹینکوں پر ٹوٹ پڑتے۔ خوفناک اور گھمسان کی دست بدست لڑائی ہوتی اور دشمن کے دستوں کو پیچھے ہٹنا ہی پڑتا۔

اور اب خبر آئی تھی کہ لال لشکر کے کئی بڑے دستے شہر کی مدد کو آرہے ہیں۔ دشمن کی فوج کا جرنیل گھبرایا ہوا تھا۔ نہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ اس کی فوجیں سال بھر سے پڑی ہوئی تھیں مگر یہ کمبخت شہر تھا کہ فتح ہی نہیں ہوتا تھا۔ ایسا شہر اس نے نہ کبھی دیکھا

تھا نہ سُنا تھا۔ پچھلے تین سال میں مختلف ملکوں میں درجنوں شہروں پر اس نے اور اس کی فوجوں نے حملہ کیا تھا اور ہر شہر پر تھوڑی بہت لڑائی کے بعد قبضہ کر لیا تھا۔ مگر یہ شہر عجیب تھا جس کے رہنے والے ہار کے لفظ ہی سے ناواقف تھے، زیر ہونا جانتے ہی نہیں تھے۔ اور اب اگر عقب سے لال لشکر کے دشمنوں نے حملہ کر دیا تو اس کی فوج کا توچکّی کے دو پاٹوں میں پس کر خاتمہ ہی ہو جائیگا۔

اس نے ٹیلیفون کے ذریعے اپنے ملک کے جابر حکمراں کو خبر بھیجی کہ حالت نازک ہوتی جا رہی ہے۔ اس کو اجازت دی جائے کہ وہ اپنی فوج کو پیچھے ہٹا لے۔ اس شہر کو فتح کرنے کا خیال چھوڑ دے۔

جابر حکمراں ہزاروں میل پرے آرام سے اپنے گرم کمرے میں گدّے دار کرسی پر بیٹھا ہُوا تھا اس کو تو بس ایک ہی دُھن تھی۔ "نہیں۔ یہ شہر فتح ہونا چاہیئے۔ چاہے کچھ ہی ہو جائے۔ پروا نہیں۔ تم لڑتے جاؤ۔"

جرنیل نے ٹیلیفون رکھ دیا۔

ایک سپاہی گھبرایا ہوا داخل ہُوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، جیسے اس نے دن دہاڑے کوئی بھوت پریت دیکھ پایا ہو۔ بڑی مشکل سے وہ کہہ پایا۔

"لال لشکر نے شمال کی جانب سے حملہ کر دیا ہے۔"

ایک اور سپاہی دوڑا ہُوا آیا۔

"شہر والے ہماری خندقوں پر ٹوٹ پڑے ہیں۔"

ایک بوڑھا

بوڑھے کا آخری وقت تھا۔ موت سرہانے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

فاقے کے بیس دن گزر چکے تھے۔ آج آخری دن تھا۔ مگر ڈر تھا کہ شاید یہ بوڑھے کی

زندگی کا آخری دن ثابت ہو۔ دل کی حرکت برائے نام رہ گئی تھی۔ کمزوری بیحد بڑھ گئی تھی۔

بوڑھے کے دشمن، اس کو قید کرنے والے، اس کی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ چند گھنٹوں، چند منٹوں کی دیر ہے۔

بوڑھے کو قید کرنے والے اس کے کریا کرم کا انتظام کر رہے تھے۔ چتا کے لئے صندل کی لکڑیاں منگالی گئی تھیں۔ کفن کا انتظام ہو گیا تھا۔ اخباروں کے لئے بوڑھے کی موت کے اعلان کا مسوّدہ بھی تیار تھا۔ "نہایت افسوس کے ساتھ اعلان کیا جاتا ہے کہ آج ——— بجے" صرف وقت کے لیے جگہ چھٹی ہوئی تھی۔

ایک قوم کے دل میں اُمید کا دیا بجھنے کے قریب تھا۔

بوڑھے کی آنکھیں کمزوری کے باعث بند تھیں۔ مگر جب کھلتی تھیں تو ان میں وہی چمک، وہی زندگی، موت کے سائے کا نام نہیں حالانکہ اس کے بدن کی قوت جواب دے چکی تھی۔ معلوم ہوتا تھا بوڑھے کی ساری جان سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی ہے۔ بوڑھے کی زندگی کا انحصار بدن کی قوت پر ہے ہی نہیں۔

بوڑھے نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا کیا خبر ہے۔ اس کو بتایا گیا کہ اس کو قید کرنیوالے اس کے کریا کرم کا انتظام کر رہے ہیں۔ بوڑھے کی آنکھیں ہنسنے لگیں۔

موت گھبرا گئی۔

آخری چند گھنٹوں میں موت نے بے تحاشا پے در پے حملے کئے۔ دل کی حرکت تقریباً روک دی۔ بدن کی طاقت سلب کر لی۔ بیہوشی کا غلبہ کیا۔ مگر ایک لافانی رُوح پر، ایک نڈر دل پر، موت کا کوئی ہتھیار کارگر نہ ہو سکا۔

اکیس دن پُورے ہو گئے۔ بوڑھے نے آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

بوڑھے نے اپنی بیوی کے ہاتھ سے سنترے کے عرق کا ایک گلاس پیا۔

بوڑھے کے قید کرنے والوں نے کریا کرم کا سامان چپکے سے ہٹوا دیا۔

موت نے اپنا بستر بوریہ سنبھالا۔

ایک شہر

دشمن لال لشکر کے نرغے میں پھنس گیا۔ سوائے ہتیار ڈالنے کو کوئی چارہ نہ رہا۔ شہر کے کھنڈر فتح اور شادمانی کے نعروں سے گونج اٹھے۔

موت نے اپنے کان بند کر لئے۔

ایک بچّہ

"نرس!"

"ہاں، بیٹا!"

"وہ بوڑھا اکیس دن کے فاقے کے بعد بھی بچ گیا۔"

"ہاں، بیٹا۔ کتنی خوشی کی بات ہے۔"

"اور نرس!"

"ہاں بیٹا!"

"وہ شہر بھی دشمن کے نرغے سے نکل آیا۔ دشمن کی فوجیں قید ہو گئیں۔"

"ہاں، بیٹا۔ جو آزادی کے لئے مرنا جانتے ہیں وہ کبھی نہیں ہارتے۔"

"تو نرس!"

"ہاں، بیٹا!"

"مجھے بھی دوا پلا دو۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔"

راجندر سنگھ بیدی

کوکھ جلی

گھمنڈی نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

گھمنڈی کی ماں اس وقت صرف اپنے بیٹے کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اُسے اچھی طرح سے اس بات کا علم تھا کہ پہلے پہر کی نیند کے چوک جانے سے اب اُسے سردیوں کی پہاڑ ایسی رات جاگ کر کاٹنا پڑے گی چھت کے بیمچے اور لاتعداد سرکنڈے گننے کے علاوہ مڈیوں کی اُداس اور پریشان کن آوازوں کو سننا ہوگا۔ دروازے پر زور زور کی دستک کے باوجود وہ کچھ دیر کھاٹ پر بیٹھی رہی۔ اس لئے نہیں کہ وُہ اس سردی میں گھمنڈی کو باہر کھڑا کرکے، اُس کے گھر میں دیر سے آنے کی عادت کے خلاف آواز اُٹھانا چاہتی تھی —— بلکہ اسلئے کہ گھمنڈی اب آہی تو گیا تھا۔ یوں بھی بوڑھی ہونے کی وجہ سے اس پر ایک قسم کا خوشگوار آلکس، ایک میٹھی سی بے حسی چھائی رہتی تھی۔ وہ سونے اور جاگنے کے درمیان معلق رہتی۔ . . . کچھ دیر بعد ماں خاموشی سے اُٹھی چارپائی پر پھر سے اوندھے لیٹ کر اس نے اپنے پاؤں چارپائی کے دوسری طرف لٹکائے اور گھسٹ کر کھڑی رہی۔ شمعدان کے قریب پہنچ کر اس نے بتی کو اونچا کیا۔ پھر واپس،

آکر کھاٹ کے سانگھے میں چھپائی ہوئی ہلاس کی ڈبیا نکالی اور اطمینان سے دو چٹکیاں اپنے نتھنوں میں رکھ کر، دو گہرے سانس لیئے، دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ لیکن تیسری دستک پر یوں معلوم ہوا جیسے کواڑ ٹوٹ کر زمین پر آ رہیں گے

"ارے تھم جا، اُجڑ گئے۔" ماں نے برہم ہو کر کہا۔ "مجھے اتنا انتظار و کھانا ہے اور آپ ایک پل بھی تو نہیں ٹھہر سکتا۔"

کواڑ کے باہر، گھمنڈی کے کانوں پر لپیٹے ہوئے مفلر کو چیرتے ہوئے ماں کے یہ الفاظ گھمنڈی کے کانوں میں پہنچے ــــ "اُجڑ گئے۔۔۔۔" ماں کی یہ گالی گھمنڈی کو بہت پسند تھی۔ ماں اپنے بیٹے کے بیاہ کا تذکرہ کرتی اور بیٹا بظاہر بے اعتنائی کا اظہار کرتا۔ جب بھی وہ یہی گالی دیتی تھی۔ ایک پل میں گھر کو بسا دینے اور اُجاڑ دینے کا ماں کو خاص ملکہ تھا۔

اس طور پر اُتاولے ہونے کا گھمنڈی کو خود بھی افسوس ہوا۔ اس نے مفلر سے اپنے کان اچھی طرح سے ڈھانپ لئے اور جیب سے چرائے ہوئے میکر دپولو کا ٹکڑا سلگا کر کھڑا ہو گیا۔ شاید "آگ" کے قریب ہونے کا احساس اُسے بے پناہ سردی سے بچالے۔ پھر وہ میکر وپولو کو ہوا میں گھما کر کُنڈل بنانے لگا۔ یہ گھمنڈی کا محبوب مشغلہ تھا جس سے اس کی ماں اسے "اوگن" بتا کر منع کیا کرتی تھی۔ لیکن اس وقت کُنڈل سے نہ صرف تسکین ملحوظِ خاطر تھی بلکہ ماں کے ان پیارے الفاظ کے خلاف ایک چھوٹی سی، غیر محسوس بغاوت بھی۔

سگریٹ کا آوارہ جگنو ہوا میں گھومتا رہا، گھومتا رہا۔ گھمنڈی اب ایک اور دستک دینا چاہتا تھا۔ لیکن اُسے خود بھی اپنی احمقانہ حرکت پر ہنسی آ گئی۔ وہ لوگ بھی کتنے احمق ہوتے ہیں، اس نے کہا، جو ہر مناسب اور نامناسب جگہ اپنا وقت ضائع کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب انہیں کسی جگہ پہنچنا ہوتا ہے تو وقت کی ساری کسر سائیکل کے تیز چلانے یا بھاگ بھاگ کر جان ہلکان کرنے میں لگا دیتے ہیں اور یہ سوچتے ہوئے گھمنڈی نے سگریٹ کا ایک کش لگایا اور دروازے کے ایک طرف، نالی کے قریب دبک گیا۔

دھوبیوں کی کنٹری میں اُگا ہوا گوندی کا درخت پھوا کے سامنے جُھک گیا تھا۔ جھکاؤ کیطرف ٹہنیوں میں چاند کی ہلکی سی پھانک الجھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ ماں نے ضرور آج گلے میں دوپٹہ ڈالکر، دوپٹے کے پھوئیں ایکم کے چاند کی طرف پھینکے ہوں گے۔ اس کے بعد ایکا ایکی سائیں سائیں کی بھیانک سی آواز بلند ہوئی۔ ہوا، چاند کی پھانک اور گوندی کا درخت مل جُل کر اُسے ڈرانے والے ہی تھے کہ ماں نے دروازہ کھول دیا۔۔۔۔۔۔

"ماں، می می۔۔۔۔۔" گھمنڈی نے کہا اور خود دروازے سے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اس سے ایک لمحہ پہلے وہ اپنے دانتوں کو بھینچ رہا تھا۔

"آجاؤ" ماں نے کچھ رکھائی سے کہا اور بولی "آجاؤ ___ اب ڈرتے کیوں ہو۔ تمہارا کیا خیال تھا۔ مجھے پتہ نہیں چلے گا؟۔۔۔۔۔"

گھمنڈی کو ایک معمولی سا خیال آیا کہ ماں کے منہ میں ایک بھی دانت نہیں ہے لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "کس بات کا پتہ نہیں چلے گا؟"

"ہوں"۔ ماں نے دیئے کی بے بضاعت روشنی میں سر ہلاتے اور چڑاتے ہوئے کہا۔ "کس بات کا پتہ نہیں چلے گا"۔۔۔۔ گھمنڈی کو پتہ چل گیا کہ ماں سے کسی بات کا چھپانا عبث ہے ماں ___ جو خود چوبیس سال ایک شرابی کی بیوی رہی ہے۔۔۔۔ گھمنڈی کا باپ جب بھی دروازے پر دستک دیا کرتا، ماں فوراً جان لیتی آج اس کے مرد نے پی رکھی ہے۔ بلکہ دستک سے اسے پینے کی مقدار کا بھی اندازہ ہو جاتا تھا۔ پھر گھمنڈی کا باپ، اسی طرح دبکے ہوئے داخل ہوتا اسی طرح پھوا کے شور کو شرمندہ کرتے ہوئے۔۔۔۔ اور یہی کوشش کرتا کہ چپکے سے سو جائے اور اسکی عورت کو پتہ نہ چلے، لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ شراب کے متعلق گھمنڈی کے ماں باپ میں ایک ان لکھا اور ان کہا سمجھوتہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھ جاتے تھے۔ پینے کے بعد گھمنڈی کا باپ، ایک بھی وافر لفظ منہ سے نہ نکالتا اور اسکی ماں اپنے مرد کو پینے کے متعلق کچھ بھی نہ جتاتی۔ وہ چپکے سے کھانا نکال کر اُس کے سرہانے رکھ دیتی اور سونے سے

معمول کے خلاف پانی کا ایک بڑا کٹورہ چارپائی کے نیچے رکھ کر ڈھانپ دیتی۔۔۔ صبح ہوتے ہی اپنے پلو سے ایک آدھ سکہ کھول کر گھمنڈی کی طرف پھینک دیتی اور کہتی ——

"لے، ادھ بلویا لے آ——"

اور گھمنڈی بھی اپنے باپ کے لئے شکر ڈلوا کر ادھ بلویا دہی لے آتا جسے پی کر وہ خوش ہوتا، روتا، توبہ کرتا اور پھر "ہات سے جنت نہ گئی" کو جھٹلاتا۔۔۔ گھمنڈی نے ماں کے منہ سے یہ بات سن کر خفت کی ہنسی ہنس دی اور بولا —— "ماں؟ —— ماں! تو کتنی اچھی ہے۔۔۔۔۔" پھر گھمنڈی کو ایک چکر آیا۔ شراب ہوا کے جھونکوں سے اور بھی پُر اثر ہو گئی تھی۔ سگریٹ کا جگنو جو اپنی فاسفورس کھو چکا تھا، دور پھینک دیا گیا اور ماں کا دامن پکڑتے ہوئے گھمنڈی بولا۔ "اور لوگوں کی ماں اُن کی بیوی ہوتی ہے، لیکن تو میری ماں ہی ماں ہے۔۔۔۔۔"

اور دونوں کراس احمقانہ فقرے پر ہنسنے لگے۔ دراصل اس چھوکرے کے ذہن میں بیوی کا نقشہ مختلف تھا۔ گھمنڈی سمجھتا تھا، بیوی وہ عورت ہوتی ہے جو شراب پی کر گھر آئے ہوئے خاوند کی جوتوں سے تواضع کرتی ہے۔ کم از کم، رولنگ ملز کے مستری کی بیوی جس کے ماتحت گھمنڈی شاگرد تھا اپنے شرابی شوہر سے ایسا ہی سلوک کیا کرتی تھی۔ اور اس قسم کے جوتی پیزار کے قصے آئے دن سننے میں آتے تھے پھر کوئی ماں بھی اپنے بیٹے کو اس قسم کی حرکت کرتے دیکھ کر اچھا سلوک نہیں کرتی۔ بخلاف ان سب کے گھمنڈی کی ماں۔ ماں تھی! ایک وسیع دل کے مترادف جس کے دل کی پہنائیوں میں سب گناہ چھپ جاتے تھے، دھل جاتے تھے۔۔۔۔۔ اور اگر گھمنڈی کے اس بظاہر احمقانہ فقرے کی اندرونی صحت کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کی متناقض شکل میں گھمنڈی کی ماں، اپنے شوہر کی بھی ماں تھی!

بستر پر دھم سے بیٹھتے ہوئے، گھمنڈی نے اپنے ربڑ کے جوتے اُتارے۔ یہ جوتے سردیوں میں برف اور گرمیوں میں انگارہ ہو جاتے تھے لیکن ان جوتوں کو پہنے ہوئے کون کہہ سکتا تھا کہ گھمنڈی ننگے پاؤں گھوم رہا ہے۔۔۔۔ گھمنڈی ہمیشہ کی طرح جوتے اُتار کر گرم کرنے کے لئے چولہے پر رکھ دیتے۔ ماں پھر چلائی —— "ہے، مرے تیری ماں بھگوان کرے لے۔۔۔۔ ہے، گور

بھوگ لے تو کوُ" لیکن ہندو دھرم بھرشٹ ہوتا رہتا۔ ماں جُوتے اُتار کر دُور کونے میں پھینک دیتی۔ پھر بکتی جھکتی اپنے دامن میں ایک چونی باندھ، گھمنڈی کے سرہانے پانی کا ایک بڑا سا کٹورہ رکھ متعفن بستر کی آنتوں میں جا دبکتی ——!

حد ہو گئی، ماں نے دو تین مرتبہ سوچا۔ گھمنڈی نے بنواری اور رُسید، کی سنگت چھوڑ دی ہے اس نے گھمنڈی کو شراب پینے سے منع بھی نہیں کیا۔ اور نہ اپنے اوباش سنگی سنگاتی کے ساتھ گھومنے سے۔ ماں نے سوچا۔ شاید یہ نرمی کے برتاؤ کا اثر ہے۔ لیکن وہ ڈر گئی۔ اور جلد جلد ہلاس کی چٹکیاں نتھنوں میں رکھنے لگی۔ اپنے آپ کو مارنے کا اس کے پاس ایک ہی ذریعہ تھا ہلاس سے اپنے پھیپھڑوں کو چھلنی کر دینا۔ لیکن اب ہلدی کا کوئی بھی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اسی نرمی سے ماں نے اپنے شوہر کا منہ بھی بند کر دیا تھا، اسکی شخصیت کو کچل دیا تھا اور وہ.... بیچارہ کبھی اپنی عورت کے سامنے آنکھ نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ اسی طرح گھمنڈی بھی اپنی ماں کے ساتھ ہمکلام ہونے سے گھبراتا تھا۔ ماں نے اس بات کو محسوس کیا اور پھر وہی —— "تیری ماں مرے بھگوان کرے...." لیکن اس بات کا اسے کوئی حل نہ سُوجھ سکا۔

آج پھر چھ بجے شام گھمنڈی 'کرخلانے' سے لوٹ آیا۔ حالانکہ وہ نتھوا چوکیدار کی آواز کے ساتھ محلّے میں داخل ہوتا تھا۔ اس سے پہلے وہ کوئی پرانی تصویر دیکھنے چلا جاتا۔ دادیا کی مس تادیا کے گیت گاتا اور ایک دو سال سے اُس کے پراسرار طریقے سے غائب ہو جانے کے متعلق سوچتا.... آج پھر اتنی جلدی لوٹ آنے سے ماں کے دل میں وسوسے پیدا ہوئے اس نے بیکار ایک کام پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"دے تو بیٹا، زیرہ لے آ تھوڑا"

"زیرہ؟" گھمنڈی نے پوچھا۔ "دہی کے لئے، ماں"؟

"اور تو کیا تمہارے سر پر ڈالونگی؟" ماں نے لاڈ سے کہا اور ضرورت سے وافر پیسے دیتے

ہوئے بولی۔ "یہ لو پیسے تھیٹر کے ہیں۔"

"میں سینما نہیں جاؤں گا ماں۔" گھمنڈی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہی سیر تماشہ تو ہم لوگوں کو خراب کرتا ہے۔"

ماں حیران ہو کر اپنے بیٹے کا منہ تکنے لگی۔ ابھی خیر سے ہات پاؤں بھی نہیں کھلے۔ "اِنّی وانس کی باتیں کرنے سے نجر لگ جائے گی رے۔۔۔" اور در اصل وہ اپنے بیٹے کو ایک شرابی دیکھنا چاہتی تھی۔ نہیں، شرابی بھی نہیں۔ شرابی سے کچھ کم۔ جس سے تباہ حال نہ ہو جائے کوئی۔ لیکن یہ بھلی منسیت بھی ماں کو راس نہ آئی تھی۔ اس نے کئی عقلمند بچے دیکھے تھے جو اپنی عمر کے لحاظ سے زیادہ عقلمندی کی باتیں کرتے تھے اور انہیں ایشور نے اپنے پاس بلا لیا تھا۔۔۔ گھمنڈی زیرہ لانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پیسے لیکر دروازے تک پہنچا۔ مشکوک نگاہوں سے اس نے دروازے کے باہر جھانکا۔ ایک قدم باہر رکھا۔ پھر پیچھے کی جانب کھینچ لیا اور بولا۔ "باہر چچی کھڑی ہے اور منسی بھی ہے۔۔۔"

"تو پھر کا؟" ماں نے تیوروں کا ترشول بناتے ہوئے کہا۔

"پھر کچھ ہے۔" گھمنڈی بولا۔ "میں ان کے سامنے باہر نہیں جاؤں گا۔"

ماں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "تم نے منسی کا کنٹھا اُتار لیا ہے جو باہر نہیں جاتے ہو۔" لیکن گھمنڈی باہر نہ گیا۔ ماں منہ میں دوپٹہ ڈالکر کھڑی ہو گئی۔ ماں منہ میں دوپٹہ اسوقت ڈالا کرتی تھی جبکہ وہ نہایت پریشان یا حیران ہوتی تھی۔ اور اپنے کلیجے میں مکّا اُسوقت مارا کرتی جبکہ بہت غمگین ہوتی۔۔۔۔ اس سے پہلے تو گھمنڈی کسی سے شرمایا نہیں تھا۔ وہ تو محلے کی لونڈیوں میں ڈنڈ پیلا کرتا تھا۔ عورتوں کے کولہوں پر سے بچے چھین لیتا اور انہیں کھلاتا پھرتا۔ اور اس اثنا میں عورتیں گھر کا دھندا کر لیتیں اور گھمنڈی کو دعائیں دیتیں۔ اور آج وہ منسی اور چچی سے بھی جھینپنے لگا تھا۔

گھمنڈی نے واپس آتے ہوئے اپنے باپ کے زمانے کا خریدا ہوا ایک پھٹا پرانا

موم جامہ نیچے بچھایا اور ایک ٹوٹا ہوا شیشہ اور رال سامنے رکھ کر ٹانگیں پھیلا دیں۔ ٹانگوں پر چند رِستے ہوئے پھوڑوں پر اس نے رال لگائی اور پھر شیشے کی مدد سے منہ پر رسنے والے پھوڑے سے پانی پونچھنے لگا۔ اور پھر اس پر بھی مرہم لگا دی۔ ماں نے اپنی دھندلی آنکھوں میں سے منہ والے پھوڑے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔" ہائے، کتنا خون خراب ہو گیا ہے تمہارا۔" اور پھر کرم بجوا اور نیم کے نسخے گنانے لگی۔

اس وقت تک رات ہو گئی تھی۔ رال لگانے کے بعد گھمنڈی موم جامے پر ہی دراز ہو گیا۔ اور لیٹتے ہی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ آج ماں کو جلدی سو جانے کا موقع تھا۔ لیکن وہ اُونچے مونڈھے پر جوں کی توں بیٹھی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ بستر میں جا دبکنے پر وہ نسبتاً بہتر رہے گی۔ لیکن ایک خوشگوار تساہل نے اسے مونڈھے کے ساتھ جکڑے رکھا اور وہ وہیں سکڑتی گئی۔ اُس کا بڑھاپا اس میٹھی نیند کی مانند تھا جس میں پڑے ہوئے آدمی کو سردی لگتی ہو، وہ اپنی ٹانگیں سمیٹ کر کلیجے سے لگاتا چلا جائے، لیکن پاؤں میں پڑے ہوئے لحاف کو اُٹھانے کے لئے ہل نہ سکے۔

ایکا ایکی ماں چونکی۔ اپنے بیٹے کی خاموشی کا پتہ چل گیا تھا۔ اس نیم خوابی میں بڑے بڑے راز کھل جاتے ہیں۔ ماں نے کلیجے میں مارنے کے لئے مُکّا ہوا میں اُٹھایا لیکن وہ وہیں کا وہیں رُک گیا۔ اور وہ پھر ایک حسین غشی میں کھو گئی۔ لیکن اسے گھمنڈی اور اس کے ساتھ اس کا باپ یاد آ تا رہا اور اس کی خشک آنکھوں میں داستانیں چھلکنے لگیں۔ ہوا کے ایک جھونکے سے دروازے کے پٹ کھل گئے اور ایک سرد بگولے کے ساتھ باہر سے گوندی اور بل کے پتے، گلی میں بکھرے ہوئے کاغذوں کے ساتھ اُڑ کر اندر چلے آئے۔ ایک سوکھا ہوا بل کہیں سے لڑھکتا ہوا دہلیز میں اٹک گیا۔ گھمنڈی نے اُٹھ کر دروازہ بند کرنا چاہا لیکن بل کو نکالے بغیر کامیابی نہ ہوئی۔

گوندی کے شور اور جھینگروں کی آواز نے ماں کے خون کو اور منجمد کر دیا۔ شمعدان

میں دیئے کا شعلہ زمین کے متوازی ہو رہا تھا۔ گھمنڈی نے کہا۔ "بستر پہ لیٹے گی ماں۔" لیکن ماں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ گھمنڈی نے سر ہلا کر ماں کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا اور جلدی کانوں کھاٹ پر رکھ کر اوپر لحاف دے دیا۔ ماں کو خود پتہ نہیں تھا کہ اگر وہ وہیں پڑی رہتی تو صبح تک سردی سے اس قدر اکڑ جاتی کہ کبھی سیدھی نہ ہوتی اور ختم ہو جاتی۔

ماں کو بازوؤں میں اٹھاتے ہوئے شاید گھمنڈی نے کچھ بھی محسوس نہ کیا۔ لیکن ماں نے بڑا حظ اٹھایا اور اس کے بعد لحاف کی نرمی و گرمی نے اسے ایک لطیف حظ میں تبدیل کر دیا کبھی ماں نے بیٹے کو گود میں اٹھایا تھا۔ ماں نے سوچا۔ اور پھر ہلاس کی ایک چٹکی نتھنے میں رکھ کر اس نے زور سے سانس لیا۔ وہ حظ کی اس سطح پہ آچکی تھی جہاں مر کر انسان اس جمالیاتی خوشی کو دوام کرنا چاہتا ہے۔ آج اس کے بیٹے نے اسے گودی میں اٹھایا تھا اور اسے بستر کی قبر میں رکھ دیا تھا۔ وہ بستر جو قبر نہ ہو سکا...... دنیا میں کوئی عورت ماں کے سوا نہیں۔ اگر بیوی بھی کبھی ماں ہوتی ہے اور بیٹی بھی ماں تو دنیا میں ماں اور بیٹے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ عورت ماں ہے اور مرد بیٹا۔ ماں کھلاتی ہے، بیٹا کھاتا ہے۔ ماں خالق ہے اور بیٹا تخلیق۔ اس وقت وہاں ماں تھی اور بیٹا...... ماں، بیٹا!..... اور دنیا میں کچھ نہ تھا!

ماں بدستور خواب اور بے خوابی کے درمیان معلق تھی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی لیکن اس کے تخیل کی شکلیں بے قاعدہ ہو کر، خواب کے ایک اندھیرے جوہڑ میں ڈوب رہی تھیں۔ اس کے گاؤں کے چند مکان اس گلی میں آبنے تھے لیکن کسی پُراسرار طریقے سے ان مکانوں کے پیچھے بھی وہی دھوبیوں کا محلہ آباد تھا۔ وہاں بھی وہی پل اور گوندی کے درخت شائیں شائیں کر رہے تھے۔ اماوس کی رات کاجل ہو رہی تھی اور بیٹے کا چاند ان ظلمتوں کو پاش پاش کر رہا تھا۔ اس کا شوہر جسے وہ غلطی سے مرا ہوا تصور کرتی تھی زندہ تھا اور اس سے صبح کے وقت "آدھ بلوئے" کی کٹوری مانگ رہا تھا۔ اُسے پیاس لگی تھی۔ ایک نہ پی

ہوئی شراب کے نشے سے اسے بُری طرح اعضا شکنی ہو رہی تھی۔ لیکن اُس کا خاوند نو دس سال ہوئے مر چکا تھا مرے ہوئے آدمی کو کوئی چیز دینا گھر میں کسی اور متنفس کو خدا کے گھر بھیج دینے کے مترادف ہے۔ لیکن وہ انکار نہ کر سکی۔ وہ بیوی تھی اور ماں ـــــ اس نے اپنے شوہر کے منہ کے ساتھ لگا ہوا کٹورہ چھین لیا۔ لیکن کیوں؟ اس کا شوہر مرا تھوڑے ہی تھا۔ وہ سامنے کھڑا تھا۔ وہی کٹا ہوا سا ہونٹ، جس میں سے سونے کے کیل والا دانت دکھائی دے رہا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں بھی اس دانت کو ڈھانپنے سے قاصر رہتی تھیں۔

دروازے پر دستک سنائی دی۔ اور ماں کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اُسے جھنجھوڑ دیا ہو۔ اسوقت اسکی آنکھوں پر سے ایک غلاف سا اُترا۔ لیکن اس پر ایک اور غلاف تھا جو اس کے سارے بدن کا احاطہ کئے ہوئے تھا۔ وہ پڑی رہی ـــــ پڑی رہی.... اس کے پاؤں جو کچھ دیر پہلے سرد اور لکڑی کی طرح سخت تھے، کچھ گرم ہو گئے تھے۔ شاید گھمنڈی نے ہمیشہ کی طرح اپنے ہاتھ رگڑ رگڑ کر اس کے پاؤں گرم کئے تھے۔ ماں اپنے تخیل میں ہنسی۔ گھمنڈی بھی اُسے مرتا دیکھنا نہیں چاہتا۔ بیوی آجائے تو کوئی پتہ نہیں.... لیکن اب اس گھُن لگے ہوئے شریر کا کیا ہے؟.... بھلا اس.... بھلا اس کدھر گئی.... ماں سوگئی۔ لیکن دروازے پر دستک کی آواز اُسے برابر سنائی دے رہی تھی۔ بنواری اور رسید پھر گھمنڈی کو بلانے آئے تھے ماں کو ایک گونہ تسکین ہوئی۔ گھمنڈی پھر ٹھیک ہو جائیگا۔ لیکن صد گونہ اضطراب ہوا ان کی سنگت پھر گھمنڈی کو بگاڑ دیگی۔ اسوقت بڑھیا کو جاگ آئی۔ جاگتے ہی پہلی بات جو ماں کے ذہن میں آئی۔ وہ اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے گھمنڈی کے باپ کو آدھ بلوئے کا کٹورہ منہ سے لگانے نہیں دیا۔ اگرچہ وہ کسی قدر پیاسا تھا اور اس کا عضو عضو ٹوٹ رہا تھا۔ اور وہ بڑی التجا آمیز آنکھوں سے اسکی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک گھونٹ پی بھی چکا تھا لیکن ماں نے سمجھنا چاہا کہ اُس نے کچھ نہیں پیا۔ اور وہ سمجھ گئی۔ اس نے دروازے میں کھڑے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور اس قدر دھیمی آواز میں کہا ـــــ "میں صدقے، لال..... کہ وہ

خود بھی اپنی آواز کو نہ سن سکی اور ایک ان سُنا بوسہ ہوا کی لہروں میں چھوڑ دیا۔

اپنی ماں کو سوتا دیکھ گھمنڈی باہر آگیا۔ اور بولا" میں سینما کے علاوہ اور کہیں نہیں جاؤں گا، یار کہے دیتا ہوں۔

"نکل باہر سالے" رسید نے گالی بکتے ہوئے کہا" نکلتا ہے یا......"

کسی خیال کے آنے سے ماں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے پھر اپنا شوہر یاد آیا ـــــ اور اپنا بیٹا جو شکل اور عادات کے لحاظ سے اپنا باپ ہو رہا تھا لیکن ابھی کم سنی اور بلوغت کے درمیان ہی تھا چند ہی دنوں میں بالغ ہو جائے گا۔ پھر اُسے لُگائی کی ضرورت ہوگی۔ ماں نے دل میں کہا" مجھے پتہ ہے اب گھمنڈی باہر کیوں نہیں جاتا ـــ؟"

ماں جانتی تھی گھمنڈی اپنے باپ سے زیادہ حساس واقع ہوا ہے جب وہ پی کر آئے تو اسے جتا دینا بڑی مورکھتائی ہے۔ اور پھر اگلی صبح پلّو سے چونی کھول کر دینا بھی تو ایک چپت ہے ـــ چپت ـــ چپ چاپ چپت ـــ شراب پی کر آئے ہوئے خاوند ـــ بیٹے سے جوتے پیزار کرنا اور چونی کھول کر دینا یا سرہانے کے قریب پانی کا کٹورہ رکھ دینا ایک ہی قسم کی بدسلوکی تو ہے۔ بلکہ یہ بات جوتی پیزار سے کہیں زیادہ دلآزار ہے۔ اسی لئے گھمنڈی کے باپ نے اس کے سامنے کبھی آنکھ نہیں اُٹھائی..... باپ میں شخصیت کو کچل دینے کی وُہی تو ذمہ وار تھی اور اب بیٹے کو مار رہی ہے..... ماں نے دل میں تہیہ کیا کہ اب وہ کبھی اپنے پلّو میں وہی کے لئے چونی نہیں باندھے گی اور نہ صراحی سرہانے کے قریب رکھے گی۔ وہ خود کڑھے گی لیکن بیٹے کو کچھ نہیں کہے گی۔ اسے یہ پتہ نہیں لگے گا کہ میری ماں سب کچھ سمجھ گئی ہے... گھمنڈی کے باپ کا بھی خیال تھا کہ اگر گھمنڈی کی ماں واویلا یا احتجاج کرتی تو اس وقت تو ضرور بُرا معلوم ہوتا لیکن آخر میں کتنی آسانی رہتی۔ پہلے تو اس عادت سے خلاصی ہو جاتی اور اگر یہ لت رہتی بھی تو اس قدر شرمندگی کا منہ نہ دیکھنا پڑتا۔ اب جبکہ وہ خاموشی سے پانی کا کٹورہ سرہانے کے قریب رکھ دیتی ہے اور جلدی جلدی گلاس تھنوں میں ڈالتی ہے تو سارا نشہ

ہرن ہوجاتا ہے۔۔۔۔شاید گھمنڈی اسی تازیانے کی چوٹ نہ سہ سکا تھا اور اس نے شراب پینا، اور دیر سے گھر آنا ترک کر دیا تھا ـــ خیر سے آج گھمنڈی پی کر آئے گا تو وہ کچھ نہیں سمجھے گی ـــ کچھ نہیں کہے گی!

رات کے گیارہ بجے ہوا کے جھونکوں اور گوندنی کے پتوں کے ساتھ گھمنڈی بھی داخل ہوا۔ آج ہوا گھمنڈی سے زیادہ شور مچا رہی تھی۔ ماں بدستور چھت کی کڑیاں گن رہی تھی۔ اور من ہی من میں کوئی بھولا بسرا بھجوڑا گا کر نیند کو بھگا رہی تھی۔ گھمنڈی نے آتے ہی دونو ہاتوں میں پھونک ماری۔ ہاتھوں کو رگڑا اور ماں کے پاؤں تھامتے ہوئے بولا ـــ "ماں۔!" اور ماں کو جاگتے ہوئے پا کر بولا۔ "ارے! تو سو کیوں نہ گئی ماں؟"

ماں نے وہی مختصر سا جواب دیا۔" اب ان دیدوں میں نیند کہاں رے گھمنڈی!"

لیکن اس سے آگے وہ کچھ نہ بولی۔ گھمنڈی بالکل ہوش میں باتیں کر رہا تھا۔ آج اس نے ایک قطرہ بھی تو نہیں پی تھی۔ اب جو ماں نے کچھ نہ سمجھنے کا تہیہ کیا تھا، اس کا کیا ہوا؟

ـــ ماں سچ مچ ہی کچھ نہ سمجھ سکی۔ وہ کچھ بھی نہ جان سکی!

پت جھڑ جو ہونی تھی سو ہو چکی تھی۔ اس دفعہ پُروا کے آخری جھونکے اور تو کچھ نہ لائے ایک مہمان لیتے آئے۔ ماں نے گھمنڈی کو بلاتے ہوئے کہا ـــ "بیٹا، لے چٹنی بدل یار" محلے میں "چٹنی بدلنے" کی رسم خوب چلتی تھی۔ ماں پکی ہوئی سبزی چچی کے ہاں بھیج دیتی اور وہاں سے خالی برتن میں پکی ہوئی ترکاری آجاتی۔ اس تبادلے میں بڑی بچت تھی دوسری سبزی تیار کرنے کی زحمت نہیں اٹھانا پڑتی تھی اور کھانے میں وہ بات پیدا ہو جاتی اور چچی سے چٹنی چلتی بھی خوب تھی لیکن گھمنڈی نے یونہی گھر ٹے ایسا سر ہلاتے ہوئے کہہ دیا۔ "میں اب بڑا ہو گیا ہوں۔ ماں ـــ میں نہیں کہیں جانے کا۔"

"لو، ایک نئی مصیبت" ماں نے کہا۔ اور خوش ہوتے ہوئے بولی۔ "تو بڑا ہو گیا ہے تو کیا؟"

اس وقت مہمان کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ گھمنڈی نے موم جامہ جھلنگے کے قریب پچھار رکھا تھا اور اس پر بیٹھا وہی رال لگا رہا تھا۔ ان پھوڑوں کو آرام آتا تھا پر نہ آتا تھا۔ ماں نے دامن کی ہوا کرتے ہوئے رستے ہوئے پھوڑوں پر سے مکھیاں اڑائیں اور بولی "تیرا تو خون بالکل خراب ہو گیا ہے رے!"

اور در اصل گھمنڈی کا خون خراب ہو گیا تھا۔ اس کے باپ دادا نے اسے پاک پوتر خون دیا تھا۔ لیکن بیٹے نے خون میں تیزاب ڈال دیا اور خون پھٹ گیا۔ جسم بھی ساتھ پھٹنے لگا۔ کچھ مجرمانہ نگاہوں سے گھمنڈی نے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور بولا "ماں مجھے گرمی ہو گئی ہے۔" ماں کے تیور سارے سوالیہ نشان میں اٹھ گئے اور اس نے فقط کہا "کاؤ؟" گھمنڈی نے جھلنگے کی لٹکتی ہوئی رسیوں کو تھامتے ہوئے کہا "یہ سب رسید کی کم توت ہے"۔ اور بے اختیار روتے ہوئے بولا "اس میں میرا کوئی قصور نہیں ماں"

ماں نے ایک دفعہ پھر کہا "کاؤ؟" اور گھمنڈی کی حدت شعلہ بار ہو گئی۔ اس نے ماں کو ایک گالی دینا چاہی لیکن وہ رک گیا۔ گھمنڈی اب خود بھی چاہتا تھا کہ ماں کو اس کے آزار کا پتہ چل جائے۔ بیٹے کو روتے دیکھ کر ماں ٹھٹھک کر رہ گئی۔ روگ تو جی کے ساتھ لگا ہوا ہے لیکن اتنا خون خراب کبھی کسی کا نہیں ہوا اور اس نے سونے میں اپنے مرحوم خاوند کو آدھ بلو یا پلا دیا تھا . . . . .

مجبور ہو کر گھمنڈی پھر بلوغ، گمراہ بلوغ کی داستان رونے لگا۔ آج سے پچاس سال پہلے اس بلوغ کو زندگی کے درخت پر اس قدر پکنے نہیں دیا جاتا تھا کہ وہ سڑ کر اپنے آپ نیچے گر پڑے۔ اور پھر دنیا جہان کو متعفن کر دے۔ ماں جس کی شادی دس سال کی عمر ہو گئی تھی، اس بات کو نہیں جانتی تھی جس طرح بدن کے علم سے ناواقف لوگوں کے لئے پیٹھ کا ہر حصہ کمر ہوتا ہے۔ اسی طرح اس ناواقف، ناسمجھ اور نادان ماں کیلئے یہ خون کی خرابی، گرمی یا کوڑھ سے پرے کچھ نہیں تھا اور یہ سب کچھ کر بجوا، نیم اور اسپغول کے "تریاق"

کے آگے نہ ٹھہر سکتا تھا۔

اب ماں "کاؤ" نہیں کہنا چاہتی تھی۔ اگرچہ اُسے کسی بات کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ جانتی تھی جب سے گھمنڈی کا خون خراب ہوا ہے وہ بہت متلون ہو گیا ہے۔ گھر میں چیزیں پھوڑنے لگتا ہے اور جو بہت کچھ کہو تو اپنا سر فرش پر دے مارتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ماں خود ہی "چینی بدلنے" کے لئے چلی گئی۔ گھمنڈی کی چچی نے اپنے ہاں پکی ہوئی ترکاری تو دے دی لیکن ان کے ہاں کی پکی ہوئی چیز قبول نہ کی۔ ماں کا ماتھا ٹھنکا۔ دس سال سے وہ رنڈاپا اکیلی کاٹ رہی تھی اور اس نے کسی شریک کے سامنے سر نہیں جھکایا تھا۔ آج جبکہ وہ کل کے تمام اسرار سے واقف ہو چکی تھی بھلا کیوں جھک جاتی؟ ماں اپنی دیورانی کے ساتھ جی کھول کر لڑی۔ دیورانی نے بھی دھتا بتایا اور کہا "دیکھا ہے ہم نے، اتنی بڑی ناک لئے پھرتی ہے تو بیٹے کو سنبھالا ہوتا، جو بازار میں جھک مارتا پھرتا ہے"

ماں ٹھیک کہتی تھی کہ "چینی بدلنے" سے گھمنڈی کا کیا تعلق؟ تو جو برتنا نہیں چاہتی تو یوں کہہ دے لیکن دراصل ماں کو کوئی بات سمجھ نہیں آتی تھی۔ خون خراب گھمنڈی کا ہوا ہے اور وہ گالیاں رسید اور بنواری کو دیتا ہے۔ دیورانی برتنا مجھ سے نہیں چاہتی اور صلواتیں گھمنڈی کو سناتی ہے۔

لیکن محلے کی دوسری عورتیں بھی ماں کو مطعون کرتی تھیں۔ ماں سخت پریشان ہو رہی تھی۔ آخر منشی جی سے لڑائی ہوئی۔ اُس نے ڈانٹا کہ اگر گھمنڈی نے ہمارے مکان کے اِردگرد کہیں پیشاب کیا تو اس سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔

آخر مہمان کے سمجھانے سے ماں کو پتہ چل گیا۔ اس نے نہ صرف اپنا سر پیٹا بلکہ ایک دو ہتڑ بیٹے کے بھی جما دیا۔ ہائے، تو نے باپ دادا کا نام ڈبو دیا ہے رے! پڑوسن کے ساتھ پھر لڑائی ہوئی۔ اور ماں نے کھری کھری سنا دی "حرامخور تجھے وہ دن یاد ہے جب تیری باہمن حرام کروا کے نکلی تھی باوا کے گھر سے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہ اندھا دیکھا تھا نہ کانا۔

کرنے کی تھی.......

"..... اور وہاں جا کر گھڑا پھوڑ دیا تھا۔ جانے کس کس کا، گریب ایسر کے سر پر!"
اور گھر آ کر ماں گھمنڈی کو کوسنے دیتی۔ گھمنڈی جب سب حکیموں سے مایوس ہوتا تو ماں کی حکمت میں آرام پاتا تھا۔ لیکن ماں اُسے گالیاں دیتی تھی — گو بھوگ لے تو کُو..... اب دنیا گھمنڈی کی آنکھوں میں آبلہ تھی — ایک بڑا آبلہ جو اُتر سے دکھن اور پورب سے پچھم تک پھیلا ہوا تھا اور جس میں پیپ کے دریا رس رہے تھے.....

رات ہوگئی۔ ماں جھلنگے میں پڑی ابھی تک ٹھنک رہی تھی۔ یہ بیماری کہاں سے مول لے لی رے میرے دشمن! سارا جسم پھوڑے پھوڑے ہو چکا ہے..... یہ بیماری آگ ہے، نری آگ یہ امیروں کی دولت ہے۔ میں غریب عورت اس آگ کو کیسے بجھاؤں؟... میں وئیدوں کو کیا بتاؤں — ؟ میں تمہاری ماں ہوں رے گھمنڈی! شریک مجھے طعنہ دیتے ہیں۔ پڑوسی مجھے کھڑا کر لیتے ہیں اور عجب بے ڈھنگے سوال کرتے ہیں رے!

گھمنڈی قریب پڑا، ہر قسم کی شرم وحیا سے بے نیاز، ایک ٹک چھت کیطرف دیکھ رہا تھا۔ چھت میں لگے ہوئے نرکل اُس کی آنکھوں میں اُتر آئے تھے اور جھینگا اسکے دماغ میں بولنے لگے تھے۔ اِتنک ہوا کے جھونکوں میں تلخی کی نمایاں رمق پیدا ہو کر اس کے جسم کے ایندھن میں اور شعلے پیدا کر رہی تھی۔ کواڑ بھی کھُلے ہوئے تھے، گوندی سموم کے جھونکوں میں کراہ رہی تھی اور آسمان پر بدنما داغوں والا، آتشک زدہ چاند، اپنی بیرقانی نظروں سے زمین کی طرف دیکھ رہا تھا......

اس کے بعد گھمنڈی کی آنکھوں میں پیٹ کی تخمیر نے ایک غیر مرئی دھند سی پھیلا دی۔ پلکیں بوجھل ہونا شروع ہوئیں۔ نرکل چھت پر چلے گئے، جھینگروں نے زبان بند کر لی — پھوڑے رسنے بند ہو گئے......

سب دنیا سو رہی تھی لیکن ماں جاگ رہی تھی۔ اس نے بیس ایک کے قریب

ہلاس کی چٹکیاں نتھنوں میں رکھ لیں اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دائیں ہاتھ سے اُس نے دیا اُٹھایا اور گھسٹتی ہوئی اپنے بیٹے کے پاس پہنچی۔ آہستہ آہستہ اُس کے بالوں میں ہات پھیرنے لگی۔ گھمنڈی سویا ہوا تھا، لیکن ماں کی شفقت اُس کے روئیں روئیں میں تسکین پیدا کر رہی تھی...... ماں نے بیٹے کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی......

میں صدقے، میں واری!

دنیا جلتی ہے تو جلا کرے ــــ میرا لال جوان ہو گیا ہے، اسی لئے...

ہائے! مرے تیری ماں بھگوان کرے سے!!

مُمتاز مفتی

دروازہ

"یہ دروازہ کس نے بند کیا ہے۔ رنیا! او رنیا!! — اور یہ کھڑکیاں بھی۔ اور کون ہوگا۔ بس وہی رنیا۔ اور کون۔ جانے کہاں چلا گیا ہے۔ اب کیا ہوگا۔ اس کا بس چلے تو سب دروازوں پر تالے لگ جائیں۔" وہ اپنے آپ ہی بڑبڑاتے رہے۔ پھر دفعتاً اُنکی نگاہ ہم پر پڑی۔ "اوہ! تم ہو پرکاش۔ تم آگئے۔ بہت اچھا کیا تم نے۔ بہت اچھا کیا۔ اچھا ہوا تم آگئے۔"

"یہ میرے ہم جماعت ہیں۔" پرکاش نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ "بلراج۔"

"اچھا اچھا۔ بہت اچھا ہوا۔ بڑی مہربانی ہے۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "آپ آگئے۔ اچھا ہوا۔ پھر اُنہوں نے حسرت سے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ "مگر یہ دروازہ —!؟ اور پھر میری طرف معذرت بھری نگاہ سے دیکھ کر بولے۔ "دیکھو نا۔ یہی دروازے بند کر دیتا ہے۔ رنیا آدمی بہت اچھا ہے۔ بہت بھلا آدمی ہے۔ بس دروازے بند کر دیتا ہے،

گویا ہم قیدی ہیں۔ دیکھا آپ نے" اور اُن کے منہ پر ایک مایوس مسکراہٹ چھا گئی۔ "اچھا ہوا آپ آ گئے" وہ از سرِ نو بڑبڑانے لگے۔ گویا کچھ کہنے کیلئے کہہ رہے ہوں یا اپنی آواز کا سہارا لے رہے ہوں۔

"اچھا کیا آپ نے۔ آپ۔ آپ مسٹر...."

مسٹر بلراج پرکاش نے میرا نام دُہرایا۔

"ہاں۔ ہاں۔ مجھے نام یاد نہیں رہتے۔ آپ بیٹھ جائیں۔ آپ مسٹر راج۔ بیٹھ جایئے اور پرکاش! ان کیلئے چائے بھول گئے۔ اچھا۔ اچھا۔ کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائیگا پر وہ رینا۔ نہ جانے کہاں چلا جاتا ہے۔ بس چلا جاتا ہے۔ اور دروازہ، یہ دیکھو۔ نہ جانے کیوں بند کر جاتا ہے۔ لیکن وہ آ جائیگا۔ وہ ہمیشہ آ جایا کرتا ہے۔ آپ بیٹھئے سب ٹھیک ہو جائے گا سب۔" میں نے ان کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ ان کے منہ پر جھریوں کی سلوٹوں میں اک طوفان سا تڑپ رہا تھا۔ اور ان کی آنکھیں! نہ جانے انکی آنکھوں میں اس بے بس چمک کو دیکھ کر میں نے کیوں ایسا محسوس کیا گویا کسی کال کوٹھڑی میں کوئی دروازہ کھلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شدتِ احساس سے میں اُٹھ بیٹھا اور آپ ہی آپ جا کر دروازہ کھول دیا۔ مجھے دروازہ کھولتے دیکھ کر وہ خوشی سے چلّانے لگے "ہاں ہاں کھول دیجیئے بہت مہربانی ہے۔ بڑا اچھا کیا آپ نے۔" اور پھر مجھے کھڑکی کی طرف جاتے دیکھ کر بڑبڑانے لگے۔ "اچھا تو یہ بھی سہی۔ بڑی اچھی بات ہے۔ مہربانی ہے۔ بڑا اچھا ہوا۔ بڑا اچھا ہوا آپ آ گئے۔ اچھا تو میں جاتے ــــ لیکن وہ رینا۔ وہ نہیں آئیگا۔" ان کی نگاہ میں یوں حسرت جھلکی گویا وہ رینا کے نہ آنے کے خلاف مجھ سے اپیل کر رہے ہوں۔ گویا رینا کے نہ آنے سے نہ جانے کیا ہو جائے گا۔ نہ جانے کیا کیا نہ ہوگا۔ پھر اس گہری نیلگوں جھیل میں ایک طوفان جھولنے لگا۔ اور وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے "اچھا تو میں ہو آؤں۔ مجھے جانا ہی ہوگا۔ آپ بیٹھیں مجھے جانا ہے۔ میں ہو آؤں ذرا۔" اُنہوں نے گویا مجھ سے اپیل کی "پرکاش بیٹے!

تم مسٹر۔۔۔ مسٹر۔۔۔ کے لئے چائے بنوا لینا۔ میں ہو آؤں۔"

"جی، چچا جی! میں بلراج کے لئے چائے بنوالونگا۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"ہاں، ہاں!" وہ خوشی سے بڑبڑانے لگے "چائے بنوالینا سب ٹھیک ہوجائیگا۔" گویا اپنے آپ کو تسلی دے رہے ہوں۔ "رنیا ضرور آجائے گا۔ وہ آتو جایا کرتا ہے۔ لیکن۔۔۔ اچھا میں جاتا ہوں۔ میں ذرا ہو آؤں۔" یہ کہکر وہ اندر داخل ہو گئے۔

"اولڈ گوز" پرکاش اُنہیں جاتے ہوئے دیکھ کر دبی آواز سے بولا۔

"دماغ۔۔۔" پرکاش نے انگلی سے سر کو بجاتے ہوئے معنی خیز انداز سے کہا۔ "دِل"

"دل۔۔؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

لیکن وہ پھر بڑبڑاتے ہوئے اندر آگئے۔ "لو!" وہ نہایت یاس بھرے انداز میں بولے "یہ دروازہ بھی بند ہوگیا۔ اب کوئی کیا کرے؟"

انہوں نے اندرونی دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ دروازہ جو ہے" پرکاش نے طنزاً بیرونی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"اوہ" یہ تو میں بھول ہی گیا تھا وہ چونک کر بولے "ہاں یہ دروازہ جو ہے۔ ٹھیک ہے۔ بھول جاتا ہوں میں" انہوں نے معذرت بھری نگاہ سے میری طرف دیکھا "بھول جاتا ہوں مسٹر۔۔۔ مسٹر۔۔۔"

"مسٹر بلراج" پرکاش نے طنزاً دہرایا۔

"مسٹر راج! میں بھول جاتا ہوں۔ اچھا تو آپ بیٹھیں۔ آپ۔" یہ کہکر وہ باہر نکل گئے۔

"اُف یہ دروازے کا جنون" پرکاش نے منہ بنا کر کہا۔ "کریک ہے کریک۔ تم چپ کیوں؟" وہ مجھے گھورنے لگا۔

"ہاں ہاں کریک" میں چونک کر بولا۔ نہ جانے اُس سمے میرے دل پر اک بوجھ سا کیوں پڑا ہوا تھا۔ نہ جانے مجھے اس وقت تمام دنیا ایک بند دروازے کی طرح کیوں دکھائی دے

رہی تھی۔ "نہیں نہیں میں خاموش تو نہیں۔" میں نے کہا۔

"خاموش نہیں تو یہ گیان دھیان کی تصویر کیوں بنے ہوئے ہو۔" وہ بولا۔

میں نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی۔

"اس سڑی بڈھے کی باتوں پر نہ جاؤ۔" وہ بولا۔ "نہ جانے بوڑھا ہو کر انسان سڑی کیوں ہو جاتا ہے۔"

"شاید ہم بھی ہو جائیں۔"

"نہیں!؟ میں تو اس سے پیشتر اپنے آپ کو ہلاک کر لونگا۔"

"چھوٹے بابو جی آئے ہیں۔" رنیا اندر داخل ہوتے ہوئے چلّایا۔ میں نے کہا تھا۔ بڑے بابو جی سے کہا میں نے۔ میں نے کہا جرور کوئی آئے گا۔ جرور آئیگا کوئی۔ میں نے کہا سو آگئے۔ چھوٹے بابو۔ پھجول میں تو نہیں پھڑکی میری آنکھ کبھی۔ کل سے جو پھڑک رہی تھی۔ میں نے کہا جرور کوئی آئیگا۔ اور سب اچھے ہیں نا۔ پر آپ تو کالج سے آئے ہیں نا۔ اور چائے نہیں پی کیا۔ ابھی تو نہیں پی ہوگی۔ پیتے بھی کیسے میں تو اب آ رہا ہوں۔ ابھی لائے دیتا ہوں۔ ابھی ——" یہ کہہ کر وہ اندر جانے لگا لیکن دفعتاً رُک گیا اور دیوار کی طرف دیکھ کر بولا۔ "بڑے بابو جی کہاں گئے۔ اندر تو نہ ہونگے وہ۔"

پرکاش بولا۔ "ابھی باہر گئے ہیں۔"

وہ ہماری طرف مخاطب ہو کر شکایت کرنے لگا۔ "نہ جانے کہاں چلے جاتے ہیں۔ کہاں مارے مارے پھرتے ہیں۔ بس میں ہو آؤں۔ ہو آؤں میں۔ جیسے دھپتر جانا ہو۔" وہ ہنسا۔ "چھوٹے بابو دیکھو نا ہر سمے گھومتے رہتے ہیں۔ جیسے کوئی چھوکرا اسکول سے بھاگ رہا ہو۔ اب کوئی کہاں تک انکے پیچھے پیچھے مارا پھرے۔ پھجول میں —— کل باگ میں بیٹھے ملے۔ دیکھا مجھے تو اٹھ بیٹھے۔ اچھا تو اب گھر ہی جانا ہے نا۔ جانا جو ہوا گھر۔ کچھ سمجھ میں نہ آئے ہے چھوٹے بابو پر آپ کی چائے۔" دفعتاً وہ چونک کر بولا۔ "ابھی لاتا ہوں چھوٹے بابو ابھی۔" یہ کہہ کر وہ اندر

داخل ہو گیا۔

پرکاش کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "دیکھا ایک نہ شُد دو شُد"۔

لیکن نہ جانے مجھے ہنسی کیوں نہ آئی میں چپ چاپ بیٹھا رہا

"یہاں ڈاکٹر کا تو پتہ نہیں۔ دونوں ہی مسٹر ہائیڈ ہیں"۔ پرکاش مسکرایا۔" ایک دروازے بند کرتا پھرتا ہے اور دوسرا انہیں کھولنے کیلئے ترستا ہے مگر اتنا نہیں کر سکتا کہ آپ تکلیف کر کے کھول لے۔ عجب تماشہ ہے۔"

"ہاں"۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"چپ کیوں ہو تم"۔ وہ مجھ سے بگڑا۔

"چپ کہاں ہوں"۔ میں نے چمک کر کہا۔

"چپ تو ہو تم"۔ وہ بولا۔ "تم بھی تو یہاں آ کر ایک بند کھڑکی بن گئے ہو"۔

"چلو تم ہی کھلا دروازہ سہی"۔ میں نے اسے چڑانے کے لئے کہا۔

"ہم تو ہیں" وہ بولا اور اٹھ کر کھڑکیوں کی طرف چلا۔ "آخر ہمیں کوئی کھلی کھڑکی مل ہی جائے گی نا"۔ یہ کہہ کر وہ باہر دیکھنے لگا۔

"ارے" وہ چلایا۔ "یہ سنا تم نے۔"

"نہیں تو" میں نے حیرانی سے کہا۔ "کیا ہے؟"

"یہ آواز ——— بڑی سُریلی ہے۔"

"کون"۔ میں نے پوچھا۔

"سُنتے نہیں" وہ بولا "بغل کے کمرے سے آواز آ رہی ہے اِس دیوار سے اُس طرف۔ میں دیکھ آؤں ذرا" پرکاش باہر نکل گیا۔ اور میں پھر اپنے خیالات میں کھو گیا۔ نہ جانے اس وقت مجھے کیا ہو گیا تھا۔ جی چاہتا تھا رو دوں۔

کچھ دیر کے بعد پرکاش ہنستا ہوا واپس لوٹا۔ "بھئی واہ کیا چیز ہے اِس ساتھ والے کمرے میں"

"چاہے اپنے گھر ہی سے کوئی ہو۔"

"واہ" وہ ہنسا "چچا تو اکیلے رہتے ہیں۔ اور یہ کمرے کرائے پر ہیں۔ کیا سمجھے؟ پر جانتے ہو۔ ہے کیا سالا خدار کھڑکی کے پیچھے؟ یوں بیٹھی ہے ظالم، جیسے کوئی کماری فیند ہو لیکن دوست! یوں معلوم ہوتا ہے گویا پہلے ہی کوئی زنگاہ پر چڑھا ہوا ہے اور منتظر بیٹھے ہیں آپ — تم نے آواز نہیں سنی تھی۔ اچھا اب بولی تو بتاؤں گا۔ اسے یار صاف آواز آتی تھی۔ یہ ساتھ والا کمرہ تو ہے۔ ذرا دھیان رکھنا۔"

"لو۔ سارے دروازے کھول گئے ہیں۔" رنیا بڑبڑاتا ہوا چائے لیکر داخل ہوا۔ "اب کوئی کیا کرے۔ بابو جی تو حد کر دیتے ہیں۔ حد۔ میں پوچھوں اگر ٹھنڈ لگ جاوے تو۔ اور ٹھنڈ نہیں تو ہجار باتیں ہیں کتا بلی آجاوے تو۔" اُس نے چائے میز پر رکھ دی اور آپ فرش پہ بیٹھ کر بڑبڑانے لگا۔ "آپ بھی تو اتنی جماتیں پاس ہیں چھوٹے بابو! بھلا ایسی بات بھی سُنی ہے کبھی، یہ دروا جہ کھول دو۔ وہ دروازجہ کھول دو۔ گھر نہ ہوا دُکان ہوئی۔ اور سچ پوچھو چھوٹے بابو! تو دکان بھی ایسے نہیں ہوتی۔"

"رنیا" پرکاش بولا۔ "یہ دروازے کھولنے کا خبط ہے کیا بلا؟"

"کون جانے چھوٹے بابو۔ میری سمجھ میں تو نہ آوے ہے یہ بات۔ جوانی میں تو اچھے بھلے تھے۔ اِن کی طرح" اُس نے میری طرف اشارہ کیا۔

"ہوں" پرکاش مسکرایا۔

"جی" رنیا چمکا۔ "بڑے ٹھاٹھ تھے جب تو۔ بڑا مجاج تھا۔ رام کا دیا کا ہے کی کمی تھی مہاراج۔ پھر جوانی بھر کر آئی تھی۔ ہجاروں میں ایک تھے۔ یہ اونچا لمبا بدن اور رس دار بھری آنکھیں مست دِکھیں تھیں۔ پر چھوٹے بابو جب بھی چھپ چھپ کے رہتے تھے۔ اکیلے ہیں بیٹھ رہتے۔ نہ ہنسی نہ مجاک۔ چپ سی لگی رہئی تھی۔ پر پھیشن میں نیچھے نہ رہتے۔ یہ گلے میں بند ہونے والی اور مہاراج سوٹ اور بڑی ٹس پھس تھی۔" اس نے ایک آہ بھری۔

"میں بھی تو جوان تھا ان دنوں۔ چھوٹے بابو بس سارا جیون اسی گھر میں بیت گیا۔"

"ہوں تو بڑے مزے میں رہتے تھے چچا جی۔" پرکاش مسکرانے لگا۔

رنیا نے آنکھ سے ایک ان بہا آنسو پونچھا۔ "جی بڑے مزے میں۔ یہیں اسی سڑک پر مکان لیا ہوا تھا۔ اُدھر چوک کی طرف چوبارہ تھا ایک۔ سڑک پر ہی ہے وہ۔ بس بابو جی اور میں دونو ہی تھے۔"

"نسبت روڈ پر۔" پرکاش چلایا۔ "یہاں تو میلا لگا رہتا ہے نا۔ لڑکیوں کا۔"

"او ہنوہ چھوٹے بابو۔" اُس نے سر ہلایا۔ "اِن دنوں تو یہ جگہ کھالی پڑی تھی۔ اکا دکا مکان تھا۔ ہاں کالج کے سمے گجرتی تھیں۔ بس دو ایک۔"

"دو ایک۔" پرکاش نے پوچھا۔ "لیکن رنیا! یہ بھی کیا کم ہے۔ ہم سے تو ایک بھی ہضم نہیں ہو سکتی۔"

"ہی ہی ہی۔" وہ ہنسا۔ "چھوٹے بابو تو مجاک کرتے ہیں۔" اُس نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ "پر آپ جانیں ہیں۔ رسوئیہ کو کون پوچھے ہے۔ مہاراج۔ ہاں بابو جی۔" وہ پھر ہنسا۔ بڑا رنگیلا مجاج تھا اُن دنوں بابو جی کا۔ پر چھوٹے بابو کے سمان تیج نہ تھے۔ بس بھیتر بھیتر گھُٹ ہو جاتے تھے۔

"اچھا تو ہم تیز ہیں۔" پرکاش مُسکرایا۔

"چھوٹے بابو۔" اُس نے آہ بھر کر کہا۔ "جوانی سبھی کو تیج بنا دیوے۔ پر سچ بتاؤں بابو جی میں یہ بات نہ تھی۔ بس چپکے سے دیکھا اور پی گئے۔ پر وہ جالم! توبہ ہے چھوٹے بابو وہ تو آپھت تھی آپھت۔"

"وہ کون" پرکاش نے مزید دلچسپی سے پوچھا۔

رنیا اپنے ہی خیال میں کہتا گیا۔ "اب بھی جو یاد آوے تو جی بیٹھ جاوے ہے۔" اس نے اک آہ بھری۔ "پر چھوٹے بابو! دل کی بڑی اچھی تھی وہ۔"

"ارے یہی تو نہیں جو اِس کمرے میں رہتی ہے"۔ پرکاش نے دیوار کیطرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"لو چھوٹے بابو! میں تو جب کی بات کر رہا ہوں"۔ رنیا بولا۔

"بھئی ساری بات بتاؤ تو پتہ چلے نا" پرکاش نے اُسے چھیڑنے کے کہا۔

"کیا بتاؤں چھوٹے بابو۔ جب وہ سڑک پر سے گزرتی تو کھانچے والے سودا دینا بھول جاتے"۔ وہ ہنسنے لگا "وہ بھی کیا دن تھے۔ میں جو سبجی بنا رہا ہوں اور وہ گزرے، تو چھوٹے بابو یوں سدھ بدھ ماری جائے کہ چاکو سے انگلی کٹ جائے۔ یہ دیکھو"! اس نے بائیں انگلی دکھاتے ہوئے کہا، "کئی بار کٹی یہ انگلی۔ اُسے دیکھ کر تو بڈھے بھی ٹھوکر کھا جاتے تھے۔ اور وہ مسکراتی اور یوں چلے جاتی جیسے کچھ نہ جانے ہو۔ بڑی تیج تھی وہ۔ چھوٹے بابو کی طرح۔ پر منہ دیکھو تو بھولا بھالا۔ اور وہ جو نجر اُٹھا کر دیکھے تو دم نکلے تھا ایسا روپ تھا اُس کا۔ بڑا روپ تھا چھوٹے بابو! اور چلتی تھی ہوا میں چلتی تھی وہ، پیٹھ پر مہاراج، دو چوٹیاں، یوں پھڑکتی تھیں وہ چوٹیاں۔ کیا بتاؤں چھوٹے بابو۔ بڑے گھر کی تھی۔ یہی اپنے گوبند لال سیٹھ کی بٹیا۔ اکیلی بٹیا تھی۔ لاڈلی تو ہونا ہی تھا۔ پر ان دنوں ہمیں کیا کھبر تھی۔ سیٹھ گوبند لال کی۔ ہمیں کیا مالوم کہ وہ مکھ پتی ہیں۔ ہمیں تو یہ بھی کھبر نہ تھی بھئی، وہ سیٹھ گوبند لال کی بیٹی ہے۔ اور چھوٹے بابو!" وہ پھر ہنسنے لگا "ہمارے بابوجی چھپ چھپ کے دیکھیں تھے اُسے۔ کبھی رسوئی میں آجاتے۔ بہانے بہانے "رنیا کیا بناؤ گے آج۔ رنیا چائے تو بڑی اچھی بنائی تھی آج۔ رنیا کیسا حال چال ہے"۔ ویسے چاہے رنیا کو کبھی نہ پوچھا ہو۔ پر چھوٹے بابو میں تو جانتا تھا، سب جانتا تھا کہ وہ کھڑکی میں سے دیکھنے کو آئے ہیں میں نے کبھی نہ جتایا تھا انہیں۔ پر انہیں یوں بہانے بناتے دیکھ کر گستہ آتا تھا مجھے"۔

"غصہ تو آنا ہی تھا" پرکاش بولا۔ "تمہیں دیکھنے کا موقعہ جو نہ ملتا تھا"

"ہی ہی ہی ہی" رنیا ہنسا۔ "لو چھوٹے بابو بھی کیا بات کرتے ہیں۔ حد کرتے ہیں

حد کرتے ہیں یہ بھی۔ بھلا مجھے کون پوچھے تھا وہاں۔ میں تو ویسے ہی دیکھتا تھا۔ مجاک مجاک میں۔ گُستہ تو مجھے یوں آوے تھا کہ بابوجی کو دیکھنا تھا تو کھل کے دیکھتے یوں چھپ چھپ دیکھنے سے فائدہ۔ آپ ہی بتائیں۔" وہ مجھ سے مخاطب ہُوا۔ "یہ آجکل کی چھوریاں بھلا چھپ چھپ کہ دیکھنے کو کیا جانیں ہیں۔ آپ ہی بتائیں مہاراج۔ وہ تو یہ چاہیں ہیں کہ کوئی سامنے کھڑا ہو کر تڑپے۔ وہ جانے گئے چھوٹے بابو جب چھپ چھپ کر رونا چلے تھا۔ پر ہمارے بابوجی نے تو حد کر دی۔ کالج جانا چھُٹ گیا۔ بس پڑے رہتے۔ گاتے رہتے اور اس کا انتجار کرتے رہتے۔ آنے کا وکت ہُوا تو اٹھ بیٹھے منہ ہاتھ دھو، کپڑے پہن آ کھڑے ہوئے رنیا کیا بن رہا ہے ——— آکھر میں نے سمجھایا۔ میں نہ سمجھاتا چھوٹے بابو تو سمجھاتا کون۔ میرا سارا جیون اسی گھر میں بیت گیا۔ اسی گھر میں۔ میں نے کہا۔ بابوجی جو چاہیں کریں آپ۔ میں کچھ نہیں کہتا پر کالج نہ جائیں آپ تو کیسی بُری بات ہے۔ لالہ جی ناراج ہونگے۔ مجھے ڈانٹیں گے کہ رنیا تم نے ہمیں کھبر کیوں نہ کی۔ میں نے کہا۔ وہ بھی تو جاتی ہی ہے کالج۔ اس بات پر چھوٹے بابو۔ بابوجی کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ پر وہ بولے نہیں پی گئے۔ یہ انکی آدت ہے پھر انہوں نے کالج جانا تو شروع کر دیا چھوٹے بابو نے ——— میں بھی دیکھتا رہا۔ چھپ چھپ کر دیکھتا رہا کہ کیا کریں ہیں۔ تو جہاراج کپڑے پہنے، چائے پی۔ جلدی جلدی اور پھر نیچے اُتر گئے اور پان والے بھیئے کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ بہانے بہانے، کبھی پان کھا، کبھی سگرٹ پی۔ کھڑے رہے پھر جب اُسے دُور سے آتے دیکھا تو اُسی طرح چل دیئے۔ اِن کا کالج اُسی طریچہ تھا تو وہ اُس پٹری پر ہوتی اور یہ اِس پٹری پر ہو لیتے اور پھر بہانے بہانے دیکھتے چھپ کر اور ادھر میں کھڑکی سے سب دیکھتا رہتا۔ چھوٹے بابو۔ ہر بات کو دیکھتا تھا۔ اپنے بابوجی ہولے ہولے چلتے۔ وہ تو پہلے ہی مجھے سے چلتی تھی۔ اسکی چال ہی ایسی تھی چھوٹے بابو مجھے مچے چلتی تھی وہ۔"

"اور وہ بھی تو بابوجی کو دیکھتی ہو گی۔ کیوں رنیا!" پرکاش نے پوچھا۔

"اس کا کیا تھا چھوٹے بابو وہ تو کسی کو بھی نہ دیکھے تھی۔ پر سبکو دیکھتی وہی مالوم ہووے تھی"

"تمہیں بھی؟" پرکاش مسکرایا۔

"ہی ہی ہی" وہ ہنسنے لگا "مجھے دیکھتی تو تھی وہ۔ پر چھوٹے بابو وہ تو اُس نل کو بھی دیکھے تھی جو پٹڑی پر لگ رہا تھا" اُس نے اِک آہ بھری اور بولا "اس کے دیکھنے کی کیا پوچھیں آپ وہ تو ہوائیں چلے تھی۔ ہوائیں۔ پر میں نے دیکھا تھا، بابو جی کو دیکھ کر اُس کے منہ پر ہنسی آجاوے تھی۔ ہلکی سی۔ پر کیا مجال جو وہ ہنس جائے کھل کر بڑا روب تھا اس کا جی —" اُس نے ایک اور آہ بھری اور خاموش ہوگیا۔ پھر وہ آپ ہی آپ چونک کر بولا "پھر یوں ہوا۔ کہ وہ پان والا بھٹیا جس کی دکان سے بابو جی پان کھاتے اور انتجار کرتے تھے۔ کہنے لگا کیوں بابو جی! کیا چھوری ہے۔ بڑی تیج ہے تیج۔ اور چھوٹے بابو کیا پوچھو ہو۔ سڑک پر کون تھا جو یہ نہ جانے تھا کہ بابو جی اسکی انتجار کرتے ہیں۔ سبھی جانتے تھے مہاراج سبھی۔ پر ہمارے بابو جی یہ سمجھتے تھے کہ سبھی اندھے ہیں اندھے۔ لو مہاراج" وہ مجھ سے مخاطب ہوا "بھلا جی کی بات بھی چھپ سکے ہے کہیں اور پھر یہ بات۔ مہاراج یہ بات تو جی میں آئی اور یوں اُچھلی جیسے ربڑ کی گیند" وہ ہنسنے لگا۔ "تو چھوٹے بابو اس روج سے بابو جی نے دکان پر کھڑا ہونا چھوڑ دیا اور وہ اور بھی نکو بن گئے۔ اس بات کو ہنس کر ٹال دیتے تو وہ کیا منع کرتے انہیں۔ تو جی — اُنہوں نے وہاں کھڑے ہونا چھوڑ دیا۔ پھر پرلی پٹڑی پر نل کے پاس جا کھڑے ہوتے۔ اور جب وہ دور سے نجر پڑتی تو اس کی طرف چل دیتے۔"

"اسی پٹڑی پر جس پر وہ آتی تھی؟" پرکاش نے مصنوعی حیرانی سے پوچھا۔

"جی اُسی پٹڑی پر" رنیا چمک کر بولا۔

"بڑی ہمت پیدا ہو گئی تھی۔"

"جی! پہلے تو یہ بات تھی پر آپ جانیں ہیں۔ دھیرے دھیرے آس بندھ ہی جاتی ہے چھوٹے بابو۔ پھر بھی جب دونوں میں تھوڑا سا پھاسلہ رہ جاتا تو، بابو جی پٹڑی کو چھوڑ سڑک

پہ اُتر آتے اور پھر سڑک پار کر کے اس پٹڑی پہ آجاتے۔ پر مہاراج وہ مگن چلے جاتی۔ ڈیسے ہی اُسی پٹڑی پہ۔ پر میں دیکھتا تھا جب بابوجی سڑک پہ اُترتے تو وہ پرلی طرف منہ کر کے ہنس دیتی۔ لیکن کیا مجال جو منہ سے پورا پتہ چلے۔ ایسی تیج تھی وہ، اور میں دیکھتا رہتا چھوٹے بابو۔ بابوجی کی ہر بات کو دیکھتا رہتا اور میں کیا، وہ پان والا بھیّا بھی تو دیکھے تھا۔ بابوجی کو۔ وہ ان کو۔ عجب دن تھے وہ بھی، چھوٹے بابو" رنیا خاموش ہوگیا۔ یوں کھو گیا گویا خواب دیکھ رہا ہو۔ لیکن اُس سہانے خواب کے باوجود اسکی آنکھیں پُرنم ہو رہی تھیں۔ گویا کسی ساکن اور گہری جھیل میں تیر رہی ہوں۔ "ہاں چھوٹے بابو" اُس نے اِک بے بسی اور حسرت سے بات شروع کی۔ کیا دن تھے وہ۔ میں ان کو دیکھنے میں اپنا کام کاج بھی بھول جاتا۔ بس صبح شام کھڑا ان کو دیکھتا رہتا۔ پر یہ اپنے آپ میں مگن تھے انہیں کیا مالوم کہ رنیا دیکھ رہا ہے وہ سب جانتا ہے۔ انہیں تو اپنی بھی سدھ بدھ نہ تھی۔ پر وہ —— نہ جانے کیا نام تھا اس کا بھلا سا نام تھا۔ بل۔ بل۔ بل۔" اور وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"بلراج ——؟" پرکاش نے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔

شاید اُس نے پرکاش کی بات نہ سنی۔ "بل۔ بلبیر کماری۔" وہ بولا "ہاں ہاں بلبیر کماری وہ کماری بڑی پرکھ والی تھی۔ میں جانوں اُسے سب پتہ تھا اسے مالوم تھا میں دیکھ رہا ہوں جب وہ رسوئی کی کھڑکی کے سامنے آتی تو جرور ایک نجر اٹھا کر دیکھتی۔ گُور سے دیکھتی تھی۔ مجھے۔ جانتی ہوگی وہ کہ میں بابوجی کا رسوئیہ ہوں۔ جرور جانتی ہوگی۔

"تم بھی تو نوجوان تھے" پرکاش مسکرانے لگا۔

"آپ تو مجاک کریں ہیں" اُس نے حسرت بھری آواز سے کہا۔ "جوانی تو چھوٹے بابو اُنہیں ہی آوے ہے جنہیں رام نے دیا ہے۔ رسوئیہ کی جوانی بھی کیا جوانی ہے چھوٹے بابو وہ تو رسوئیہ ہوا۔ چاہے بڈھا ہو یا جوان۔ اور پھر مہاراج وہ لکھ پتی کی بٹیا۔ آپ تو مجاک کریں ہیں مہاراج! اُس نے اک آہ بھری اور مجھے مخاطب کر کے کہا۔ پھر اک دن بابوجی

ادھر سے جا رہے تھے اور کماری اُدھر سے آ رہی تھی۔ جب دونوں میں تھوڑا فاصلہ رہ گیا اور بابو جی روج کے سمان پٹڑی سے سڑک پر اُترے تو وہ بھی پٹڑی چھوڑ سڑک پر اُتر آئی۔ شاید وہ بھی اس وزنی پٹڑی پر آنا چاہے تھی مہاراج! بابو جی یہ دیکھ کر یوں گھبرائے کہ ایک بھینس جو جا رہی تھی اس سے جا ٹکرائے اور وہ مسکرائی۔ پر چھوٹے بابو۔ بابو جی کو بہت چوٹ آئی۔ اور وہ دیوی مسکرا کر اپنی راہ چلی گئی مڑ کر بھی نہ دیکھا اُس نے"

"اگلے روز بابو جی کالج جانے کی جد کرنے لگے، پر چھوٹے بابو میں نے جانے نہ دیا۔ اتنا بڑا حکم ہو گیا تھا ٹانگ پر! میرے کہنے سے گئے تو نہ پر جی! دیکھے بنا نہ رہ سکے۔ گسلکھانے کی کھڑکی سے دیکھتے رہے۔ ادھر میں بھی دیکھ رہا تھا کہ دیکھوں آج بابو جی کو پٹڑی پر نہ پا کر کیا کرتی ہے وہ۔ میرا کھیال تھا چھوٹے بابو کہ اس رانی کا کیا گیا تھا۔ اُس کی بلا سے چاہے کوئی مرے یا جئے۔ پھر وہ آئی اور اُس نے دور سے دیکھا چاروں طرف دیکھا۔ اور پھر یوں چپ چاپ چلی گئی جیسے مٹی کی بنی ہو، نہ وہ لٹک نہ ہنسی۔ دوسرے دن بھی وہ یونہی گجری پر تیسرے دن وہ نل کے پاس آ کر رُک گئی۔ نل رسوئی کی کھڑکی کے سامنے تھا۔ بالکل سیدھ میں۔ رُکی، پھر چلنے لگی پھر رُک گئی اور سر اُٹھا کر اُوپر دیکھا۔ میری طرف۔ او رچھوٹے بابو میرا تو جی بیٹھ گیا۔ ایک تو اس کا روب اور دوسرے اسکی آنکھیں لال سی ہو رہی تھیں۔ پھر ہاتھ اُٹھا کر اُنگلی سے مجھے بلایا۔ او رچھوٹے بابو! میں گولی سمان اُڑ کر پہنچا اور پاس جا کھڑا ہوا۔ بولی۔ تم رسوئیے ہو۔ میں نے سر ہلایا۔ کہنے لگی۔ تمہارے بابو کیسے ہیں۔ جیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔ چوٹ تو آئی ہے پر اچھے ہو جائیں گے۔ میں نے جواب دیا۔ پھر بولی۔ تم یہاں اکیلے رہتے ہو۔ میں نے سر ہلا دیا اور کہا میں اور بابو جی بس چھوٹے بابو پھر وہ چلی گئی۔" اُس نے اِک آہ بھر کر کہا۔" واپس آیا تو بابو جی رستہ روکے کھڑے تھے۔ بولے۔ کہاں گیا تھا رنیا، جیسے وہ کچھ جانتے ہی نہ ہوں مجھے معلوم تھا چھوٹے بابو کہ وہ گسلکھانے

میں چھپ کر دیکھ رہے ہیں۔ میں نے آپ دیکھا تھا نہیں۔ میں نے منہ پکا کر لیا اور کہا جی
بھیا کے پاس گیا تھا۔ پھر بابو جی منتیں کرنے لگے۔ نہیں نہیں رنیا سچ بتاؤ کیا کہتی تھی وہ
مجھے مجاک سوجھا کیوں نہ سوجھتا" وہ چمک کر بولا۔ "وہ کیوں چھپ چھپ کر کرتے تھے
بات! میں نے کہا۔ کہتی تھی تمہارے بابو جی بیاہ کریں گے مجھ سے۔ چھوٹے بابو کیا بتاؤں۔
میری جُبان ہی ایسی ہے۔ بس جو کہہ دوں پُورا ہو جا دے ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یونہی
ہو جائے گا۔" اس نے آہ بھر کر کہا۔ "اچھا!——تو یونہی ہوا کیا بڑے دھرماتما ہو تم"
پرکاش بولا۔

رنیا نے اثبات میں سر ہلا دیا اور بولا" جی دھرماتما کیا ہنونگا میں، پر میری جُبان ہی
ایسی کالی ہے! ادھر بات نکلی اُدھر پُوری ہو گئی——بس جی کیا بتاؤں مہاراج۔ دوسرے
دن وہ کماری جی آپ ہی آپ اُوپر آ گئی گھر میں۔ میں آلو چھیل دیا تھا اور بابو اندر پلنگ
پر پڑے تھے۔ وہ تو پڑے ہی رہتے تھے نا۔ ابھی جکھم اچھا نہ ہوا تھا۔ ہو بھی جاتا چھوٹے بابو
تو دل کا جکھم تو تھا۔ دل کا جکھم کب اچھا ہو وے ہے۔ چھوٹے بابو۔" اُس نے ایک آہ
بھر کر کہا۔ "کبھی نہیں۔ کبھی نہیں!"

معلوم ہوتا ہے تمہیں بھی کوئی دل کا زخم لگا ہے۔" پرکاش اُسے چھیڑنے لگا۔

"اجی مہاراج!" وہ مجھے مخاطب کر کے بولا "کون ہے جسے دل کا جکھم نہ ہو وے ہے
چاہے رسوئیہ ہی کیوں نہ ہو

سبھی کو ہو وے ہے چھوٹے بابو۔ کیا بھاگوان کیا نردھن۔

"اچھا تو وہ تمہارے گھر آ گئی" پرکاش نے اُسے یاد دلایا۔

"جی ہاں تو آلو چھیل رہا تھا میں مڑ کر دیکھتا ہوں تو کماری جی کھڑی ہیں۔ میں تو
کھڑا رہ گیا اور چھوٹے بابو، چاقو اِتنا سا اُنگلی میں چلا گیا۔ اور مجھے معلوم بھی نہ ہوتا۔ اور رکھون
بُوند بُوند گرے ہے اور وہ حیران، دیکھے ہے میری طرف۔ اُدھر بابو جی نے دیکھ لیا ہوگا۔

اور وہ جگھم والی ٹانگ سمیت اُٹھ کر دروازے میں آکھڑے ہوئے۔ اور میں حیران کھڑا بابو جی کو دیکھوں ہوں۔ اور بابو جی کماری کے منہ پر نجر جمائے حیران کھڑے دیکھیں ہیں چھوٹے بابو اس روج تو" وہ ہنسنے لگا۔ "اُس روج تو بائیسکوپ ہو رہا تھا ہمارے گھر میں۔ پھر مہاراج نہ جانے کماری جی کو کیا ہوا۔ مُرگنی جیسے جارئی ہو اور میں حیران کہ آئی بھی اور چل بھی دی۔ اُدھر بابو جی بڑبڑائے اور پیچھے دوڑے، پر دو کدم پر رُک کر کھڑے ہو رہے۔ پھر میں ہی بولا۔ چائے تو پی جاتے دیوی جی تیار ہی ہے اور وہ بن دیکھے بولی۔ آج نہیں پھر سہی اور ہولے ہولے سیڑھیاں اُترتی گئی۔ اور بابو جی نہ جانے کیا کیا بڑبڑاتے رہے۔ انہیں پوری بات کرنے کی ہمت بھی ہوتی؟ پھر وہ آپ ہی نچلی سیڑھی پر پہنچ کر رُکی۔ ہم دونوں کھڑے سے لگے نیچے جھانک رہے تھے۔ نجر بھر کر اُوپر دیکھا اور بولی۔ اب تو تمہارے بابو جی اچھے ہیں نا رسوئیہ! جی جی۔ بڑی مہربانی ہے بابو جی بڑبڑائے اور میں بھاگ کر نیچے اُتر گیا۔ میں نے کہا دیوی جی چائے تو پی جایئے۔ اور وہ مسکرا کر کہنے لگی نہیں رسوئیہ، پھر سہی پھر آؤنگی میں۔ اور جی، یہ کہہ کر پھر اُوپر دیکھا، بابو جی کی طرپھ اور مسکرائی۔" رنیا ایک آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر کے بعد اُس نے آپ ہی سلسلۂ کلام جاری کر دیا۔ " اگلے روج وہ پھر آئی۔ اُس روج تو میں نے بٹھا ہی لیا۔ میں نے کہا دیوی آج تو چائے پیئے بنا نہ جانے دونگا میں۔ یہ آپ ہی کا گھر ہے۔ یہ سُنکر وہ مسکرائی اور نیچی نجر سے بابو جی کو دیکھا۔ وہ بھی مسکرائے بڑی نیج تھی وہ۔ بڑی۔"

"جب میں چائے لیکر آیا چھوٹے بابو! اُنہیں ایک میج پر بیٹھے دیکھا۔ تو میرا جی بہت کھشں ہوا مہاراج۔ بہت۔ مجھے دیکھ کر بولی رسوئیہ تمہاری اُنگلی کیسی ہے اور چھوٹے بابو نہ جانے میں نے اُنگلی کیوں چھپالی۔ بس چھپالی میں نے اور کہنے لگا۔ انگلی کو تو کچھ نہیں ہوا دیوی جی۔ وہ مسکرائی کل کٹ جو گئی تھی۔ میں نے کہا دیوی یہ انگلیاں تو روج ہی کٹتی ہیں

رسوئیہ جو ہوا۔ چاکو کا کام ہے دیوی۔ ان انگلیوں کا کیا ہے۔ اور چھوٹے بابوجی پھر جو میں نے چائے رکھ کر سیب چیرنے کو چاکو اٹھایا تو اُس نے چاکو میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ اونہوہ۔ انگلی کٹ جائے گی اور مسکرائی۔ میں نے کہا نہیں دیوی جی روج تو نہیں کٹتی۔ اور کیسی نیچ تھی وہ، چھوٹے بابو! ہنس کر بولی آج تو جرور کٹ جائے گی اور میں سرما کر رسوئی میں آ گیا پھر وہ اکیلے بیٹھے رہے۔ بابوجی کو بس چپ لگی تھی۔ ہاں وہ کبھی کبھی کچھ کہہ دیتی۔ میں نے تو صرف اتنا ہی سنا کہتی تھی۔ اس روج آپ گر کیوں گئے۔ پھر بولی۔ پٹڑی سے اتر کیوں آتے تھے آپ پھر نہ جانے کیا کہا اُس نے اور وہ کیا بولے، مجھ سے تو سُنا نہ گیا۔ چھوٹے بابو پھر وہ جور سے ہنسی، یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔ اور مجھے آواج دے کر بُلایا۔ رسوئیہ یہ دیکھو تو کیا کر رہے ہیں۔ تمہارے بابوجی۔ اور میں بھاگا بھاگا گیا تو دیکھوں ہوں بابوجی شکر والی پیالی میں چائے ڈال چکے ہیں۔ شکر والی پیالی میں چائے بنانے لگے تھے۔ بابوجی بولے میں بھی پاگل ہوں۔ رسوئیہ وہ مسکرائی، تمہارے بابوجی کو کیا ہو گیا ہے اور نیچی نجر سے اُدھر دیکھا میں نے کہا۔ دیوی آپ ہی جانیں۔ وہ بولی کیوں میں کیوں جانوں۔ میں نے کہا آپ نہ جانیں تو کون جانے اور وہ سرما سی گئی۔ میں اور لاتا ہوں شکر میں نے کہا اور ٹل گیا وہاں سے مہاراج۔ اُس سمے تو کھا لکھا تھا چھوٹے بابو۔ پر نہ جانے جلدی میں مجھے کیا ہوا شکر والے چینے کو چھوڑ سوجی کی پیالی بھر لایا۔ میں پیالی لے کر کھڑا ہو گیا اور اُس نے چمچہ بھرا اور مسکرائی اور پھر ہنسنے لگی۔ میں حیران۔ اُدھر بابوجی حیران پر وہ کھُش تھے۔ بڑے کھُش۔ یہ کیا ہے وہ بولی شکر ہے میں نے کہا۔ اچھی شکر ہے یہ، وہ ہنسی اب میں جو دیکھ رہا ہوں تو سوجی تھی۔ اوہ میں چلا آیا۔ بالکل پاگل ہے، بابوجی بات سمجھ کر چلائے۔ دیکھ کر کام نہیں کرتا۔ اور وہ اُس شکر کی پیالی کی طرف دیکھ کر ہنسی جا رہی تھی جس میں بابوجی نے چائے ڈال دی تھی پھر بابوجی نہ جانے سمجھ کر یا ویسے ہی کھسیانے سے ہو گئے پر مہاراج انکی اپنی سدھ بدھ ماری وی تھی بھلا بات کیا کرتے۔ ویسے آج کل کالج کے لڑکے تو اتنی باتیں کریں ہیں کہ لوگ منہ

دیکھتے رہ جائیں ہیں پر چھوٹے بابو ان کی باتیں جبھی تک چلیں ہیں۔ جب تک کوئی دور جا رہی ہو۔ اور ہمارے بابو جی تو بس پی جانا ہی جانیں تھے۔ وہ چلی گئی تو پھر وہ لگے مجھے گھورنے رنیا یہ کیا کیا تو نے سوجی لادی وہ کیا کہتی ہوگی مجاک کیا مجھ سے۔ اور چھوٹے بابو میں چپ۔ اور کرتا بھی کیا۔ آخر رسوئیہ ہی ہوں نا۔ چاہے وہ کیسا اچھا ہی کیوں نہ جانیں۔ پھر بھی رسوئیہ رسوئیہ ہی ہے۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے رنیا" پرکاش بولا "اچھا تو پھر بھی کبھی آئی وہ؟"

"ہاں چھوٹے بابو صرف ایک دپھہ" وہ چپ ہو گیا۔ آنکھیں بھر آئیں اور چند ساعت کے لیے بُت بنا بیٹھا رہا۔ "دن ڈھلا ہوا تھا اور میں رسوئی میں بیٹھا تھا۔ بابو جی اندر لیٹے وے تھے۔ وہ آئی اور منہ پہ اُنگلی رکھ مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا، پھر پاس آئی اور میرے کان سے منہ لگا کر بولی۔ کہاں ہیں۔ میں نے انگلی سے بتایا کہ اندر لیٹے وے ہیں۔ بولی چپ پھر ایک لپھاپھہ نکال کر تھما دیا مجھے۔ یہ دے دو اُنہیں پھر اُنہیں یہ نہ بتانا کہ میں آئی ہوں۔ کہنا کوئی دے گیا ہے۔ اور کہنا جواب مانگا ہے۔ میرا بتایا تو میں ناراج ہو جاؤں گی۔ چھوٹے بابو کیا بتاؤں۔ وہ کچھ کہے اور اُس سے نہ کرنا مشکل ہو جائے تھا۔ ایسی اچھی تھی وہ۔ وہ تو کونے میں لگ چھپ کر کھڑی ہو گئی اور میں سمجھا کچھ مجاک ہے۔ سو میں بھاگ کر بابو جی کے پاس لے گیا وہ لپھاپھہ۔ مجھے کیا مالوم کیا بھرا ہے اِس میں بابو جی نے کھولا۔ پڑھا اور رنگ ہلدی سا ہو گیا۔ بولے کس نے دیا ہے تمہیں۔ میں نے کہا بابو جی ایک چھوکرا آیا تھا اُس دیوی نے بھیجا ہے اور جواب کو کہا ہے۔ بولے کب آیا تھا۔ میں نے کہا۔ جب آپ پڑھنے گئے وے تھے۔ اوہ۔ اوہ۔ پاگلوں کی طرح پھرنے لگے۔ اب میں کیا کروں۔ کیا کروں میں۔ اب کیا ہوگا رنیا! اور میں حیران میں نے پوچھا کیا لکھے ہیں۔ بولے کچھ نہیں، کچھ نہیں تم اب جاؤ۔ جاؤ تم۔ اب جو میں رسوئی میں آیا تو وہ کونے سے لگی کھڑی تھی۔ منہ پہ ہنسی۔ پر چھوٹے بابو جافران کی سمان جرد رنگ۔ پھر میرے کان سے منہ لگا کر بولی۔ پوچھو جب

چھوڑ آئے تو کیا جواب دوں۔ مجھے تو ڈر لگتا تھا بابوجی کے سامنے جاتے وے۔ اُس نے کہا تو کیسے نہ جاتا میں۔ چلا گیا اور وہ جواب کا سُن کر چیخنے لگے، رنیا، رنیا سچ بتا یہ اُنہوں نے بھیجا ہے۔ سچ بتا رنیا۔ جی، میں نے کہا۔ پھر وہ آپ ہی آپ بولے۔ اب کیا ہوگا۔ اُچھ رنیا مجھ سے ایسا مجاک نہ کر۔ میں نے کہا بابوجی میں کیوں کرنے لگا آپ سے مجاک۔ لیکن میرے ماتا پتا، وہ بولے کیا کہیں گے۔ رنیا۔ ماتا تو مان جائے پر پتا جی کیسے مانیں گے اور۔ اور رنیا نہ جانے وہ کون ہے۔ نہ جانے کیا جات ہے اُس کی۔ میں پتاجی کو کیا بتاؤں گا۔ نہیں نہیں میں پتاجی سے کیسے کہہ سکتا ہوں رنیا میں نہیں جاؤنگا نہیں جاؤنگا۔ میں حیران چھوٹے بابو اب میں کھڑا ان کا منہ دیکھ رہا ہوں۔ اور پھر جو سر اٹھایا میں نے تو دروازے میں وہ آپ کھڑی ہے۔ لال لال آنکھیں اور ہونٹ گھُسّے سے بھرے وے۔ ایک نجر اُس نے بابوجی کی طرپھ دیکھا۔ اور بابوجی بُت بنے کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ وہ بولی۔ آپ کو مجھ سے گرج ہے یا جات سے۔ اور وہ چل پڑی، اب بابوجی پاگلوں کی طرح پیچھے بھاگے اور بولے نہ جاؤ بلبیر! یہ اُس کا نام تھا نا۔ نہ جاؤ۔ کھیا نہ ہو جانا بلبیر! میرے ماتا پتا۔ میں اُن کی مرجی بنا کیا کر سکتا ہوں۔ تم نہ جاؤ۔ آکھر چھوٹے بابو وہ کھڑی ہو گئی اور بولی اچھا تو پوچھ لیجئے اپنے ماتا پتا سے۔ اگر وہ مان جائیں تو مجھے ملنا۔ اگلے بدھ کو باغ میں ملونگی میں۔ اِسی وقت۔ اور اور وہ ہونٹ کاٹ کر بولی اگر نہ ملے آپ تو بس میں سمجھ لونگی کہ وہ نہیں مانے۔ پھر میں کبھی نہ ملونگی۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

چھوٹے بابو مجھے کیا کھبر تھی کہ یہ بات ہے۔ میں تو مجاک سمجھتا رہا۔ پھر اُس سمے مجھے مالوم ہو گیا کہ مجاک نہیں۔ اور بابوجی تو پھر بالکل اپنے آپ سے بھی گئے۔ کبھی رونے کبھی لیٹ رہتے اور کبھی آپ ہی آپ اِدھر اُدھر پھرتے اور بڑبڑاتے۔ پتاجی کیا کہیں گے نہیں نہیں میں پتاجی سے نہ کہونگا، چاہے کچھ ہی کیوں نہ؟ اور پھر چُپ ہو جاتے اور کچھ دیر کے بعد پھر بولتے۔ نہیں نہیں میں جاؤنگا مجھے جانا ہی ہوگا۔ میں جاؤنگا جرور جاؤنگا

چاہے کچھ ہو۔ رنیا میں جاؤں گا اور چھوٹے بابو ساری ساری رات نہ سوتے۔ سوتے بھی تو آپ ہی آپ اُٹھ بیٹھتے اور یہی چلاتے۔ پھر مجھے مالوم ہوا کہ اُس نے بیاہ کیلئے لکھا تھا۔ پر چھوٹے بابو کبھی سُنا ہے آپ نے کہ لوٹکی آپ اپنے بیاہ کی بات کرے۔ توبہ پر وہ کالج میں تھی نا! بارہویں میں تھی۔ کالج کی لڑکی کا کیا ہے۔ چھوٹے بابو چاہے جو بھی کہدے۔ اس کا کیا ہے۔ اور وہ تھی بھی ایسی تیج۔"

"اس روج کے بعد" اُس نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "میں نے اُس کو اس سڑک پہ سے گجرتے نہ دیکھا۔ میں سارا سارا دن کھڑا رہتا۔ چھوٹے بابو! پر وہ آئے تو دِکھے۔ اُدھر بابو جی بھی انتجار کرتے پر وہ نہ آئی۔ اور بابو جی کی حالت مجھسے دیکھی نہ جائے تھی۔ سو چھوٹے بابو میں نے بابو جی کو دلاسہ دیا اور آپ بڑے لالہ جی سے بات کرنے کیلئے گاؤں چلا گیا۔ پر چھوٹے بابو وہاں میری بات کون سنے تھا، بڑے لالہ جی سے بات کی تو وہ ہنس پڑے بولے کس کی لڑکی ہے وہ کتنی جائیداد ہے اس کے پتا کی، اور انکی جات کیا ہے اب میں کیا بتاؤں بابو جی۔ بس چپ ہو رہا میں۔ پر ماتا جی سے میں نے ساری بات کہدی ساری بات سُنا دی اُنہیں۔ اور ماتا جی تو سن کر مجھ پہ ٹوٹ پڑیں۔ بولیں اچھا اب ایسا ہو گیا ہے وہ۔ نرلج کہیں کا۔ رنیا اگر اس نے ایسی ویسی سے بیاہ کر لیا تو میں جہر کھا لونگی جہر! نہ جانے کیا کیا بولتی رہی وہ۔" رنیا نے آہ بھری "بس مہاراج میں اپنا منہ لیئے آ گیا واپس۔

بابو جی نے مجھے دیکھا اور جھٹ سمجھ گئے۔ بولے۔ میں تو پہلے ہی جانوں تھا۔ میں جانتا تھا وہ نہیں مانیں گے۔ رنیا، رنیا تم بولتے نہیں۔ بولو کیا کہا ہے اُنہوں نے، پتا جی کیا کہتے تھے۔ تو چھوٹے بابو اب میں کیا کہتا۔ میں نے چپکے سے سر ہلا دیا۔ پھر وہ بولے لیکن ماتا جی۔ ماتا جی نے تو نہ نہ کی ہو گی۔ رنیا بتاؤ مجھے۔ تم چپ کیوں ہو۔ میں نے کہا جی وہ کہیں تھیں۔ جو ایسا کیا اُس نے تو میں جہر کھا لونگی۔ جہر! ؟ وہ بولے اور پھر وہم سے پلنگ

پر گرے۔ اب بابوجی کا اور بھی بُرا حال ہو گیا۔ ہر سمے بولتے۔ نہیں نہیں رنیا میں نہیں جاؤنگا۔ میں نہیں جاؤنگا رنیا۔ کیا ماتا جی سچ مچ جہر کھالیں گی۔ رنیا سچ بتاؤ۔ اب میں کیا بتاتا بابوجی۔ پھر وہ آپ ہی آپ بولتے۔ رنیا میں جرور جاؤں گا میں جرور ملوں گا۔ میں جیونگا مجھے جینا ہے رنیا۔ مجھے بھی کئی بار کھیال پڑتا چھوٹے بابو کہ نہ جانے وہ کون دیوی ہے نہ جانے کیسے لوگ ہیں وہ۔ بڑے لالہ جی سچ کہتے ہیں، پر مجھے پوچھنا ہی کون تھا۔ ہاں بابوجی کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ پھر بُدھ کا دن آ گیا۔ جب اُس نے باگ میں ملنا تھا بابوجی سے پر اس روج تو بابوجی نڈھال پڑے تھے مہاراج آٹھ دن نہ کھایا نہ پیا اور ہر سمے اُٹھ اُٹھ کر پاگلوں کی سمان بھاگنا۔ مجھ سے بولے رنیا پتا جی کی اور بات ہے پر ماتا جی، ماتا جی نے جہر کھا لیا تو ـــــــ لیکن رنیا میں جاؤنگا۔ مجھے جانا ہی ہوگا۔ پھر آپ ہی آپ سوچ میں پڑ جاتے جب دو گھنٹے رہ گئے تو مجھے بلایا۔ بولے رنیا۔ مجھے ڈر ہے میں چلا نہ جاؤں۔ رنیا ماتا جی کو بچا لو۔ تم ماتا جی کو بچا سکتے ہو رنیا! ماتا جی کو بچانا تمہارا دھرم ہے رنیا۔ میں بچا لوں۔ میں حیران، چھوٹے بابو۔ میں بھلا ماتا جی کو کیسے بچا سکتا تھا۔ بولے ہاں تم بچا سکتے ہو ماتا جی کو رنیا۔ بچاؤ گے؟ میں نے سر ملا کر ہاں کہہ دیا اور کیا کرتا میں چھوٹے بابو۔ بولے سوگند کھاؤ میں نے کہا بھگوان جانتا ہے جو آپ کہیں کرونگا۔ بولے اچھا تو ایک تالہ لے آؤ۔ پھر وہ میرے ساتھ پچھلے کمرے میں چلے گئے اس کمرے کا صرف ایک دروازہ تھا۔ بولے رنیا یہ لو دو روپے آج دو نوشو دیکھنے ہیں تم نے۔ میں حیران۔ بولے اور جاتے وے اس کمرے کو باہر سے تالہ لگا دینا۔ تالہ میں نے پوچھا، بولے ہاں کہیں میں چلا نہ جاؤں۔ مجھے ڈر ہے میں چلا جاؤنگا۔ رنیا میں چلا جاؤنگا۔ ماتا جی کو بچانا تمہارا دھرم ہے رنیا۔ جاؤ۔ ابھی تالہ لگا کر چلے جاؤ۔ چلے جاؤ۔ اور مہاراج وہ دھڑام سے پلنگ پر گر پڑے اور رو رو کر حال بے حال کر لیا۔ آپ ہی کہیں کیا کرتا مہاراج میں نے دروازے کو باہر سے تالہ لگا دیا اور آپ چلا گیا۔"

"تو پھر وہ کبھی نہ آئی" شِو پرکاش نے پوچھا۔

رنیا نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ اس سمے اسکی آنکھوں میں ان بہے آنسو چھلک رہے تھے۔
"اور دروازہ بند ہی رہا" پرکاش گنگنایا۔
"جی" رنیا بولا۔
عین اس وقت ساتھ والے کمرے سے کسی کی آواز آئی "ساوتری۔ تم پھر کھڑکی میں آ بیٹھی ہو۔ ساوتری۔ تم سے جو کہا ہے دروازہ کھولکر نہ بیٹھا کرو"
پرکاش چونکا۔ اور مجھ سے کہنے لگا "سنا تم نے یہ کمرا ہے اُس کا۔ غالباً اس کا پتا گھور رہا ہے۔ ساوتری۔ اچھا نام ہے"
"چل اُٹھ یہاں سے" آواز پھر آئی "راجو یہ کھڑکی بند کر دو۔ بند کر دو اِسے"
معاً بابو جی کمرے کے بیرونی دروازے کے پیچھے بڑبڑائے "لو یہ دروازہ بھی بند ہو گیا۔ یہ بھی بند ہو گیا۔ اب کوئی کیا کرے۔ رنیا اور رنیا" رنیا نے جلدی اُٹھ کر دروازہ کھولا اور وہ اندر آ گئے "تم آ گئے رنیا۔ بڑا اچھا ہے" وہ بڑبڑاتے ہوئے ہماری طرف آئے "تم آجایا کرتے ہو۔ رنیا ضرور آجایا کرتا ہے۔ مسٹر۔ مسٹر"
"مسٹر بلراج" پرکاش نے اُنہیں یاد دلایا۔
"مجھے نام یاد نہیں رہتے۔ مسٹر راج۔ اچھا ہوا تم نے چائے پی لی۔ بڑا اچھا ہوا۔ مہربانی ہے۔ مہربانی۔ رنیا اب دروازہ بند نہ کرنا وہ بولے۔ ہم قیدی نہیں ہیں۔ نہیں ہیں۔ اچھا تو میں چلتا ہوں۔ مجھے جانا ہے۔ میں ذرا ہو آؤں۔ رنیا۔ او وہ پھر چلا گیا" وہ شکایت کرنے لگے لیکن انکی آنکھیں حسرت، یاس اور بے بسی سے بھری تھیں "اچھا میں ہو آؤں۔ بڑبڑاتے ہوئے وہ اندر داخل ہو گئے۔

ساحرلدھیانوی

تاج محل

تاج تیرے لئے اک مظہرِ الفت ہی سہی
تجھ کو اس وادیٔ رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھکو!
بزمِ شاہی میں غریبوں کا گذر کیا معنی؟
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوتِ شاہی کے نشاں
اس پہ اُلفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی؟

میری محبوب پسِ پردۂ تشہیرِ وفا
تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا
مردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا

اَن گنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے ان کے
لیکن ان کے لئے تشہیر کا سامان نہیں
کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے

یہ عمارات و مقابر، یہ فصیلیں یہ حصار — مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستون
سینۂ دہر کے ناسور ہیں کہنہ ناسور — جذب ہے ان میں ترے اور مرے اجداد کا خون

میری محبوب! انہیں بھی تو محبت ہو گی
جن کی صنّاعی نے بخشی ہے اسے شکلِ جمیل
ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود
آج تک ان پہ جلائی نہ کسی نے قندیل

یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارا، یہ محل — یہ منقش در و دیوار، یہ محراب، یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر — ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق
میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ کو!

قیّوم نظر

اپنی کہانی

اُس کی آنکھیں ہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر
مرمریں راکھ کا باریک سا شفّاف غلاف
دم بخود شعلوں کی حدّت سے چڑھا ہو جیسے
شیر کے پنجرے کو گھیرے ہیں تماشائی کتنی
دوپہر، موسمِ سرما کی بھلی دھوپ، مگر
وہ کسی اور ہی عالم میں پڑا ہو جیسے
اُس کی آنکھوں میں کھٹکتی ہے وہی رات ابھی
جس میں کمزور شکاری نے ریاکاری سے
ایسی دنیا میں وہ خود جس کا خدا ہو جیسے
جس میں ہنگامۂ محشر ہو کبھی اُس کا خرام
سانس لے سکتا نہ ہو جس میں کوئی اُس کے سوا

اُس کی آواز جہاں سیلِ بلا ہو جیسے
ایسی دنیا میں کیا ستمگوں ہاتھوں سے اُسے
دست و پا باندھ کے یوں فاقہ کشی پر مجبور
جامِ آزادی میں پیغامِ فنا ہو جیسے
تنگ و بے ربط ہے اب روزنِ زنداں کیطرح
تلخیٔ جبر میں لپٹا ہوا پامال کچھار
جس میں وہ — بھورا سا اک ڈھیر پڑا ہو جیسے
اور پھر سامنے اُس کے ہیں پھدکتے آہو،
چڑچڑاتے ہوئے لنگور، اکڑتے بندر
بوڑھا لومڑ — جو کھڑا اونگھ رہا ہو جیسے
اُس کی آنکھوں میں اُتر آیا ہے احساس کا خوں،
سرد لوہے کی سلاخیں، یہ گراں دیواریں
توڑ ہی ڈالے گا اب ٹھان چکا ہو جیسے

مسعود پرویز

مجرم

چھوڑ دوں تجھ کو؟ میرے دوست کا تو قاتل ہے
اور میں ایک حریف
بہ بصر قدرتِ بے پایاں کا
اُس کی گمراہ توانائی کا جانی دشمن

رحم؟
ہاں رحم مجھے تجھ پہ ضرور آتا ہے
جانتا ہوں کہ گنہ کی تہ میں
کام کرتا ہے فقط ذہنی فتور
یہ مرض ہے متعدی لیکن
اور بیچارے عوام

خیر و شر کو ابھی سمجھے ہی نہیں
جرم کی گر نہ سزا ہو کوئی
کون روکے گا اڈتی ہوئی گمراہی کو؟

میں تجھے چھوڑ دوں اے ذہنی مریض
اور کروں تیرا علاج
آہ! میں کانپ کے رہ جاتا ہوں
کہ اگر ٹوٹ گئی خوف کی زنجیر کبھی
ہوش کھو دیں گے عوام
تیز ہو جائیں گے سفاک ہوس کے پنجے
بے دھڑک کوچہ و بازار میں جھپٹیں گے عقاب
اور خونخواری کو مل جائیں گے حیلے لاکھوں،
بھیڑیا قالبِ انساں میں ہے مستور اب بھی
اُن گھنے جنگلوں اور غاروں کی میراث، جہاں
دندناتے تھے کبھی آدم خور ——
آدمیت کے پُرانے اجداد!
وقت نے کھودیں لیں سیکڑوں، لیکن اب تک
ایک بازیچۂ بے روح ہے انساں کا دماغ
اور بیچارے عوام
خیر و شر کو ابھی سمجھے ہی نہیں!

مجرم

چھوڑ دوں کیسے تجھے؟
تُو ہے قاتل، تیرا انجام ہے موت
اور جمہور کا آرام و سکوں
ہے اہم تر تیری آزادی سے
ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ جب ہر مجرم
رکھا جائیگا کسی ذہنی شفاخانے میں
پے بہ پے کروٹیں لینی ہیں ابھی دُنیا کو
ابھی اُبھریں گے کئی اور نظام
جب بلوغت پہ کہیں پہنچے گا انساں کا دماغ
اور مجرم کی سزا ہوگی علاج

پھر نہ مجرم ہی رہے دُنیا میں شاید کوئی
اور نہ انسان کو انسان سے پرخاش رہے
اور وہ ذہن کی گمراہ توانائی خام
صرف جو دہر کی تخریب پہ ہوتی ہے ابھی
آتش و آب و گل و باد کے ہنگاموں پہ
حکمراں ہونے پہ آمادہ ہو!
بے بصر قوتیں قدرت کی فلک بوس سہی
وسعتِ ذہن بھی محدود نہیں ہے لیکن
اور ناقابلِ تسخیر ہے انسان کا عزم ——
ایک دن عرصۂ عالم میں ضرور

قصرِ فردوس کی بنیاد رکھی جائے گی!

ہے یہ فردوس مگر دور ـــــ بہت دور ابھی
اور لوگوں کے ہجوم
خیر و شر کو ابھی سمجھے ہی نہیں
خوف کی آہنی زنجیر میں جکڑے ہوئے پاؤں
ابھی جکڑے ہی رہیں گے برسوں
اور جمہور کی خوشحالی پر
جان قرباں تجھے کرنی ہوگی
انتقام اب میں لیا چاہتا ہوں
ایک انساں سے نہیں ـــــ قدرت سے
لے سنبھل! تان لے سینہ قاتل!
اور کہہ اپنی اجل کو لبیک

راجہ مہدی علیخاں

چور

اے خالقِ ہر ارض و سما وقتِ دُعا ہے
بندے پہ ترے آج عجب وقت پڑا ہے

پہلے بھی ہر آفت سے مجھے تُو نے بچایا
دائم رہا مجھ پہ ترے الطاف کا سایا

جب نام ترا لے کے کبھی نقب لگائی
ہر کام کی تدبیر مجھے تُو نے سجھائی

گر نام ترا لے کے کوئی قفل مروڑا
عمروں میں نہ جو ٹوٹ سکے پل میں وہ توڑا

حق یہ ہے کہ کُتّوں کو سُلا رکھتا ہے تو ہی
میرے لئے دروازہ کھُلا رکھتا ہے تُو ہی!

پولیس کے چنگل سے مجھے تُو نے بچایا
اور قید کی زنجیر میں اَوروں کو پھنسایا

اسی چھت پہ کمند اپنی میں پھینکوں گا گھما کر
ہمّت مجھے چڑھنے کے لئے تُو ہی عطا کر

بسم اللہ! ارے واہ میں قربان، میں قربان
کیا خوب لگی ہے کمند، اللہ تری شان

فکرؔ تونسوی

مراجعت

محسوس کیا میں نے ستاروں کا تنفّس   معلوم کئے ہیں نے بہاروں کے دفینے
بادل میں لچکتی ہوئی بوندوں کو ٹٹولا   روکے ہیں بہکتے ہوئے کرنوں کے سفینے
نوچی ہیں اندھیروں کی الم پوش ردائیں   چھیڑے ہیں اجالوں کے جھلکتے ہوئے سینے

میں بڑھتا ہی بڑھتا گیا کونین بہ کونین
اور چڑھتا ہی چڑھتا گیا ادراک کے زینے

اور اب کہ مجھے لایا ہے ان جادۂ ایام   جب مجھ سے مرا ذہن سنبھالا نہیں جاتا
کانٹا سا کھٹکتا ہے خیالوں کی تہوں میں   جو علم کی پوروں سے نکالا نہیں جاتا

ہونٹوں پہ تڑپ بوسۂ منزل کی ہے لیکن
آگے ہے وہ کہرا جو اجالا نہیں جاتا

بل کھا کے بڑھی آتی ہیں تیروں کی لکیریں   جیسے کسی چھیڑی ہوئی ناگن کا تناؤ

مراجعت

رہ بھی نہیں سکتا، انہیں سہہ بھی نہیں سکتا
چوٹیں یہ تفکّر کی، تدبّر کے یہ گھاؤ

کچھ رہ گیا، کچھ رہ گیا، آغازِ سفر میں
اے ساتھیو، اے آتش و آہن کے خداؤ

کچھ بھی ہو — لاؤ، کوئی شعلہ، کوئی دیپک
اِس کہرے کی سیلی ہوئی آنکھوں میں جلاؤ

ورنہ مجھے لے جاؤ، انہیں خوابگہوں میں
تھیں دل سے ہم آہنگ جہاں وقت کی سانسیں

اخترالایمان

نئی صبح

کالے ساگر کی موجوں میں ڈوب گئیں دھندلی آشائیں
جلنے دو یہ دیئے پُرانے خود ہی ٹھنڈے ہو جائینگے
بہ جائینگے آنسو بنکر، یونہی تھک کر سو جائیں گے
اندھے سایوں میں پلتے ہیں مبہم سے غمگین افسانے
اِس لرزاں دیوارِ الم سے ٹکراتے ہیں پروانے
دُودِ فسُردہ کی انگڑائی لے بن بن کر ٹوٹ رہی ہے،
سُرخ زباں کی نازک لَو پر جاگ رہی ہے ایک کہانی
ٹوٹے پھوٹے جام پڑے ہیں، سونی سونی ہے محفل
دھوپ سے ڈھل کر بیت گئی ہے ساقی کی مجبُور جوانی
کیا جانے کب سورج نِکلے، بستی جاگے، غم مٹ جائیں

اداؔ بدایونی

بیزاری

زیست اک خواب طربناک و فسوں ساز سہی!
رس بھرے نغموں کی اِک دلنشیں آواز سہی!
فرشِ مخمل بھی زر و سیم کی جھنکار بھی ہے
جنّتِ دید بھی ہے، عشرتِ گفتار بھی ہے
چشمِ سرشار کا اعجاز سہی
زیست اک خواب طربناک و فسوں ساز سہی!

قہر ہے اُف یہ تسلسل، یہ تواتر، یہ جمود
یہ خموشی، یہ تسلّی، یہ گرانبار سکوت
شوق کو رخصتِ پرواز نہیں
رفعتِ روح کا در باز نہیں

جسم آسودہ سہی، روح مگر ہے بے تاب
ایک بے نام تغیر کے لئے
درد کی ٹیس سہی، لذتِ جاوید نہیں
نغمۂ امید نہیں
قہر ہے اُف یہ تسلسل، یہ تواتر، یہ جمود!
سوچتی ہوں کہ کوئی حیلۂ تاریک ہے کیا
یہ گرانبار تسلسل

یہ حیاتِ جامد
جس کی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال
کوئی روزن بھی نہیں کوئی دریچہ بھی نہیں
ایک دنیا ہے کہ ہے تیرہ و محدود و اُداس
نور و نکہت سے گریزاں، مہ و انجم سے نفور
جس کی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال
کاش پڑ جائے کہیں ایک خراش —— ایک شگاف
غم کے ہاتھوں ہی سہی
اور بھولے سے کبھی
کوئی آوارہ سی، چنچل سی کرن آنکلے
ایک لمحہ کے لئے
میرے تاریک گھروندے میں اُجالا ہو جائے!

کانتی چند سوندِرکسا

ہندی میں ترقی پسند ادب کا تاریخی ارتقا

آج سے چار سال بیشتر ہندی ادب میں ترقی پسندی کی شکل دھندلی تھی۔ وہ بننے کے عمل میں تھی۔ ادب ترقی کی سیڑھی پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ترقی پسندی کیا ہے؟ ترقی پسندی کیوں ہوئی اور ترقی پسندی کیسے ہو؟ ان سوالوں پر ادب کے سبھی شعبوں میں بڑی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ جتنے ادیب تھے اُتنی ہی قسم کی ترقی پسندی تھی اور ترقی پسندی کی اُسی قدر نئی اصطلاحیں دھڑا دھڑ گھڑی جاتی تھیں۔ ان میں زیادہ تر ادیب پچھلی نسل کے تھے اور رچے ہوئے۔ وہ ترقی پسندی کو یا ادب کی جدید قسم کو نہ تو سمجھتے تھے اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اپنی تمام قوت سے اسکی مخالفت ضرور کرتے تھے۔ نئی نسل کے اکثر ادیب ترقی پسند ادب کے کٹر حمایتی تو تھے لیکن حقیقت میں اُس کے متعلق ٹھیک طرح سے کچھ جانتے نہ تھے۔ یہ لوگ ایک خاص قسم کی عریانی اور بے لگامی کو ہی ترقی پسندی سمجھتے تھے یعنی جنسیات کی محرومِ تسکین خواہشات اور اُن سے پیدا شدہ عریانی کو نہایت بے تکلفی اور آزادی سے ادب میں ننگا کر کے لانے کو ہی ترقی پسند ادب کی تخلیق سمجھتے تھے۔ ایک

طرف کی لاعملی کا یہ دوسری طرف ردعمل تھا۔ ان دونوں رجحانوں کے درمیان ایک تیسری قسم کے وہ ادیب تھے جنہوں نے جدید ترین مغربی ادب کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ مغربی ادب جسمیں Saddism Surrealism جیسے عجیب رجحانوں کی شمولیت ہو چکی تھی۔ جن کے لکھنے والے بیسویں صدی میں انیسویں صدی کے زوال پسند ادب کے جلد ختم ہو جانے والے ادیب تھے۔ اِس قسم کے مغربی ادب کی بھدی اور بدصورت نقل یہ لوگ ہندی میں کرنے لگے تھے۔ ہندی زبان، ہندی ادب اور کل ہندی تہذیب کی تاریخ کو اُس کے جوہر کو وہ نہیں سمجھتے تھے اور اس لیے مغرب کے کسی بھی نئے ترقی پسند رجحان کو اپنانے میں ناکام رہتے تھے۔ ہندی کے نئے ادیبوں کا چوتھا طبقہ وہ تھا جن میں ادبی بیداری اور ایمانداری تھی۔ اِس طبقے کے پُرخلوص ادیبوں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ حقیقت میں ترقی پسندی ہے کیا؟ سماج اور فرد سے ترقی پسندی کا کیا تعلق ہے۔ اور کہ ہندی میں ترقی پسند ادب کی کیا شکل ہونی چاہیئے۔ لیکن یہ سب جاننے اور سمجھنے کے راستے میں سیاسی مصیبتیں تھیں، اور صحیح راستے کی جگہ غلط راستہ کھولا گیا تھا۔ نئے ادیب نے اپنی خام سماجی بیداری کے سہارے اپنی اور اپنی سماج کی زندگی کی برائیوں کو دیکھا اور جنسیات کے راستے میں اُن کا حل ڈھونڈھا۔

دُوسرے الفاظ میں یہ فرائڈ اور مارکس کی ادھ پکی کھچڑی تھی۔ فرائڈ تک ہندی کا ادیب آسانی اور آزادی سے پہنچ جاتا تھا۔ لیکن مارکس تک پہنچنے کے راستے میں سرمایہ داری کی دشواریاں پیش آتی تھیں جس کے پڑوسی، روس، اُسوقت اُس کے دُشمن تھے۔ اِس لیئے ۱۹۴۰ء تک ہندی میں فرائڈین ادب ہی کا دور تھا۔ اور اُسی پر ترقی پسندی کی مُہر لگائی جاتی تھی۔ لیکن سوویٹ سرزمین پر فاشی حملے کی وجہ سے روس اتحادیوں میں شامل ہو گیا اور اصلی سماجی ادب کو ہندوستان میں آنے کا نیم سرکاری پاسپورٹ مل گیا۔ مارکسی رجحان کا پرچار ہوا اور فرائڈ کی نفسیاتی قلابازیوں اور گورکھ دھندوں کا کھوکھلا پن ظاہر ہوا۔ نتیجہ کے طور پر ہندی میں آج ترقی پسند ادب وہی سمجھا جاتا ہے، یا مانا جائیگا جس کی بنیاد سماجی حقیقت پسندی پر

ہوگی۔ ترقی کیا ہے اور کیا نہیں؟ یہ اب ایک مبحث نہیں رہا ہے۔ ہندی میں ترقی پسند ادب کو اب ایک اصطلاح مل گئی ہے۔ اب بڑا مسئلہ یہ ہے کہ آدرش ترقی پسند ادب کی تخلیق کس طرح کی جائے۔ یعنی سوال اب ہیئت کا ہے۔ کسی بھی ادب کی ہیئت کی تشکیل اُس کی زبان کے کلچر اور اُس کے عوام کی زندگی سے ہوتی ہے۔ ہندوستانی زبان، ہندوستانی کلچر اور ہندوستانی عوام کا ادب ہندوستانی ماحول سے ہی بنیگا اور حقیقت میں وہی ادب سچا ادب ہوگا، عوام کا ہوگا، عوام کے لئے ہوگا اور ہندوستان کا ہوگا۔ اور پُوری طرح سے ترقی پسند کہلانے کا حقدار ہوگا۔ رُوسی، انگریزی، چینی، امریکی یا کسی بھی مُلک کے اپنے ترقی پسند ادب سے ہندی کے ترقی پسند ادب کو گھڑنا غلط ہوگا۔ کسی بھی ادب سے متاثر ہونا ایک دوسری بات ہے۔ لیکن آج ہندی کے بعض بیدار اور سمجھ دار ادیب ایسے بھی ہیں جو ادب کی تخلیق مغربی ماحول کی بنیاد پر رکھنا چاہتے ہیں اور رکھتے بھی ہیں۔ ایسا ادب خیال اور نظریے میں ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی ہماری زبان اور ہمارے عوام کے لئے نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کا سبب ہے، اُن ادیبوں کی ہندوستانی تاریخ اور عوام کے ماحول سے ناواقفیت!

ہندی ادب میں بیسویں صدی کی اور ایک نیک فال ہوئی۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں الموڑہ کے ایک حسین پہاڑی گاؤں میں ہندی کے شاعر اعظم سمترا نندن پنت کا جنم ہوا۔ مدیر "سرسوتی" کی صورت میں پنڈت مہاویر پرساد دویدی کی عظیم شخصیت دنیائے ادب میں آئی جس نے برج بھاشا اور ریتی کال ادب کے بھارتیندو یُگ میں زندہ بچے کھچے کھنڈروں کو بھی صاف کر دیا اور بول چال کی زبان کو ادبی معیار بنایا۔ اُسے شعر میں ترجیح دی اور ہر طرح سے اُس کی حوصلہ افزائی کی۔ اس سب کے لئے دویدی جی نے جو کچھ کیا اور جس غیر معمولی قابلیت کا اظہار کیا، وہ ہندی ادب کے ارتقا میں ایک نہایت اہم تاریخی واقعہ ہے۔ برج بھاشا کو لیکر ہندی ادب کا جدید ارتقا اور اُسکا بین الاقوامی ادب کے ساتھ قدم ملا کر چلنا ناممکن تھا۔ جدید زبان نے ہندی کو دو بڑے شاعر میتھلی شرن گپت اور رایودھیا سنگھ اُپادھیائے

"ہری اودھ" دے۔ گپت جی کی "بھارت بھارتی" نہایت مقبول ہوئی اور ضبط بھی کر لی گئی کیونکہ ہندی میں یہی سب سے پہلی نظم تھی جس نے گاندھی ازم کا پیغام دیا۔ ہندی کے ترقی پسند ادب میں یہ بیداری گا سنگ میل تھا جس کے نتیجے کے طور پر رینی کال کی ریتی رادھا، ہری اودھ کی طویل نظم "پریہ پرواس" میں خادمہ قوم کی شکل میں آئی۔ اور اس طرح ہمارے ادب میں وہ عورت جس کی صدیوں سے توہین کی گئی تھی۔ پہلی بار سماجی احترام کی مستحق سمجھی گئی۔ اور پھر تو خود گپت جی نے بھی تلسی داس کی حسین شہوت پرست رانی کیکئی کو بھی "ساکیت" میں ایک انسان کی طرح پیش کیا۔ حالانکہ ٹیگور کی فلاسفی اُرملا، جو اپنی زندگی میں ہمیشہ نظر انداز کی گئی، اُنکے ہاتھوں میں آکر بھی ریتی کال کی ایک ہیروئن بن کر رہ گئی۔

دویدی یگ کے ادیبوں پر گاندھی ازم کا گہرا اثر پڑ رہا تھا اور جلد ہی یہ ادبی دَور سیاسی "گاندھی یگ" میں شامل ہو گیا۔ کیونکہ گاندھی جی اور اُن کا پیغام اُس وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ وہ اپنے غلام وطن کی گھُٹی ہوئی آواز کے پُرزور نمائندے تھے۔ اس نئے انقلابی تغیر کا نتیجہ ادب میں پریم چند بن کر آیا۔ اگر سیاست میں ہندوستانی عوام کے نمائندے گاندھی تھے تو ہندی ادب میں پریم چند گاندھی تھے۔ بلکہ گاندھی سے بھی کچھ زیادہ۔ جہاں گاندھی جی امیر پبلک کی مخالفت کرتے ہوئے بھی اُن کے ساتھ ہیں، (کیونکہ وہ سب کے لئے آزادی چاہتے ہیں)۔ وہاں پریم چند امیروں کے دشمن تھے اور ہندوستان کے غریب کسان اور مظلوم مزدور کے ادبی نمائندے تھے۔ پریم چند کے کردار نہ صرف فرنگی سرکار اور اُسے قائم رکھنے والی طاقتوں سے لڑتے ہیں، بلکہ اُن سبھی مہاجنی اور سرمایہ دارانہ طاقتوں سے بھی کشمکش کرتے ہیں جو ملک کی ترقی میں "پانچواں دستہ" بن کر حائل ہوتی ہیں۔ اور اس طرح آزادی کی راہ میں روڑا اٹکاتی ہیں۔ پریم چند نے انقلابی راہ کو نہیں اپنایا، کیونکہ وہ انقلاب کی سائنس سے ناواقف تھے اور اُسے وہ عقل کا دیوالیہ پن یا پاگل پن سمجھتے تھے۔ انگریزی میں اُنھوں نے ایک جگہ لکھا ہے ——— (Revolution is The Failure of Methods)

اور شاید اسی لئے ہمارے مسائل کا حل ناممکن آدرشیت میں ڈھونڈھنے کی کوشش میں لگے رہے
شروع شروع میں اُنکی ایک کتاب ضبط بھی ہوئی تھی اور میدان انقلاب میں وہی اس کا پہلا
اور آخری قدم تھا جب گاندھی جی کے دونوں Non Compoign
ختم ہو چکے اور نہ ہندوستان آزاد ہوا نہ کسان اور مزدور کی مفلسی دُور ہوئی تب انہوں
نے ہوری (گئو دان) جیسے کشمکش کرنے والے کسان کا جو خواب دیکھا وہ اُن کے اِس
مستحکم اعتقاد اور بے انتہا آدرشیت کا عکس ہے جو اُنہیں زندگی کی ترقی میں ناکامی
کے ردِ عمل (فراریت) کو اُنہوں نے زندگی میں نہیں اپنایا اور یہی اُن کے ترقی پسند ہونے کا
سب سے بڑا ثبوت ہے۔ یوں پریم چند ہمیشہ شری گنیش کے واہن (چوہا) پر بیٹھ کر ہی زمین کا
طواف کرنے کی کوشش میں محو رہے۔ اُن کے جوہر کو زیادہ وسعت اور پھیلاؤ کی ضرورت
تھی، جو شاید اُن کے شخصی حالات اور دیگر مسائل کی وجہ سے اپنا پورا اظہار نہ کر سکی لیکن
جتنا مخلص تعارف، حقیقی ہمدردی، پریم چند کو ہندوستان سے تھی اُتنی اُس وقت کے
کسی دوسرے زندہ ادیب کو نہیں تھی، ٹیگور اور شرت کو بھی نہیں۔ اور اپنے ذاتی تجربے
اور احساس کو لیکر اُنہوں نے جو ادب بھی پیدا کیا ہے وہ ہندوستانی ادب میں بے مثال ہے
اور اسمیں بہت سا ایسا بھی ہے جو دنیا کے کسی بھی ناولی ادب سے ٹکر لے سکتا ہے۔ اِس طرح
پریم چند ہندی ادب کے ترقی پسند ارتقاء میں ایک تاریخی واقعہ ہیں اور اُس کا ایک بے نظیر خزانہ
جب پریم چند نثر میں ترقی پسند ادب کی تعمیر کر رہے تھے، تب نظم میں پنت، پرساد
اور نرالا چھایا واد (The Romantic Movement) کو قائم کرنے میں مشغول تھے
دویدی یُگ کی نظم کا بڑا حصہ غیر شخصی اور عوامی زندگی کے نزدیک تھا شاعر کے
رنج و غم، امید و یاس کا اُس میں کوئی خاص مقام نہ تھا۔ چھایا وادی شاعروں نے اپنے
انا (Ego) کو اہمیت دیکر اپنے عشق و فراق، امید و یاس، سکھ اور دُکھ کو شاعری
کا موضوع بنایا۔ یہ ایک طرح سے دویدی یُگ کی شاعری کا ردِ عمل تھا۔ لیکن ہندی شاعروں

کو اِس رومانی شاعری کی تحریک، جذبہ اور ہیئت انگریزی کے رومانی شاعروں شیلی، بائرن اور کیٹس، ٹیگور، اور دوسرے بنگالی شاعروں سے ملی۔ پنت نے ورڈزورتھ کی طرح قدرت کو پیار کیا ہے اور پرساد نے انسان کے ذاتی رنج و غم کے گیت گائے ہیں۔ نرالا نے فطرتِ ظاہر سے لیکر انسان کے ملبوس، مبہم جذبات تک کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے، جذباتی زندگی میں اُن کی نظر گہری اور وسیع تھی۔ ان شاعروں کی شروع شروع کی نظموں میں اور چھایاواد ی سکول کے دوسرے مختلف شاعروں کی تخلیقات میں انگریزی کے رومانی شاعروں کا اثر ضرورت سے زیادہ واضح رہا ہے۔ چھایاواد کی پیدائش کا تیسرا سبب گاندھی یُگ کی زبردست کشمکش اور روز بروز بگڑتی ہوئی زندگی کی اقتصادی حالت کی خوفناک حقیقت سے فرار اختیار کرنے کی ذہنیت تھی۔ کسی حد تک، محبت، فراری یاس، کمی سے پیار، وغیرہ شروعی رومانیت کے سبھی جزو چھایاوادی شاعری میں موجود ہیں لیکن چھایاواد کے عمل ارتقا میں جدید زبان کی حیرت انگیز ترقی ہوئی اور ساتھ ہی فنِ شعر کی بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسری طرف خیالات میں لپیٹ "رہسیہ واد" Pseudo Myst ic Ism بھی پیدا ہو گیا۔ یہ جھوٹا رہسیہ واد رام کمار ورما اور مہادیوی ورما کی شاعری میں معراج کو پہنچا اور کمال یہ ہے کہ یہ فریب خوبصورت ہے۔ لیکن ترقی پسند اصطلاح میں ہم کہیں گے کہ یہ آرٹ کے ناجائز استعمال کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ مہادیوی کی شاعری تو ہندی زبان کے لفظی حُسن کی چہار دیواری ہے۔ The Limit

Cosummation

پنت اور نرالا جیسے معمارِ الفاظ ہندوستانی ادب میں چراغ لیکر ڈھونڈھنے سے بھی مشکل سے ملیں گے۔ اُن کے الفاظ میں ہی آپ کو ہیرے جواہرات کا سا شفاف حُسن، آنسو کا سا درد اور شبنم کی سی خنک ملائمت پھولوں کی سی تازگی اور خوشبو اور قُم قُم کا سا رنگ مل جاتا ہے۔ ۱۹۳۵ء کے آس پاس ہمارے بڑے بڑے چھایاوادی شاعروں میں تغیر کے نشانات دکھائی دینے لگے۔ جے شنکر پرساد

سکے چھایا وادی تخیل نے طویل نظم "کامائنی" کے آنچل میں آخری راحت پائی۔ سمترا نندن پنت نے فرد کے احساسات کی حسین ترین تصاویر کھینچنے کے بعد شعر کی ایک نئی فنی تخلیق کی جس کا نام اُنہوں نے "گیت گدھیہ" Song in Prose رکھا اور اُس کے ذریعے اُس درد کو "بگ وانی" میں منعکس کرنے کی سعی کی اور پھر "نکشتر" کی کھڑکی سے مارکس اور فرائڈ کی دو آنکھوں سے گاؤں کے کسانوں اور مزدوروں کو دیکھا اور "گرامیہ" لکھی جس کی نظمیں کسانوں اور مزدوروں پر لکھی گئیں، جو ہزاروں ہندوستانی نظموں سے سینکڑوں گنا بہتر ہیں۔ کیونکہ تمہیں ایک بیحد ایماندار شاعر کے جذبات ہیں اور نہایت چابکدست کارگیری کا نمونہ ہے۔ "جوہی کی کلی" سے لیکر "کگرمتا" تک شاعر اعظم سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا نے شعر کے جذبے اور ہیئت میں کئی تجربے کئے اور آزاد نظم لکھنے میں غیر معمولی مہارت حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ اُن کی نظموں کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کا طنز ہے جو بالواسطہ ہوتے ہوئے بھی نہایت تیز ہے۔ جدید ہندی ادب اور چھایا وادی شاعری کی تعمیر میں نرالا ایک زبردست طاقت ہے۔

بھگوتی چرن ورما چھایا واد میں ایک بہت جاندار ہستی لیکر آئے تھے جسے چھوڑ کر وہ گاندھسٹ بنے اور "مانو" میں کچھ بہت اچھی نظمیں لکھیں۔ لیکن سُنا ہے کہ آجکل وہ نیچری ہو گئے ہیں اور نیرو اور ایپی کیورس کے فلسفہ کا گہرا مطالعہ کر رہے ہیں۔ رام کمار ورما چھایا واد کے سائے میں رہ کر ہی جامد اور غیر متحرک ہو گئے ہیں۔ بال کرشن شرما اور ماکھن لال چترویدی شاعری سے زیادہ حُب الوطنی میں دلچسپی لینے لگے اور سیاست میں ہی کھپ گئے ہیں۔ اور یہ کوئی افسوس کی بات نہیں ہے۔ چھایا واد کے زمانۂ ترقی میں ہی مذہبی مئے کے پرستار ہرونش رائے بچن ہندی ادب میں عمر خیام کو لیکر بڑے زور شور سے آئے۔ اُنکی کتابیں "مدھوشالا" اور "مدھوبالا" ہندی میں سب سے زیادہ پڑھی گئیں۔ نوجوان شاعروں پر اُن کا زیادہ اثر پڑا۔ کیونکہ بچن کے ذاتی جذبات اور مسائل چھوٹے رہسیہ وادی لطافت کی سطح کے نہیں بلکہ معمولی سطح کی تھے۔ اسلئے وہ چھایا وادی ملک الشعراؤں کے ہوتے ہوئے بھی زیادہ مقبول ہو گئے اور عوام کے قریب پہنچے

آنچل، نریندر، دنکر وغیرہ نئی نسل کے شاعروں کو بھی بچن کے اِس عجیب اثر کے سبب جھکنے میں دیر ہو گئی اور اپنا وقت آتے آتے وہ چھایا واد کو چھوڑ کر ترقی پسندی میں آ گئے۔ لیکن بچن جہاں تھے وہیں رہے۔ اُنکی تقدیر پرست فطرت جیسی تھی ویسی رہی "نشا نمنترن" اور "ایکانت سنگیت" کے دو سو گیت صفِ اوّل کی گیت شاعری ہے جن کا مقابلہ ہندی کے دُوسرے شاعروں کے کچھ ہی گیت کر سکیں گے "آکل انتر" کے کچھ آخری گیتوں سے سُراغ ملتا ہے کہ بچن اب کمیونسٹ اور سوشلسٹ اہمیّت کو کچھ کچھ اپنا رہے ہیں۔ بچن سے اب بھی بہت کچھ اُمید کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اپنے طبقے کے موجودہ شاعروں میں اُن کے پاس یہ قابلیت اور ٹکنیک ہے جو عوامی ادب کے لئے قطعی موزوں ہونے پر مفید ہو سکتی ہے۔ جو تجربے ترقی پسند شاعری میں نریندر، منگل سنگھ سُمن، آنچل، کیدار ناتھ اگروال، بلبھدر پرساد دکشت پڑھیس۔ مرحوم اگر جا کمار ماتھر، شمشیر بہادر سنگھ، رام ولاس شرما، نرنکار دیو سیوک وغیرہ شاعروں نے کئے ہیں وہ قطعی حیرت انگیز ہیں اور ہندی کی ترقی پسند شاعری کے زبردست مستقبل کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں۔ عورت شاعرات میں سمترا کماری سنہا اور رودیا دتی کوکل نے کافی تحسین حاصل کی ہے۔

ہندی کے موجودہ افسانوی ادب کا آغاز پریم چند کے بعد ہوتا ہے اور اُس کا ارتقا بھی بڑی سُرعت سے ہوا ہے۔ اِس نئے دور کے بارے میں میں اپنے معاصر نقادوں کی نسبت بہت پُر امید ہوں، کیونکہ میں پریم چند کے عظیم ادب کو لوہے کا وزن مان کر تمام ادب کو نہیں تولتا اور ترقی کے متواتر اور قدرتی ارتقا میں اعتقاد رکھتا ہوں۔ ہندی کا آج کا افسانوی ادب پریم چند سے گنتی کے ایک ہزار سال آگے چاہے نہ بھی ہو لیکن وہ وہیں پر نہیں ہے اور نہ ہی اُس سے پیچھے ہے جہاں پریم چند نے اُسے چھوڑا تھا۔ دوسرا پریم چند کیوں پیدا نہیں ہوا اس کے اسباب آج کے افسانہ نگاروں کی سماج اور شخصیت سے باہر ہیں اور بہت کچھ اُنکی بساط کے پرے بھی ہمارے سیاست کا جو ترقی پسند طبقہ ہمارے

ترقی پسند ادب کی مسلسل اور اچھی تخلیق چاہتا ہے۔ اُسے ہی ادیبوں کے لئے وہ سہولتیں مہیا کرنی چاہئیں، جن سے پریم چند بن سکیں۔ پریم چند کے زمانے میں ہی شرت چندر کا اثر ہندی ادب پر پڑنے لگا تھا اور کہنا پڑیگا کہ تاریخی نظر سے ہندی افسانوی ادب پر شرت بابو کا اثر نہایت نقصان دہ اور غیر صحت مند ہوا ہے، نہ صرف ادب پر بلکہ زندگی پر بھی۔ دیوداس پڑھ کر اور فلم دیکھ کر نجانے ہمارے کتنے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بیمار اور خونی محبت کے شکار ہو کر دیوداس اور پاروبن کر رہ گئے اور یا تو خودکشی کر کے مر گئے یا تپ دق کے بیمار ہو گئے۔ متوسط طبقے کی واقفیت اور جیسا چربہ اُس کا شرت چندر نے اُتارا ہے، ویسا اور کسی نے نہیں۔ جیسے پریم چند مزدور اور کسان کے نمائندے ہیں اسی طرح شرت متوسط طبقے کے اور کہتے ہیں کہ انقلاب کے نقطۂ نظر سے یہی طبقہ سماج کا سب سے کمزور حصّہ ہے۔ پریم چند کے کردار مسائل کا حل ناممکن آدرشیت میں ڈھونڈھتے ہیں تو شرت کے کردار پاگل پن میں۔ یہ دونوں حل حقیقت میں ایک ہی ذہنیت کی دو شکلیں ہیں۔ دو پہلو ہیں لیکن ایک صحتمند ہے اور دوسرا نہیں۔ سماجی مسائل کو سلجھانے کے لئے شرت مثالی کردار چنتے تھے، اُن کا تجزیہ سماجی نہیں نفسیاتی طریقے سے کرتے تھے اور آخر میں اُنہیں زبردست شخصیت پرست بنا کر وہیں چھوڑ دیتے تھے۔ سماجی مسائل کا سماجی حل شرت کے پاس نہیں ہے۔

پریم چند کے ہم عصر مشہور افسانہ نگار پرشاد، سُدرشن اور کوشک ہیں۔ چترسین شاستری رشبھ چرن جین، اور ورندابن لال ورما نے بھی کافی شہرت پائی۔ لیکن ان میں سے ورندابن لال نے صرف صوبجات متوسط کے متعلق تاریخی ناول "گڈھ کنڈار" "ورائے کی پدمنی" وغیرہ لکھے ہیں جو صفِ اوّل کے کہے جا سکتے ہیں۔ اسی زمانے میں پنڈت بے چن شرما اُگر نے ہندی دنیا میں چند بہت حقیقت پرستانہ اور عریاں چیزیں لکھ کر سنسنی پیدا کی تھی جس کے خلاف ایک بار وشال بھارت کے ایڈیٹر یا ڈکٹیٹر بنارسی داس چترویدی نے جہاد کیا تھا۔ لیکن یہ اُنکی حد درجے کی زیادتی تھی اور ہندی نے حقیقت میں اپنا ایک نہایت ہی قابل ادیب کھو دیا۔ پرتاپ نارائن

سربو اِستو بھی اُن دنوں کے بہت اچھے افسانہ نگار اور ناول نگار تھے جن کا ناول "وداع" اب بھی ہندی کے بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ ان سب کے ساتھ اور پریم چند سے بھی پہلے چندر دھر گلیری کا ہندی فسانے کی پیدائش اور ارتقا میں حصہ نہ ماننا تاریخ کو جھٹلانا ہوگا۔ گلیری کی کہانی "اُس نے کہا تھا" آج بھی ہندی کی بہترین کہانیوں میں سے ایک مانی جاتی ہے اور ہندی کہانیوں کے ایسے چند ہی مجموعے ہونگے جن میں اسے کسی خاص نقطۂ نظر کے در پیش چھوڑ دیا گیا ہو۔ "اُس نے کہا تھا" پچھلے جنگِ عظیم سے متعلق ایک واقعہ پر لکھی گئی ہے۔

پریم چند کے بعد کہانی اور ناول میں جینیندر کمار، آگئے (وانسائن) بھگوتی پرساد باجپئی اور بھگوتی چرن ورما آئے اور پریم چند کی روایت کو چھوڑ کر نئے نئے تجربے کئے اور فسانوی ادب کو فن کے نقطۂ نظر سے بہت آگے بڑھا لائے۔ پرکھ، تیاگ پتر اور سنیتا جینیندر کی مشہور ناولیں ہیں۔ تیاگ پتر کو چھوڑ کر اور کسی ناول میں اُنہوں نے سماجی قدروں پر تبصرہ نہیں کیا ہے اور کیا ہے تو شرت بابو کے طریقے سے۔ گاندھی ازم کی الجھنوں کا سب سے اچھا گورکھ دھندا جینیندر کی نئی کتابوں میں ملتا ہے۔ فرد اور اُسکی الجھنیں ہی ترقی کی کیلیں رہی ہیں۔ مثال کے طور پر اُن کے تازہ ترین ناول "کلیانی" کا نام لینا نامناسب نہ ہوگا۔ لیکن اپنی چیزوں کے ذریعے جینیندر نے ہندی کو ایک نئی طرز دی ہے، جس کی سب سے بہتر تقلید پہاڑی نے کی ہے اگیئے نے چند اچھی کہانیاں لکھیں ہیں اور اُنکا ناول "شیکھر" ہندی ناول کے فن میں ایک بالکل نیا تجربہ ہے۔ اس کے علاوہ اُس کی جو بھی اہمیت ہوگی وہ پورا چھپ جانے کے بعد معلوم ہوگی۔ اگیئے جی ایک بہت دانشمند اور قابل انسان ہیں اور سختی سے انفرادیت پر یقین رکھتے ہیں۔ اُنکی شخصی قابلیت، اُنکے ردِّ عمل اور اک کے بوجھ کی وجہ سے کرخت معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے مستقبل کے عجائب خانوں کے لئے بلند پایہ آرٹ کے دو چار نمونے ضرور چھوڑے جا سکتے ہیں۔ نرالا جی نے "اپسرا" "ایکا" وغیرہ رومانی ناولیں شروع میں لکھیں جو نہایت دلفریب ہیں۔ اُن کا ناول "چمیلی" ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔ لیکن اُن کے جتنے باب بھی شائع ہوئے ہیں،

اِس سے ظاہر ہے کہ اس میں ہندوستان کی دیہاتی زندگی اور ہندی "زبان" کی بہت اچھی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ نرالا نے کتنی ہی صف اول کی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ بھگوتی پرساد باجپئی آج تک خالص دوسرے درجے کے سب سے اچھے فسانہ نگار رہے ہیں حالانکہ وہ ایک قابل شخص ہیں۔ اُنکے تازہ ترین ناول "نمترن" سے یہ بخوبی عیاں ہے کہ ترقی پسند ادب کو اُن سے مایوس نہیں ہونا پڑیگا، وہ ترقی پسند طاقتوں کے ساتھ ہیں اور سنجیدہ ایماندار ہیں۔ بھگوتی چرن ورما نے کئی بہت اچھی کہانیاں ہندی کو دی ہیں۔ جن کی خصوصیت ان کا مزاح ہے طنز اور زبان کا سیدھا پن ہے۔ اناطول فرانس کی 'تائیس' سے متاثر ہوکر انہوں نے "چترلیکھا" لکھا ہے جس کا اب فلم بھی بن چکا ہے۔ یہ ناول ہندی کے گنے چُنے بہترین ناولوں میں سے ایک ہے۔ لیکن خالص ترقی پسند ادب کے لئے بھگوتی چرن ورما نے اپنی صلاحیت کو استعمال نہیں کیا ہے اور شاید نہ بھی کریں کیونکہ اُنہیں "ترقی پسندی" پر اعتقاد نہیں ہے۔ سیاست میں وہ درگاندھی پہ وہ ایک مفصل ناول لکھ رہے ہیں جس کے بارے میں ابھی یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

ہندی میں مختصر افسانے کی مقبولیت بڑھ جانے سے ناول کی اشاعت کم ہو گئی حالانکہ اُنکی مانگ اب پھر ایک دم بڑھ گئی ہے، اِدھر ناول بہت کم لکھے گئے ہیں۔ یشپال نے دو ایک ناول لکھے ہیں جو ہندوستانی سیاست کے Terrorist طبقے کا رومانی تعارف کراتے ہیں۔ ہندی کے ترقی پسند ادب کو پریم چند کے "گئودان" کے بعد نروتم پرساد ناگر کا ناول "دن کے تارے" ملا ہے۔ "دن کے تارے" جس علحدگی اور توازن کے ساتھ لکھا گیا ہے وہ اس کے موضوع کو دیکھتے ہوئے نہایت عجیب اور قابل تحسین ہے۔ اُسمیں بلند پایہ طنز اور مزاح ہے اور اُس کی سب سے بڑی خوبی ہے ناگر کی ایمانداری۔ وہ ناول نگار کی زندگی کی اپنی داستان ہے، جو گویا اپنی ہی نہیں، دنیا کو نہایت تنقیدی نظر سے دیکھ کر لکھی گئی ہو۔ ناول میں دو ایک فرائڈی قلابازیاں ضرور ایسی ہیں جنہیں بیکار کہا جا سکتا ہے۔ ورنہ

اس میں الفاظ یا خیالات کی فضول زیادتی کہیں نہیں ہے۔ گاندھی ازم کے رہبیہ وادی پہلو پر ناگر نے جو نشانے لگائے ہیں وہ چُوکنے والے نہیں اور یہ ناول کی سب سے بڑی خصوصیت ہیں۔ ناگر حقیقت میں زمانے کے حساب سے جنیندر اور جین کا ساتھی ہے لیکن وہ ادھر پندرہ سال سے ادب میں طرح طرح کے ناکام تجربے کرتا رہا ہے۔ جس کے نتیجے کے طور پر اُس کی تحریر میں پختگی آگئی ہے۔ اور اُس کا طرز ایسا ہے جس کی تقلید نہیں کی جا سکتی۔ ابھی تک نروتم ہندی میں ایک سنکی ادیب کے نام سے بدنام تھا۔ لیکن "دن کے تارے" نے اُسے حیات نو بخش دی۔ نروتم پر ساد ناگر کے Contact اور اثر میں ہی پہاڑی کے فن فسانہ کی تعمیر اور ارتقا ہوا ہے۔ اِس لئے پہاڑی کی کہانیاں سماج کے سنکی لوگوں کے (جنہیں ہم کسی بھی طرح نمائندہ نہیں کہہ سکتے اور جو صرف مستثنیات ہیں) خوبصورت لیکن غیر صحتمند عکس ہیں۔ لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑی نے پوری طرح سے سماجی نظریے کو اپنا لیا ہے اور اب وہ "ہر دَور میں طاقت کی پرستش" جیسی ترقی پسند چیز پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

نئے فسانہ نگاروں میں جو ترقی پسند ہیں ان میں یشپال، وشنو، شریمتی چندر کرن سون رکسا، راہل سانکرتا یائن، رادھا کرشن اور آنچل صفِ اوّل میں شامل ہیں۔ کمل جوشی، امرت رائے، گنگا پرساد شرما وغیرہ کئی فسانہ نگار بڑی تیزی سے ترقی پسندی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہندی میں عورت فسانہ نگاروں کی بھی کمی نہیں ہے اور انہیں شریمتی ہوم وتی دیوی، شریمتی ستیہ وتی ملک اور شریمتی سمترا کماری سنہا نے بہت اچھی کہانیاں لکھی ہیں۔ شریمتی کملا دیوی چودھری اور شریمتی سُمدرا کماری چوہان کی کہانیوں نے بھی کسی زمانے میں کافی شہرت پائی۔

شریمتی سون رکسا نے آرٹ اور موضوع کے اعتبار سے ہندی کو پوری طرح سے ترقی پسند اور صفِ اوّل کی کہانیاں دی ہیں۔ متوسط طبقے کی عورت کی زندگی اور

نچلے طبقے کی دن بدن گھٹنے والی جہنمی زندگی کا بہت گہرا مطالعہ جو تیکھا اور تیز ہے۔ اُن کی کہانیوں میں ان طبقوں کی اُلجھنیں گویا مجسم ہو کر بولتی ہیں۔ اُنکی کہانیوں کی طرز بالکل سیدھی اور ستھری ہوتی ہے اور اُس خاص مسئلے پر تیزی سے سوچتی ہوئی سماج پر گہرا طنز کرتی ہے۔ ادھر مہادیوی ورما نے بھی اپنی زندگی کے واقعات پر کچھ "خاکے" اتیت کے چلچتر" لکھے ہیں جسمیں اُنکے انسانی پہلو کا ہمیں ایک پُرخلوص نقشہ ملتا ہے اور پہلی بار معلوم ہوتا ہے کہ ہماری یہ عظیم المرتبت شاعرہ بھی انسان ہے اور ایمانداری سے تخلیق ادب کر سکتی ہے۔ اُنکی اس نثر کی کتاب کی اشاعت اُنکی شاعری کی سخت تنقید کا نتیجہ ہے۔

شری اوپندر ناتھ اشک ہندی کے اور اُردو کے بھی ایک بڑے ادیب ہیں جنہوں نے تنقید اور مضامین نگاری چھوڑ کر شعر، فسانہ، ڈرامہ اور ناول سبھی کچھ لکھا ہے۔ شاعری کے میدان میں وہ ہندی میں پنجابی تمدن کے نمائندے ہیں۔ اُنہوں نے پہلے درجے کی کچھ بہت اچھی کہانیاں لکھی ہیں، اسمیں کوئی شبہ نہیں حقیقت پر پاؤں جمائے ہوتے بھی وہ کہانی میں کچھ عجیب پن رکھنے کے قائل ہیں اور معمولی کو غیر معمولی بنا دینے میں بھی۔ باریکی اور بیان میں مینا کاری کرنا اُن کی خصوصیت ہے۔ اُنکی طرز تحریر کو فوٹوگرافی کہہ سکتے ہیں، نقاشی نہیں لیکن کہیں کہیں اُس فوٹوگرافی پر محنت کر کے اُسے اس حد تک لیجانے میں کامیاب ہوئے ہیں جہاں وہ آرٹ ہو جاتی ہے۔ اشک کی پونجی اُس کے محدود ذاتی تجربے ہیں۔ اور وہ بہت کچھ متوسط طبقے کے نمائندہ نقش ہیں۔ اُن کا نظریہ شخصی زیادہ ہے اور سماجی کم۔ بھگوتی چرن ورما کی طرح وہ بھی ترقی پسندی کو اپنانے سے متفق نہیں ہیں۔

ہمارے فسانوی ادب میں ایک زوال پسند روایت بھی ہے۔ "آکاش دیپ" میں پرساد نے اور "شانتی نکیتن" میں چنڈی پرساد پردیش نے جس زیادتی کے ساتھ نثر میں شاعری کا استعمال کیا تھا، اُتنی ہی کثرت کے ساتھ ویریندر کمار نے اپنے "آتم پرنیام" میں زبان اور جذبات کا بھی سخت ناجائز استعمال کیا ہے (اڈیپس کمپلیکس) کی مسخ صورت بھی اُنکی ناولوں میں دیکھنے کو

ملتی ہے۔ محبوبہ کو ماں بنا لیتے ہیں اور ماں کو محبوبہ! اور یہ اُن کا مستقل رنگ ہے۔ سرو رانند ورما کا تمام سلسلۂ تفکر عورت کے جنسی مسئلوں تک ہی محدود ہے۔ اور اُنکے چاروں ناول "پرشن" سنسمرن، نروودھ اور نکٹ کی دُوری۔ ایک اسی محور پر لٹو کی طرح گھومتی ہیں۔ اس کے علاوہ لاتعداد درجے کے ادیب یا تو پریم چند یا نہ حقیقت پرستی کے لکیر کے فقیر بنے ہوتے ہیں یا پھر موٹر کے حادثے کو لیکر رومان پیدا کرتے ہیں۔ اُن کے سب کردار کلاس میں فرسٹ آتے ہیں، اپنے ماں باپ کے اکلوتے بیٹے ہوتے ہیں اور یا مالدار یا بہت شریف غریب ہوتے ہیں اور اخیر میں ناکام محبت رہتے ہیں۔ اسی طرح اُنکی ساری عورتیں یونیورسٹی یا کالج میں پڑھتی ہیں، کلاس میں فرسٹ آتی ہیں، امیر گھر کی اکلوتی بیٹیاں ہوتی ہیں، کلاس کے علاوہ پڑوس کے کسی نوجوان سے محبت کرتی ہیں جو لازماً غیر ذات کا ہوتا ہے اور انجام ناکامیٔ محبت ہوتا ہے اور فریب، حمل، خودکشی یا کوئی ناممکن قربانی حقیقت میں سبھی ہمارے اونچے اور متوسط طبقے کے تخیلات ہیں۔ لیکن یہ تخیلات کئی سماجی بُری رسموں کے زیرِ تحت آجاتے ہیں۔ جن کا بہت کچھ سُدھار ہو چکا ہے اور برابر ہو رہا ہے۔ اور جو نہیں ہو سکتا اُس کے اسباب اور ہیں اور کسی کی انفرادی کوششوں سے پرے ہیں۔ اُنکی اصلاح اُسی وقت ہوگی جب تمام نظام میں سماجی انقلاب ہونگے۔ لیکن ان مسائل کو جو شخصی زیادہ اور سماجی کم اور جن کا حل سماج کے مکمل تغیر سے ہی ممکن ہے، سماجی زاویۂ نگاہ سے دیکھ کر صحت مند صورت میں لکھنا چاہیئے۔ دوسرے ان جنسیات کے مسئلوں کے علاوہ اور مسائل بھی متوسط طبقے کے ہی ہیں، جن پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔ حقیقت میں ننانوے فیصدی ناکام روحانی محبتوں کے اسباب اقتصادی ہوتے ہیں۔ متوسط طبقے کے ادیبوں کی توجہ جب نچلے طبقے کی طرف منعطف ہوتی ہے تو وہ مزدور یا بھکاری کو دیکھ کر رحم سے پگھل جاتے ہیں۔ ہندی نثر اور نظم دونوں میں ہی اس قسم کا ادبِ ترحم (Pity Literature) بہت ہے۔ جو بنجر جذباتیت سے بھرا ہوا ہے۔ اور انقلاب کے لئے اُس کا فائدہ صفر کے برابر ہے ہندی میں (اور شاید ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی) اس قسم کے گھٹیا ادب کی پیداوار

بڑی کثیر مقدار میں ہو رہی ہے اور شرلاک ہومز اور رابرٹ بلیک کے نقلی، بھدّے جاسوسی بھونڈے ہندوستانی نام اور پوشاک پہنا کر ہندی میں جاری کر دئے ہیں۔ جن سے عوام کی تفریح تو ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی اُنکی حس جُرم بھی شدید ہوتی ہے۔

ہندی کے تنقیدی ادب کی تاریخ بہت نئی ہے۔ جن نقادوں کی تاریخی ارتقا میں اہمیت ہے وہ ہیں مشر بندھو، شیام سندر داس اور رام چندر شکل۔ مشر برادران نے قدیم شاعروں کی سوانح حیات اور ادب سے متعلق مواد اکٹھا کیا۔ شیام سندر داس نے یورپی تنقیدی کتابوں کا ترجمہ کیا، کرایا اور اُن اصولوں کی کسوٹی پر ہندی ادب کو ـــــ رواج دیا ـــــ رام چندر شکل نے پہلی بار ہندی ادب کی ایک مفصل تاریخ لکھی جسمیں ادیبوں کی داستانِ زندگی ہی نہیں ہے، بلکہ اُسمیں اُنکی تخلیقات کی قدروں کو سائنٹفک ڈھنگ سے جانچا گیا ہے۔ اور پہلی بار ادبی تحریکوں کے مختلف سکول قائم کئے گئے ہیں۔ اور اسلئے اُنکی تنقیدوں میں بارہا ذاتی پسند و ناپسند اُبھر آتی ہے۔ چھایاوادی شاعری کے وہ زبردست مخالف رہے کیونکہ وہ اُسے پوری طرح سمجھ نہیں سکے۔ شکل جی کے مدرسۂ تنقید کے سب سے بڑے نقاد نگیندر مانے جاتے ہیں۔ اور یہ سکول ابھی نہیں ختم ہے۔ چھایاوادی شکل جی کے تیز و تند حملوں سے بچنے کیلئے کئی نقاد اُٹھ کھڑے ہوئے جن میں نند دُلارے واجپئی سب سے پہلے تھے اور سب سے بڑے۔ شیام سندر داس کے سکول کے سب سے اہم نقاد چھایاوادی شاعر رام کمار ورما ہیں جنہوں نے چھایاوادی شاعری کی تنقید کے لئے اُنہیں اصولوں کو اپنایا ہے جن سے گزشتہ جنگ سے پہلے انگریزی کی رومانی شاعری پرکھی جاتی ہے۔ اسی سکول کے دوسرے نقاد شانتی پریہ دویدی ہیں جو انگریزی ادب سے براہِ راست واقف نہ ہونے کی وجہ سے چھایاوادی وکالت صرف اپنی جذباتیت سے ہی کر سکے ہیں۔ رام کمار ورما کی طرح ہڈسن یا جان ڈرنکواٹر کے اصولوں سے نہیں۔ اس زوال پسند سکول کی نمائندگی اسوقت گنگا پرساد پانڈے کر رہے ہیں۔ جو مہادیوی ورما کے سب سے بڑے روحانی اور رہسیہ وادی مداح اور نقاد ہیں۔

جدید نقادوں میں ہزاری پرساد دویدی، نرالا، آگیئے، رام ولاس شرما، شو دان سنگھ

چوہان، جگن ناتھ پرساد مصر وغیرہ صفِ اول میں آتے ہیں۔ پنت جی کے "پلّو" پر نرالا کی تنقید نے ہندی دنیا میں ہلچل پیدا کر دی تھی اور اُس کے بعد اُنہوں نے اپنی شاعری کے متعلق نقادوں کو جواب دینے کے لئے کتنے ہی تنقیدی مضامین لکھے۔ نرالا کی تنقید بجد تیز اور گہری ہوتی ہے اور احساس حسن بہت ہی خوب ہے۔ اگیئے جی کی تنقید دانشمندی سے پُر ہوتی ہے۔ مغربی ادب کا اُن کا وسیع مطالعہ ہے گو مجھے اسمیں شک ہے کہ اُنکی تنقید کا کوئی اپنا اور ایسا اصول ہے جسے وہ برابر مانتے ہوں۔ ڈی۔ ایچ لارنس سے لیکر ایلیٹ کے دائرے میں اور اُس کے باہر بھی وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہیں۔ اپنے اظہار کو قابلِ فہم بنانے کی نسبت غیر معمولی اور غیر واضح بناتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی اُن کا تجزیہ بہت صحیح اور سائنٹفک ہوتا ہے۔ ترقی پسند ادب سے متعلق تنقید کا آغاز ہندی میں شوودان سنگھ چوہان کئی سال پہلے وشال بھارت میں کر چکے تھے اور ادھر جب سے "ہنس" کی ادارت سنبھالی ہے اُنہوں نے ترقی پسند نقاد قوتوں کو متحد بھی کیا ہے۔ چوہان نے غیر ملکی ترقی پسند ادب کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے اور اپنے ادب کا بھی۔ اب تک اُنہوں نے کئی اچھی تنقیدیں لکھی ہیں۔ جن کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کے طرز بیان کا ستھرا پن، واضعیت اور عام فہمی ہے۔ اگیئے سے بالکل مختلف! لیکن ہندی ادب پر اُنکی کوئی وسیع، گہری اور پختہ تنقید ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے۔ رام ولاس شرما کا مغربی اور ہندوستانی ادبیات کا مطالعہ وسیع ہے۔ اُنکی تنقیدوں کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ اپنے ادب کو اپنے ملک کی تاریخ کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھتے ہیں۔ اور بلند اور واقعی ترقی پسند مغربی ادبیات کی مفید باتوں کو اپناتے ہیں۔ شدید طور پر طنز بہ مزاح اُن کے مضامین میں پھول میں خوشبو کی طرح سمایا رہتا ہے۔ جو کبھی کبھی کانٹے کی طرح کھٹکنے بھی لگتا ہے۔ جگن ناتھ پرساد نے مارکسی طریقۂ تنقید پر اور ترقی پسند مغربی ادب پر ہندی میں کئی بہت مفید مضامین لکھے ہیں جو ترقی پسند ہندی ادب کے ارتقاء میں بہت مددگار ثابت ہونگے۔ صفِ دوئم کے ترقی پسند نقادوں میں انچل، نریندر شرما، پرکاش چندر گپت، امرت رائے وغیرہ ہیں۔ مجموعی طور پر

دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے دس سال میں جو ترقی ہندی کے تنقیدی ادب میں ہوئی ہے ویسی بنگالی کو چھوڑ کر ہندوستان کی اور کسی زبان میں نہیں ہوئی جس کا سہرا "ساہتیہ سندیش" اور اس کے فاضل مدیر گلاب رائے کے سر ہے یعنی ایک بڑی حد تک۔ کیونکہ پچھلے آٹھ دس سال سے اس پرچے میں صرف تنقیدی مضامین شائع ہوئے ہیں اور ہر قسم کے نظریوں کو اسمیں جگہ ملتی رہی ہے۔ اور اس سے ہندی تنقیدی ادب کی امید سے زیادہ ترقی اور توسیع ہوئی ہے۔ ترقی پسند ادب کے ارتقا میں جامع اور صحیح تنقید کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لئے نامناسب اور غلط تنقید سے سخت نقصان کا بھی امکان ہے۔ اس قسم کی ذہنیت بے دردی سے کچل دینی چاہیے کیونکہ تنقید ادب کے تحفظ کے لئے بیدار اور ہوشیار سنتری ہے اور اس کے ارتقا کے لئے خضر راہ اور ایک عظیم الشان مینارہ نور۔

ہندی ادب کا سب سے کمزور پہلو سوانح حیات اور مضمون (Essay) ہے۔ نرالا جی نے "بلے سر بکریا" اور "کلی بھات" دو سوانح عمریاں لکھیں ہیں جو انکی ٹھوس ترقی پسند چیزیں ہیں۔

ہندی کے ڈرامے کی تاریخ نہایت مفلس ہے۔ بھارتیندو کے ڈرامے عوامی ادب کے نقطۂ نظر سے اہم تھے، لیکن ہمارے (عظیم المرتبت) ڈرامہ نگار جے شنکر پرساد کے ڈرامے اتنے بھی نہیں رہے، ہندوستان میں زمانۂ بدھ کی عظمت کو انہوں نے اپنے ڈراموں میں پھر سے زندہ کرنے کی سخت تکلیف اٹھائی ہے۔ اور عیسے سے پہلے کے اُس تمدن کے حسین خاکے کھینچے ہیں، جس کے کھنڈر بھی آج مشکل سے عجائب گھروں کے لئے باقی ہیں، جیسے مردہ ممی۔ لیکن جب ہندوستان کا زندہ "بدھ" ملک کی زنجیریں کاٹنے کے جرم میں خود زنجیروں میں جکڑ دیا گیا تھا، تب ہمارے یہ عظیم المرتبت ڈرامہ نگار سنہ عیسوی سے پہلے کے چندر گپت پر تصور آرائی کر رہے تھے! اور کس لئے؟ ان کے ڈرامے کھیلے تو نہیں جا سکتے، آرام کرسی پر بیٹھ کر ان سے "لوکوتر آنند" اور "برہمانند سہود" ضرور حاصل کیا جا سکتا ہے۔

گاندھی یُگ کی زبردست کشمکش سے فرار اختیار کر کے پرساد نے نو ڈرامے لکھے۔ میرا مستحکم اعتقاد ہے کہ ادب کے تاریخی ارتقا میں اُنکی کوئی اہمیت نہیں ہے! پرساد جی کے ڈرامے ایک زبردست صلاحیت کا زبردست لیکن بیکار اور غلط استعمال ہیں۔ لکشمی نارائن مشر، ہری کرشن پریمی اور اوپندر ناتھ اشک نے کچھ ڈرامے لکھے ہیں لیکن ایک نے بھی، ایک بھی، صف اوّل کا ڈرامہ نہیں لکھا ہے۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں مغربی "ایک ایکٹ" کی آمد پر ہندی میں ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھے جانے لگے۔ سیٹھ گوبند داس نے درجنوں ناٹک لکھے لیکن وہ سختی سے گاندھی وادی ہیں۔ اسلئے کھیلے نہیں جا سکتے۔ اُنکی تکنیک میں کئی مختلف غلطیاں ہیں۔ اسکے علاوہ مختلف لوگوں نے کئی بہت خوبصورت ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھے ہیں۔ ترقی پسند ادب کا عوام میں پرچار کرنے کیلئے بعض قسم کے ڈراموں کی ضرورت ہے، وہ ابھی تک دوسری زبانوں سے ترجمہ کر کے ہی ہندی میں لائے جاتے رہے ہیں۔

ترقی پسند ادب کیا ہے اور کیوں ہوا اسکے بارے میں بھی بہت سے ادیبوں اور پڑھنے والوں کو اندیشے ہیں۔ یہاں میں مختصر طور پر کہوں گا کہ ترقی پسند ادب اکائی کی زندگی کو نہیں جماعت کی زندگی کو لیکر چلتا ہے۔ انہیں اکائی کے نہیں، جماعتی نظریے سے سلجھاتا بھی ہے۔ سبب یہ کہ فرد کی بہبودی سماج کی بہبودی میں شامل ہے۔ کیونکہ فرد سماج کا ایک جزو ہے۔ لیکن صرف فرد کی بہبودی میں سماج کا نقصان ہو سکتا ہے۔ کیونکہ سماج میں ہر شخص شامل ہے جبکہ ایک فرد سے سماج کے ہر فرد کا ادراک نہیں ہوتا۔ ترقی پسند ادب سماج سے کرداروں کو لیکر سماجی ڈھنگ سے اُن کے مسائل کا تجزیہ کرتا اور حل کرتا ہے۔ جہاں فرد اور سماج میں اختلاف ہے وہاں ترقی پسند ادب سماج کی بہبودی کو ترجیح دیگا۔ سماج کے زیرِ تحت فرد کا ہر ایک سیاسی، اقتصادی اور سماجی مسئلہ آجاتا ہے۔ ادب کا ایک دوسرا پہلو فرد کی ذاتی زندگی بھی ہے! اس سے بھی اچھا ادب پیدا ہو سکتا ہے، ہونا چاہیئے۔ ترقی پسند ادب کی اُس سے کوئی مخالفت نہیں ہے۔ وہ اُس کا مخالف نہیں ہے۔ اگر ہے تو صرف وہیں پر جہاں فرد سماج کی تنظیم کو برہم کرنے لگتا ہے۔

ادب زندگی کی پُر فن تنقید ہے۔ نہ صرف فن ہے، نہ صرف سائنٹیفک تجزیہ ہی ہے۔ بلکہ

جاندار اور ترقی پسند ادب ان دونوں کا ملاپ ہے۔ بنیادی طور پر ادب کسی بھی مخصوص طبقے کے لئے نہیں ہے۔ وہ عوام کے لئے ہے کیونکہ تمام زندگی اور انسانیت کی نمائندگی کرنا اُس کا فعل ہے، فرض ہے اور دعویٰ بھی ہے۔ آج وہ عوام ہمارا مظلوم اور غریب طبقہ ہے جو موجودہ انسانی سماج کی سب سے خوفناک کمزوری ہے۔ اِس کمزوری کے دُور ہٹے بغیر انسانیت کا امن و چین، تہذیب و تمدن، ہر شے ناممکن ہے۔ اِس زبردست سماجی حقیقت کو محض شخصی جذباتیت کے تِل کی اوٹ میں نہیں کہا جا سکتا۔ عوام کے اس انقلابِ عظیم کے وقت اپنے ذاتی دُکھ سکھ کے گیت گانا گناہ کبیرہ ہے۔ روحانیت، اور ابدی آرٹ، قسم کے الفاظ ترقی پسندی کی لغت میں نہیں ہیں۔ ترقی خود ایک ابدی سچائی ہے۔ مُلکی حالات سے غیر متاثر آرٹ کے تخیل کو ترقی پسندی جھوٹا سمجھتی ہے۔

آج ہندی کے زیادہ تر ادیب متوسط طبقے کے ہی ہیں، اُسی میں وہ پیدا ہوئے، پرورش پائی، اور رہ رہے ہیں۔ اُسکی زندگی اور مسائل کا تعارف اُنہیں حاصل ہے۔ لیکن وہ پوری طرح یہ نہیں جانتے کہ اُن مسائل کا حل ایک سماجی تنظیم میں ہی ممکن ہے۔ جسکی تعمیر کیلئے سماج ایک عظیم طاقت ہے۔ ہمارے ادیبوں کا تعلق اُن نچلے اور مظلوم کسان مزدور طبقے سے نہیں ہے جو کسی بھی سماجی انقلاب میں ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں۔ جبتک اس طبقے سے قریبی اور پُرخلوص رشتہ قائم نہیں ہوتا، ہمارے ترقی پسند ادب میں حقیقت پرستی، زندگی اور قوت نہیں آ سکتی۔ ترقی پسند ادب اپنے ادیب کو بھی اپنا ہم شکل دیکھنا چاہتا ہے۔ اور ہمارے ادیب کی زندگی اور ادب میں خوفناک تضاد ہے۔ ہندی میں ترقی پسند ادب کی تجارتی باگ ڈور بھی اُن طاقتوں کے ہاتھ میں ہے جو حقیقت میں سرمایہ دارانہ ہیں، جنہوں نے ترقی پسند تحریک کو اور اچھے ادیبوں کو عضوِ معطل بنا دینے کا تہیہ کر رکھا ہے اور کسی طرح بھی وہ اپنے بورژوا طرزِ عمل کو بدلنے پر تیار نہیں ہے۔ اور یہ بات واقعی ہمارے ترقی پسند ادب پر ایک دھبّہ ہے پھر بھی ترقی پسند ادیبوں اور طاقتوں کی ضد اور مخالفتوں کی وجہ سے "ترقی پسندی" کو ہی

غلط مان بیٹھنا اور کوسنے لگنا عقل اور دانشمندی کا سب سے بڑا دیوالیہ پن ہے فلسفۂ ترقی کی بنیاد ہی زندگی کی ضدی طاقتوں کی کشمکش ہے۔

آج ہندی کے ترقی پسند ادیب یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی ادب میں ترقی پسندی کے معنی ہیں، عوام کو اس انقلاب عظیم کے لئے تیار کرنا ہمارے ہاتھوں میں صدیوں سے پڑی ہوئی زنجیروں کو دُور کر دے۔ جو ہمارے ملک کی آزادی اور تمدن کے دشمن فاشی لیٹروں سے اپنی حفاظت کرنے کیلیے عوام کو منظم کر دے اور اپنی ننگی غلامی کے کوڑھ میں جاپان کے ہاتھوں کھجلی پیدا نہ ہونے دے! ایسا ادب چاہے کتنا ہی بھدّا ہو، کتنا ہی فن سے عاری ہو ترقی پسند ہوگا۔ اُسکی ابدی قدروں کی ہمیں فکر نہیں ہے۔ اگر ہم ادب کے ذریعے حفاظتِ وطن کے جذبہ کو بیدار کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور پھر اُس بیداری کو عمل میں بھی لاسکتے ہیں۔ تو کوئی سبب نہیں کہ انسانیت کی آزادی کی زبردست تاریخ ہمارے ادب کا احترام نہیں کریگی۔ اور اسے جاوید اور ابدی نہیں مانے گی۔ لیکن ہندی کے ترقی پسند ادیب کو فکر کل کی نہیں آج کی ہے۔ جو بھی ادیب اس قسم کی ترقی پسندی کی زندگی یا ادب میں مخالفت کرتا ہے، وہ ادیب تو ہے ہی نہیں، غدار وطن ضرور ہے اور مستقبل میں فن اور ادب قومی غداروں کا کیسا استقبال کریں گے یہ کہنے کے لئے میں یہاں انسانیت کی تاریخ کے ورق اُلٹنا ضروری نہیں سمجھتا۔

مختار صدّیقی

فاشزم

گورے جسموں کو جواں رکھتے ہیں بندر کے غدود
ہم کو ترکے میں ملی ہائے جوانی کی پکار
گرم ملکوں کی کلی آج کھلی، کل کو مٹی،
بہتی دھارا پہ حبابوں کی بقا کیا معنی
برف زاروں کی مگہ نرگسِ سرمایہ نژاد
صدیاں کھا چکنے پہ افسانوں کی عذرا ہی رہی
آہ! وہ عذرا وہ نوخیز دلوں کی مسجود

اُف وہ کردارِ پُراسرار کہ جس کو برسوں
ہالے پہناتے تھے بچپن کے انوکھے سپنے
بربریت میں رہی جس کی جوانی معبود
اس کے اس دور میں معبد تھے تصوّر اپنے
پھر ہُوا گیان کہ ہر شے تھی طلسماتِ خیال

من گھڑت بات تھی انداز بیاں سے چمکی
آتشیں غسل سے پائندہ جوانی ہو جائے
یہ کہانی بھی حقیقت کی زباں سے چمکی

اب تو آنکھوں میں تھا عذرائے حقیقی کا جمال
چھب نویلی تھی مگر، چنچ وہی، شام وہی
ایک اک جلوہ تھا خورشید قیامت لیکن
تین سو سال سے تھا رُوسے دلآرام وہی

جانے پھر کیسی ہوئی حاجتِ نیرنگِ شہود
دیکھتے دیکھتے بدلا یہ شبستانِ وجود

یعنی سرمائے کی عذرا نے لیا ادر جنم
آتشیں غسل کا جوہر بنے بندر کے عذود
رُوپ البیلا تھا، مہتاب وہی، بام وہی
پہلی کایا کی مگر چھاؤں خبیث و مردود

اس نئے روپ میں یہ فانی و باقی کی قیود
ایک ہی جنبشِ ابرو سے تھیں پارہ پارہ
بے اماں گردشِ ایام کی گنگا جمنی
بن گئی لاکھوں برس پہلے کا ٹوٹا تارا

پیرِ ادفات نے تھک ہار کے ڈالی ہے کمر — اتنا جھکنے سے کہولت کی کماں ٹوٹ گئی
اب تو پاتال میں تیروں سے تہی ہے ترکش — اسلحہ خانوں کو فاتح کی نظر لوٹ گئی
شکر ہے طے تو ہوئیں "عالمِ ظاہر" کی حدود۔ گورے جسموں.....

مخمور جالندھری

تلاش

ریت پہ ڈھونڈنے آیا ہوں وہ قدموں کے نشاں
میرے اور تیرے حسیں سایوں نے چھ سال ہوئے
ساحلِ بحر کے سینے پہ بنایا تھا جنہیں
ڈھونڈنے آیا ہوں اُن گیتوں کی میٹھی تانیں
ہم نے مل جل کے بڑے شوق سے گایا تھا جنہیں

دیکھ پانی کے تموج کی طرف غور سے دیکھ
اُٹھ رہا ہے یونہی طوفان میرے سینے میں
دیکھ چھوٹے بڑے پھیلے ہوئے قدموں کے نقوش
ساحلِ بحر کے سینے پہ ہیں یوں بکھرے ہوئے
جیسے دل پر غم و آلام کے چرکوں کے نشاں

"دیکھ بھری ہوئی امواج کا رقصِ بسمل
اپنے قدموں کی طرح اُن کے نقوشِ کفِ پا
وقت کے ہاتھوں سے بے وقت مٹے جاتے ہیں
کل کوئی آنکھ جنہیں دیکھ نہ پائے گی کہیں
سُن ہمارا ابھی کوئی گیت ہے ان کے لب پر
کسی مجروح مغنی کی طرح موجوں کو
نغمہ و شعر طرازی کی نہیں ہے فرصت
یاد رکھتا ہے بھلا کون پُرانے قصّے
اپنی بات اور ہے ہم نے تو محبت کی ہے
اور ہم بھول کہاں سکتے ہیں اس ساحل کو

انہیں قدموں کے نشانوں سے ذرا بچ کے چلیں
چاہتا ہوں کہ مری طرح اگر کوئی غریب
یہ حسیں نقش، یہ بنتی ہوئی اُلفت کے نشاں
ڈھونڈنے آئے تو ناکام نہ واپس جائے
ہم بھلا کیسے مٹا سکتے ہیں یہ نقشِ جمیل؟
ہم ستم دوست نہیں، ہم نے محبت کی ہے۔
چلو ـــــ قدموں کے نشانوں سے ذرا بچ کے چلیں۔

ساحر لدھیانوی

تقدیسِ مشرق

یہ کوچے یہ نیلام گھر دلکشی کے
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں کہاں ہیں محافظ خودی کے
ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ پُر پیچ گلیاں، یہ بیخواب بازار
یہ گمنام راہی یہ سکّوں کی جھنکار
یہ عصمت کے سودے یہ سودوں پہ تکرار
ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں!

تعفّن سے پُر، نیم روشن یہ گلیاں
یہ مسلی ہوئی ادھ کھلی زرد کلیاں
یہ بکتی ہوئی کھوکھلی رنگ رلیاں
ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

وہ اُجلے دریچوں میں پائل کی چھن چھن
تنفّس کی اُلجھن پہ طبلے کی دھن دھن
یہ بے روح کمروں میں کھانسی کی ٹھن ٹھن
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ گونجے ہوئے قہقہے راستوں پہ
یہ چاروں طرف بھیڑ سی کھڑکیوں پہ
یہ آوازے کھنچتے ہوئے آنچلوں پہ
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ پھولوں کے گجرے، یہ پیکوں کے چھینٹے
یہ بیباک نظریں، یہ گستاخ فقرے
یہ ڈھلکے بدن اور یہ مدقوق چہرے
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہاں پیر بھی آچکے ہیں جواں بھی
تنومند بیٹے بھی، ابّا میاں بھی
یہ بیوی بھی ہے اور بہن بھی ہے ماں بھی
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

مدد چاہتی ہے یہ حوّا کی بیٹی،
یشودھا کی ہمجنس، رادھا کی بیٹی
پیمبر کی اُمت، زلیخا کی بیٹی
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

بلاؤ خدایانِ دیں کو بلاؤ!
یہ کوچے یہ گلیاں یہ منظر دکھاؤ!
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کو لاؤ!

ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

عبد المجید بھٹّی

آنے والی کل پہ بھروسہ؟

بھوکی آنکھیں کل کو دیکھیں جھوٹی آس لگائے
آنے والی کل کب آکے آج کی بھوک مٹائے
آنے والی کل پہ بھروسہ؟ ——
کب آئے؟ —— کیا لائے؟
بیتی کل کے دیپ کی لَو کب آج کی جوت جگائے
مایا چھل کے۔ چھایا ڈھل کے لوٹ کے پھر نہیں آئے
آج کی بھوک ہے آج کا رونا
آج کا راگ —— سُہاگ!
جھوٹ کپٹ سے
لاگ لپٹ سے
آج کے دیپ جلاؤ
آج کے منگل گاؤ
بیتی کل کے دیپ کی لَو کب آج کی جوت جگائے
آنے والی کل پہ بھروسہ؟
کب آئے؟ —— کیا لائے؟ ——

رام پرکاش اشک

خوں بھرے پرچم کے نیچے

راج محل میں آگ لگی رے!!
آگ لگی رے آگ!
مزدوروں کے خوں سے بنی تھی راج محل کی شان
نردوشوں کے کندھوں پہ تھا اِن سب کا ابھیمان
جنتا ــــ جاگ اٹھی رے جاگ
آگ لگی رے آگ!!

دھنیوں نے انیائے کیا تھا
پرجا کا دھن لُوٹ لیا تھا۔
دکھیاروں کا خون پیا تھا
ایکا کر کے ٹوٹ پڑے ہیں زہری کالے ناگ
آگ لگی رے آگ

آج مچے گا اندھیارے میں ہُلّڑ اور نِراج
کل کا سُورج دیکھے گا دھرتی پہ پرجا راج
جاگے دیش کے بھاگ ــــ آگ لگی رے آگ

سلام مچھلی شہری

ایک پینٹنگ

جنگلی لباس میں اک پیکرِ گداز
چل رہا ہے جھاڑیوں میں سانپ جھوم جھوم کر
اُڑ رہا ہے مور اپنے بال چوم چوم کر
جھیل مانگنے لگی شام کی ہوا سے ساز
ایک بار، تین بار

دستِ صندلی اُٹھے
پاؤں لہر کھا گئے

جسمِ نازکے شرار
جھیل کے کنارے مست ہو کے ناچنے لگے
جنگلی جوان شام کو سکون پا گئے
جھونپڑوں سے اپنے اپنے ساز لیکے آگئے

آسماں سے چاند اور ستارے جھانکنے لگے
چاندنی میں جاگ اُٹھی

سو رہی تھی صبح سے
بول کیسے خواب تھے؟

میرے "بُدھ" کی مُورتی!
جھاڑیوں سے سُرخ زرد پھُول توڑ توڑ کر

ایک بار، تین بار، اور اب تو بار بار
مُورتی پہ جنگلی حسینہ کرتی ہے نثار
چشم و لب کے رقص پر ہاتھ موڑ موڑ کر
رقص کی شراب میں

مور مست ہو گیا
سانپ جیسے سو گیا

عکسِ ماہتاب میں
اک پیکرِ گداز اور ناچنے لگا
ڈھولکوں کی مست چیخ اور تیز ہو گئی
جنگلی حسینہ اور شعلہ ریز ہو گئی
مُورتی کا دیوتا خود ہی مسکرا اٹھا
اور جیسے چونک کر

رقص بند ہو گیا
کس قدر غرور تھا

کامیاب رقص پہ ——!!

سیّد ضیا جالندھری

بجھی ہوئی آگ

حادثہ گاہِ جہاں میں تو سبھی ممکن ہے
دیکھ کر تم کو یہاں آج تعجب نہ ہوا
پھر بھی یہ سوچ رہا ہوں کہ سرِ راہ کی آگ
راکھ بن کر بھی نہ کیوں بھولی نشیمن اپنا

راہرو ملتے ہیں پل بھر میں بچھڑ جانے کو
پھر بھی جاتے ہوئے کچھ اشک ڈھلک جاتے ہیں
وقت کر دیتا ہے یادوں کو فضا میں تحلیل
قہقہے، اشک، دھندلکے میں سرک جاتے ہیں

زیست کی راہ پہ تم سے بھی ملاقات ہوئی
چشمہ دیکھا تو تھکا ماندہ مسافر ٹھہرا
مجھے بالوں کی گھنی چھاؤں میں نیند آتی رہی
جس سے اب تک ہے تصوّر کا دھندلکا گہرا

اور پھر آنکھ کھُلی کوئی نہ تھا، تم بھی نہیں
اشک بےساختہ آنکھوں سے بہے جاتے تھے
اور ارمان تہِ دام پرندوں کی طرح
اپنی مجبوری کو چپ چاپ سہے جاتے تھے

ذہن مرجھائے ہوئے پھولوں کا گلدستہ ہے
اب تو یہ تاب نہیں زیست کی تجدید کروں
ولولے ڈوب گئے وقت کے طوفانوں میں
اب تو سینے میں ہے ٹھہری ہوئی موجوں کا سکوں

تمہیں لے آیا ہے گم گشتہ بہاروں کا خیال
بھیگتی آنکھوں سے چھپتے نہیں دل کے گھاؤ
اب تو ہیں صرف بہاروں کے خزاں دیدہ نقوش
رہ سکو ان کے سہارے تو یہاں رہ جاؤ

اختر الایمان

خاک و خون

"کیا ہوئی آپ کی وہ گرمئ گفتار و نگاہ
قہقہے سو گئے ہیں ڈوبے ہوئے آنکھیں مغموم
اب نہ پہلی سی وہ باتیں ہیں نہ افسانہ کوئی
جیسے صحرا سے چلا آتا ہو دیوانہ کوئی"۔

"پر ابھی تیرگئ شب میں ستارے بھی تو ہیں!
اُس مسرت کے سہارے پہ جو آئے گی کبھی
ہیں تو ہلکی سی کرن لے کے بھی جی لیتی ہوں
کتنے ہی تلخ ہوں آنسو انہیں پی لیتی ہوں"

"جگنوؤں ہی سے اندھیرے میں بہل جاتی ہو؟
ساتھ دے سکتے ہیں کب تک یہ سہارے یہ خیال
موت پھیلائے ہوئے راہ میں ہے دام ابھی
آدمی پوج رہا ہے وہی اصنام ابھی"

"موت بڑھتی ہوئی طاقت سے نہیں لڑ سکتی
کتنی یورش کریں دیوار نہیں بن سکتے
تیز دریا کی روانی میں خس و خاک کبھی
آپ ہوں میں نہیں انسان سے مایوس ابھی"

"مجھ کو دنیا کے خم و پیچ کا اندازہ ہے
جس کی دیوار ہی کج ہو وہ محل کچھ بھی نہیں
جس کی بنیاد میں خوں ہے وہی تعمیر ہے یہ
آدمی ہی کی تراشی ہوئی تقصیر ہے یہ"

"آپ کیا جانئے اِس وہم سے کب نکلیں گے
جذب کر لیتی ہیں آنکھیں انہیں افسانوں کو

"اِک بدلتے ہوئے رنگوں کا تلاطم ہے یہ سب
جو نہی آنکھیں اُدھر اُٹھتی ہیں کہ بھر آتی ہیں

"روز یہ زرد سے دانے جو شگوفوں کو لئے
شبنمی، سبز لبادوں سے مہک دیتے ہوئے

"سب خزاؤں کی امانت ہیں یہ تو رائیدہ کھیل
صبح ہنستی ہوئی آتی ہے بہاروں کو لئے

"آپ ہوں میں نہیں انسان ہے مایوس ابھی
شبنمی، سبز لبادوں سے مہک آتی ہے

منتظرِ راہ گذر، حسنِ شفق، نقشِ بہار!
دلِ بیتاب یہ کہتا ہے انہیں بڑھ کے پکار!"

جن کی قیمت اسی انسان نے اتنی دی ہے،
ایک فریاد ہے جو روح نے اکثر کی ہے!"

پردۂ خاک سے آجاتے ہیں بالائے زمیں
ان کی قوت کا بھی کیا آپکو اقرار نہیں؟"

یہ شگوفے، یہ گل و لالہ و نسرین و چمن،
شام روتی ہوئی جاتی ہے لئے گردِ محن!"

ابھی پھوٹے ہیں شگوفے، ابھی کمسن ہے بہار!
خاک و خوں توڑ ہی دیں گے کبھی دیرینہ خمار!"

اختر حسین رائے پوری

بیزاری

میں جس پُل پر کھڑا ہوا تھا اسکی محرابوں میں دراڑیں پڑی ہوئی تھیں اور اسکے نیچے جو دریا بہتا تھا اس کا پانی مٹ میلا اور کثیف تھا۔ میں یہاں صرف اِس لئے کھڑا ہوا کرتا تھا کہ اپنے آپ سے بھاگ کر انسانوں کی بھیڑ میں گم ہو جاؤں — اس طرح کہ مجھے یاد بھی نہ رہے کہ میرا نام کیا ہے۔ تصوف کی کوئی خاص کیفیت طاری کر کے میری وحدت اگر اس کثرت میں گم ہو جائے تو میں ایک بہت بڑے عذاب سے نجات پا جاؤں، ایک ایسا عذاب جو گھُن کی طرح میری روح کو چاٹ رہا ہے اور اس کے ہونٹوں کا لمس میرے دل کی دھڑکن کو بند کر کے آسمانی کتوں کی طرح چٹخارہ بھر رہا ہے،

میں اپنی دونوں ٹانگوں کے بل کھڑا ہوا ہوں۔ انہیں ٹانگوں نے کتنے شہروں کو کھنگالا ہے، کتنے مرحلوں کو طے کیا ہے۔ اور اب دیکھو کہ یہ ایک گز زمین کا احاطہ کئے، مثلث کا نقشہ بنائے کھڑی ہوئی ہیں۔ میں ان انسانوں کا تماشہ کسی اور کی نہیں بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ (لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ میں خود اپنی آنکھوں کو نہیں دیکھ سکتا) میری بینائی میں شاید کوئی فرق آ گیا ہے۔ کیونکہ راہ چلتوں میں ایک سے دوسرے کا امتیاز کرنا میرے لئے مشکل ہے۔ وہ سب ایک

طرح کھلکھلاتے، ہنہناتے یا بھونکتے ہیں۔ اور انکی دونوں آنکھیں درندوں کی طرح چمکتی ہیں —— ایک سے سُرخ سی شعاع نکلتی ہے —— یہ شہوانی بھُوک کی علامت ہے۔ دوسری میں پیلی سی کرن جگمگاتی ہے۔ یہ سونے روپے کی رنگت ہے۔ یہ سب لنگڑے ہیں اور چاندی کے دو سکّوں کو پہیئے بنائے زندگی کے راستہ پر لڑھکتے چلے جا رہے ہیں۔ میں سہم کر اپنی ٹانگوں میں چٹکیاں لیتا ہوں۔ ہائے وہ صحیح وسلامت ہنوز میرے جسم میں پیوست ہیں۔

زکام کے باوجود میری ناک ماحول میں انواع و اقسام کی بدبو سونگھتی ہے۔ سڑتی ہوئی لاشوں کی بدبو جو نیز اب میں حلول کی جا رہی ہیں —— دراصل یہ روپیوں کی بُو ہے۔ جلتے گوشت کی بو جو عورتوں کے جسم سے آتی ہے۔ اور افیون کی سی خوشبو جو مندروں اور مسجدوں کے میناروں سے نکل کر عرش و فرش کو اپنے نشہ آور کفن میں لپیٹ لیتی ہے۔

سڑک پر چلتے چلتے کوئی پکار اُٹھتا ہے۔ بھوک! بھوک!! اور بیدم ہو کر گر پڑتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اسے روٹی کا ایک ٹکڑا دے دوں۔ لیکن جو خوشی خوشی مر رہا ہو اُسے جلانے کا جتن کتنا بڑا پاپ ہے۔ روٹی کی تلاش اسے جیل سے زیادہ دُور نہ لے جاتی اور وہاں سب کچھ ہی بھُوک تو نہیں ہے۔ اس آوارہ گرد سانڈ کو دیکھئے جو حلوائی کی دکان سے گرفتار ہو کر حوالات میں گھاس چر رہا تھا۔

نہیں، میں دنیا والوں کے تماشہ کی تاب نہیں لا سکتا۔ فضا میں طبلِ جنگ کی للکار سمائی ہوئی ہو، ندی کا مٹ میلا پانی انسانوں کے خون سے اور بھی گدلا ہو گیا ہو، مجھے کیا۔ میں پُل کے ستون کا سہارا لیکر اپنی دُوربین سے آسمان کا نظارہ کر دوں گا۔

یہ ستارے چمکتے کیوں ہیں۔ ان میں سے کوئی حرکت میں اور کوئی منجمد کیوں ہے۔ ان میں خیر کا نگہبان کون ہے اور شر کا پاسبان کون؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ میری روح اِن میں سے سب سے نیک ستارہ کی ہم آہنگ ہو جائے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو شمال کے اُس دھندلے سے ستارے کی دُم نکل رہی ہے۔ شاید لمبی ہوتے ہوتے ایک عصا کی شکل اختیار کر لے اور اسکی ضرب سورج کو پاش پاش

کر دے اور دنیا چشمِ زدن میں خس خس ہو جائے ——

یہ سوچتے سوچتے مجھے نیند آئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے۔ اتنا اندھیرا کہ چقماق سے جو چنگاری نکلتی ہے اس کا رنگ بھی کالا ہوتا ہے۔ سردی اس قدر ہے کہ ہر شے برف کی شکل میں منتبدل ہو گئی ہے۔ گویا کائنات کی تشکیل سیاہ رنگ برف کے تودوں سے ہوئی ہے۔ زمین اپنے محور پر لٹو کی طرح گردش کر رہی ہے اور یہ محور سونے کی چٹان پر اٹکا ہوا ہے۔ اس چٹان کی ایک غار میں میں برہنہ پڑا ہوا ہوں۔ جسم پر بڑے بڑے بال اُگ رہے ہیں، ناخن تیز ہیں، دانت تیز تر۔ اور جی چاہتا ہے کہ چاروں ہاتھ پیر سے چلیئے۔ درختوں پر اچکیئے اور ہو سکے تو کچا گوشت کھایئے۔ تحت الشعور اور شعور کے درمیان جو سرحد چوکی ہے اس پر ایک فرشتہ ڈنڈا لئے بیٹھا ہے اور جیسے ہی پچھلے جنم کا کوئی خیال اپنی قید سے نکلنا چاہتا ہے ڈنڈے کی مار سے بلبلا کر پھر اپنے بل میں جا چھپتا ہے۔ اب میں خوشی یا غم، امید یا مایوسی اور اس قسم کے تمام بندھنوں سے آزاد ہو گیا ہوں۔ صرف دانتوں اور ناخونوں میں کھجلی ہے کہ انہیں کسی نرم نرم شے میں پیوست کیجئے اور ٹھنڈ میں اکڑا ہوا جسم کہتا ہے کہ اسے گرم کیجئے۔

دفعتاً اس عمیق تاریکی میں کوئی غیر بدن میرے جسم کو چھوتا ہے۔ یہ رگڑ گرمی کی ایک لہر دوڑا دیتی ہے۔ میں اسے چھو کر دیکھتا ہوں۔ یہ عورت کا جسم ہے۔ پیٹ کی بھوک کہتی ہے کہ اس کو کاٹ کر کھا جا کیونکہ یہ جانوروں میں سب سے کمزور (اور لذیذ بھی) ہے۔ جسم کی بھوک کہتی ہے کہ اسے اپنی رضائی بنا اور مجھے گرمی سے محروم نہ کر۔

اسی وقت اندھیرے کی چادر کو پھاڑ کر ایک ہلکی سی ضیا شمال کی سمت کو اُجالتی ہے اور ایک ستارہ سُرخ افق پر نمودار ہوتا ہے۔ ایک آواز آتی ہے کہ اے جاندار تو جہاں سے روانہ ہوا تھا بازگشت کر کے وہیں واپس آ گیا۔ تو اس بلندی کا اہل نہیں جو تیرے لئے تجویز کی گئی تھی۔ آدم اور حوّا کے اوتارو، کوشش کرو اور ان حماقتوں سے بچو جو تم سے پہلے سرزد ہوئی تھیں۔ یہ بھی نظر آیا کہ ایک درخت لہلہا رہا ہے جس میں سنہرے سکّے لٹک رہے ہیں اور حوا کانوں

میں کہتی ہے کہ اس کے قریب آ ــــــ

کسی نے زور سے شانہ ہلایا اور میری آنکھ کھُل گئی۔ میرا آدھا دھڑ پل کے نیچے لٹک رہا تھا اور اگر میں جاگ نہ جاتا تو ضرور پانی میں گر پڑتا۔ اس صورت میں کوئی آسان موت میسّر نہ ہوتی کیونکہ ندی میں گھڑیالوں کی بہتات تھی۔ اور انہیں مطلق خبر نہ تھی کہ مجھے کھا کر وہ زہر کے اثر سے خود مر جائیں گے۔

پولیس والے نے بے تکلّفی سے میری گردن میں ہاتھ دیکر کہا: "مرنا ہی ہے تو کوئی دوسری جگہ اور دوسرا وقت ڈھونڈو۔ مجھ غریب پر یہ مصیبت کیوں ڈالتے ہو کہ تمہاری لاش کو لئے دربدر مارا مارا پھروں۔

بات ٹھیک تھی کسی مردہ لاش کو کیا حق کہ دوسروں کے کاندھے پر اپنا بوجھ ڈالے۔ اگر اس کا حشر یہی ہونا ہے کہ کھاد بن کر اناج پیدا کرے اور دوسروں کی غذا بنے تو کیا ضرور ہے کہ وہ ایک جریب زرخیز زمین کو بیکار بنائے جسمیں سے سال بھر میں آدھ من غلّہ پیدا ہو سکتا ہے۔

اب میں پھر چلنے لگا۔ اپنے پائپ سے دھوُاں اُڑتا ہوا۔ اتنا دھواں جو ہیضہ اور تپ دق کے درجنوں جراثیم کو ایک کش میں فنا کر دے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں پائپ اسی لئے پیتا ہوں۔ ورنہ اس ملک میں وباؤں کے جراثیم کو مارنے کا اور کیا انتظام ہے۔ میری جیب میں جو جنتری ہے اس میں موسموں کے نام ایک نئے طریقہ سے لکھے گئے ہیں۔ سرما کے بجائے موسم نمونیا گرمی کی بجائے موسم چیچک، برسات کی بجائے موسم ہیضہ وغیرہ۔

اتنے میں میری نگاہ ایک ٹانگہ پر پڑتی ہے میں اچھل پڑتا ہوں۔ یہ وہی عورت ہے۔ جسے میں نے ابھی ابھی خواب میں محسوس کیا تھا (اندھیرے کیوجہ سے اسے دیکھ کس طرح سکتا تھا) یہی میری حوّا ہے۔ اور وہ بھی ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں دوڑ کر ٹانگہ کے پاس جاتا ہوں اور اچک کر اس پر بیٹھ جاتا ہوں۔ سب مجھے حیرت سے دیکھنے لگتے ہیں لیکن عورت کو کوئی

جھجک نہ ہوئی۔ اُس نے صرف اتنا کہا کہ آپ نے تانگہ رکوا لیا ہوتا۔ یہ سچ ہے۔ لیکن میرے جسم کو سردی لگ رہی تھی اور ناخون کسی نرم شئے میں پیوست ہونے کے لئے مچل رہے تھے۔

میں نے اسے پچھلی ملاقات یاد دلائی۔ کس طرح ہم ایک تاریک و مہیب غار میں ایک دوسرے سے لپٹے بیٹھے تھے اور ویرانہ میں ایک درخت لہلہا رہا تھا جس میں طلائی سکے جھول رہے تھے۔

اُسے یہ ملاقات تو بھول چکی تھی لیکن وہ دن یاد تھے جب میں اس کا پڑوسی تھا اور ہم آمنے سامنے کی کھڑکی سے آنکھیں ملاتے اور وہ لذت محسوس کرتے تھے جسے عُرفِ عام میں محبت کہتے ہیں۔

اس نے کہا "میں بیوہ ہوگئی ہوں۔ اب میرے آگے پیچھے کوئی نہیں اگر چاہو تو اب میں تمہاری ہوسکتی ہوں۔ زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی۔ کیونکہ ابھی ہم جوان ہیں"

میں نے یوں ہی کہا "کیوں نہیں۔ سب کچھ ممکن ہے۔ اس طویل انتظار کے بعد ہم اگر ایک جان دو قالب نہیں تو دو جان ایک قالب بھی ہوسکیں تو کتنا اچھا ہو۔ دیکھو میرے خواب کی تعبیر کتنی جلدی نکل آئی"

اور میں نے اسے لڑکپن اور نوجوانی کے قصے سنائے جو یادداشت کی کرم خوردہ بیاض میں دفن پڑے تھے۔

اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے میرے ہاتھ بھینچ کر پوچھا: "اور یہ کہو۔ آجکل تم کرتے کیا ہو؟"

"میں نے اپنے ذمہ ایک نہایت اہم خدمت لے رکھی ہے"

"اوہو۔ وہ کیا؟"

"دلّی کے ایک کباڑیئے کی دوکان میں مجھے ایک پیالہ مل گیا۔ دراصل یہ ایران کے پُرانے بادشاہ جمشید کا جام تھا جسے نادر شاہ کا کوئی سپاہی اپنے ساتھ یخنی پینے کے لئے لے آیا تھا۔ یہ پیالہ میرے ہاتھ لگا ہے اور میں دن بھر اس کے وسیلہ سے دنیا کا تماشہ دیکھا کرتا ہوں۔ جب رات ہوتی ہے تو دوربین نکال کر ستاروں کے کھیل کا نظارہ کرتا ہوں"

اس نے انتہائی حیرت سے پوچھا — "اور اس کا حاصل؟" اب میرے متعجب ہونے کی

باری تھی۔" حاصل؟ کس چیز کا کیا حاصل ہے؟ کائنات کا، زندگی کا، زمین کی گردش اور وقت کی روانی کا کیا حاصل ہے؟ جب سب کچھ لاحاصل ہے تو لطف تماشہ کرنے میں نہیں بلکہ تماشہ دیکھنے میں ہے۔"

"میرا منشا یہ ہے کہ تم اپنی روزی کے لئے کیا کرتے ہو؟"

یہ سنتے ہی میں چلّایا ـــ ٹانگہ روکو ـــ حوّا کی بیٹی دوبارہ مجھے اس شجرِ ممنوعہ کیطرف لے جانا چاہتی ہے جس میں سونے کے سیب لگے ہوئے ہیں۔

میں کیا جانتا تھا کہ یہ ٹانگہ میرے لئے جائے پناہ ہے۔ نیچے قدم رکھتے ہی دو سپاہیوں نے میرے بازو تھام لئے اور بولے۔ "ملک میں جبری لام بندی ہوگئی ہے، مادرِ وطن کو تم جیسے جوانوں کی قربانی کی ضرورت ہے۔"

ملک؟ قربانی؟ مادرِ وطن؟ میں نے اپنے حافظہ پر زور دیا۔ یہ کس زبان کے لفظ تھے۔

میرے فوجی معلّم نے رپٹ کی کہ یہ شخص ہمیشہ بندوق سے آسمان کی طرف نشانہ لگاتا ہے۔ مجھے دوبارہ طبّی معائنہ کے لئے بھیجا گیا۔ ڈاکٹر مجھ سے بہت مرعوب ہوئے کیونکہ میرے قلب کی حرکت بند تھی اور اسکی جگہ عزرائیل کے کتّوں کے غرّانے کی آواز میرے باطن سے آرہی تھی۔ انکی مہربانی سے فوج سے میری گلو خلاصی ہوگئی اور یہ طے پایا کہ جنگ کے اختتام پر میرے قلب کا آپریشن کر کے اس پُر اسرار صدا کی اصل دریافت کی جائے۔

چنانچہ میں اب بھی اپنی زندگی کے پُرانے نظام پر قائم ہوں۔ اپنے حجرہ میں لیٹے لیٹے جامِ جم کے ذریعہ دنیا کا تماشہ روز دیکھا کرتا ہوں۔ دولت وطاقت کے سراب کے پیچھے انسانوں کو بھاگتا ہوا دیکھتا ہوں اور ان میں سے اکثر بیدم ہوکر گر پڑتے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاتے ہیں۔ مرد عورتوں کی اور عورتیں بچّوں کی لاشیں اٹھائے چلتی رہتی ہیں اور اس خونیں جلوس میں سب ایک دوسرے کو روندتے اور کچلنے کی فکر میں ہیں۔

جی نہیں مانتا۔ اور عقل کے منع کرنے پر بھی میں پکار اٹھتا ہوں کہ یہ بھیڑ بھاڑ، کشمکش، یہ

دوڑ دھوپ کس لئے۔ لیکن میری آواز نحیف ہے۔ کاش اس میں بجلی کی سی کڑک پیدا ہو جائے
اور یہ بہرے سن لیں کہ وہ ہلاکت کی وادی میں بھٹک رہے ہیں۔
تھک کر میں ستاروں کو دیکھنے لگتا ہوں۔ وہاں کس قدر سکون ہے۔ ان میں حیات کا
امکان پیدا ہو جائے تو کیا اچھا ہو۔ ایک نئی بستی بس جائے جس میں نئے آئین اور نئے قانون
ہوں۔ وہاں صرف ایسے لوگ رہتے ہوں جن کی ریڑھ کے نیچے دم اُگانے والی ہڈی کا نشان
اور ماتھے پر سینگ کی علامت نہ ہو۔ ستارہ میں ایک بلور رنگ تالاب ہو جس میں کنول کثرت سے
سے پھولتے ہوں۔ سب کنول کی پنکھڑیاں کھا کر شکم سیر ہو جائیں اور ستاروں کے نغمے سنتے
پڑے رہیں ——
میرے خیالوں اور خوابوں کے سلسلہ میں مخل ہونے والے آدمیوں کی تعداد بہت کم ہے
لیکن یہ خلل باقاعدگی سے سرزد ہوتا ہے۔ ایک مالک مکان، دوسرا نان بائی، تیسرا اینو ارٹسی۔
سب اس طلائی سکّہ کی فرمائش کرتے ہیں جس کے درخت کو میں جنّت میں چھوڑ آیا تھا۔ ان کی
زد سے بچنے کے لئے میں نے اپنی کوٹھڑی کے دروازہ پر ایک صندوق رکھ دیا ہے جو
چاہے میرے جامِ جم سے دنیا کا اور دوربین سے ستاروں کا تماشہ دم بھر کے لئے دیکھ لے
اور اسکی اُجرت ایک گنی کی صورت میں اس دکان میں ڈال دے۔

عبدالحمید عدمؔ

فروختنی

دولتِ عقلِ پشیماں بیچنے والا ہوں میں
نازِ ہر تارِ گریباں بیچنے والا ہوں میں

ہے ضرورت گر کسی کو اس فسردہ جنس کی
اُس کو لے آؤ کہ ایماں بیچنے والا ہوں میں

ہے کسی کی آنکھ میں گر مے سے زائد کیفیت
اس سے کہہ دو جامِ رخشاں بیچنے والا ہوں میں

ہے کسی کانٹے کو ذوقِ رنگ آشامی اگر
خونِ رگہائے گلستاں بیچنے والا ہوں میں

اُس کی رحمت اور مری دہلیز سے مایوس جائے
رحم کھا کر جنسِ عصیاں بیچنے والا ہوں میں

شیخ کو لے آؤ زاہد کو ذرا آواز دو
میکدے میں آبِ حیواں بیچنے والا ہوں میں

موت اگر معقول مل سکتی ہے اس بازار میں
زندگی کا ساز و ساماں بیچنے والا ہوں میں

وہ سمجھتے ہیں مرا دل کر رہے ہیں وہ خرید
میں سمجھتا ہوں بیاباں بیچنے والا ہوں میں

جیب خالی ہے عدمؔ مے قرض پر ملتی نہیں
ایک دو بوتل پہ دیواں بیچنے والا ہوں میں

مدھوسودن

سمندر اور تین کمرے

اپنے قریب اُسکی موجودگی کے ایک شدید احساس کو لئے ہوئے وہ بینچ پر بیٹھی رہی یہاں سے اُٹھنا اُسے بے تُکا معلوم ہوتا تھا اور یہاں بیٹھے رہنا ہی بے ہنگم سا معلوم ہو رہا تھا۔ بینچ پر اس اجنبی نوجوان کے پاس بیٹھے ہوئے اُس کے اعصاب میں ایک عجیب سی حرکت پھیل رہی تھی، جسے نیم شعوری طور سے روکنے کی کوشش میں وہ سنجیدہ ہو گئی تھی اپنی یہ سنجیدگی اُسے پسند نہ تھی، لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی۔

سمندر کے کنارے پڑے ہوئے ان بینچوں پر دُور دُور تک لوگ بیٹھے ہوئے نظر آتے تھے، لیکن وہ خود کو اِس نوجوان کے ساتھ تنہا سا محسوس کر رہی تھی، جو اُس کے پاس آبیٹھا تھا۔ اُس کے بھاری ہاتھ اُس کے گھٹنوں پر رکھے تھے اور وہ ٹھہر ٹھہر کر ایک پریشان تفکر کے سے انداز میں انگلیوں سے اپنے گھٹنوں پر تھپکی دینے لگتا تھا۔ اور اُسکی طرف سے بظاہر بالکل لاپرواہ سا تھا۔ جیسے اُسے سیما کی یعنی مسز ورمن کی موجودگی کا احساس نہیں ہے اور سیما کو محسوس ہوا تھا کہ اُس کا یہ اندازِ استغنا مصنوعی ہے، اور اس سے اُسے ایک

غیر شعوری تحقیر کا سا احساس ہو رہا تھا۔ لیکن وہ بے توجہی سے سمندر کے افق کو دیکھ رہا تھا، جہاں فاصلے پر خشکی کا ایک مختصر سا ٹکڑا سمندر میں گھستا چلا گیا تھا اور اُس پر استادہ بلند وائرلیس روٹر کے عقب میں سورج غروب ہو چکا تھا۔ غروب آفتاب کی ترقی کا سایہ سمندر اور آسمان کے سنگم پر ساکن ہو گیا تھا اور سمندر کی سطح کو چھوتا ہوا سرمئی ہو گیا تھا۔ اور تاریکی کا منبع سمندر کا نیلا پانی معلوم ہوتا تھا۔

سیما کی توجہ لہروں کی طرف منعطف ہو گئی اور لہروں کے شور کو جو ابھی اُس کے شعور سے فیڈ ہو گیا تھا وہ پھر سننے لگی۔ سمندر آج ساکن نہ تھا، ہوا تیز تھی۔ لہریں گرررر کا شور کرتی ہوئی کنارے کی طرف بھاگی آتی تھیں اور کنارے سے ٹکرا کر پھیل جاتی تھیں اور پھر واپس سمندر میں چلی جاتی تھیں۔ لہروں کو دیکھتے ہوئے سیما ایک لمحہ کے لئے اُس کی موجودگی سے غافل ہو گئی، وہ یہ چاہتی تھی۔ اور وہ توجہ سے دیکھنے لگی کہ یہ لہریں کہاں سے شروع ہوتی ہیں، لیکن اُسے معلوم نہ ہو سکا۔ سمندر کی حرکت تھوڑے سے فاصلے پر آ کر لہر بن جاتی تھی اور وہ لہر اپنے آگے ایک اندھیرا سا سایہ لئے کنارے کی طرف دوڑی آتی تھی، اور اُس کے پیچھے دوسری لہر، اور اِس سے پہلے کہ وہ لہر کنارے سے ٹکر کھا کر واپس جائے دوسری لہر اس سے آ کر ٹکرا جاتی تھی، اور لہروں کے تصادم سے ایک شور ہوتا تھا۔ وہ اِس میں منہمک ہو گئی تھی کہ اچانک سیٹ پر نوجوان نے حرکت کی، وہ اپنی صورت نشست بدلنے کے لئے ایک ٹانگ کو دوسری ٹانگ پر رکھ رہا تھا۔ پھر ایک خفیف سی بے چینی سے اُس نے اِس ارادے کو ملتوی کر دیا، اور پاؤں پھیلا کر بنچ کے سہارے پیچھے کو جھک گیا۔ سیما کے دِل میں اُسے دیکھنے کا ایک مختصر سا تجسس پیدا ہوا اور اُس نے دیکھ لیا۔ اُسکی پیشانی پر بے چینی کی شکنیں تھیں، اور اچانک اُس نے چہرے کی ایک خفیف سی جنبش سے سیما کو دیکھا اور ان کی نگاہیں نوجوان کے وجود سے پرے پھسل گئیں۔ لیکن سیما کو یہ خیال رہ گیا کہ اُس نے دیکھتا ہوا دیکھ لیا ہے اور اس خیال سے اُسے اپنے احساس میں ایک عدم آسانی سی محسوس ہونے لگی، وہ

وہ اُٹھنا چاہتی تھی، لیکن اُٹھی نہیں، جسم میں کچھ لہریں سی پیدا ہو رہی تھیں، اور یہ لہریں اُس کے جسم میں داخل نہیں ہو رہی تھیں، اُسے چھوڑ رہی تھیں۔

"میں آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کر رہا؟" اُس نے اچانک کہا۔

"نہیں"۔ سیما نے بغیر سوچے ہوئے جواب دیا اور یکایک اُس کے جسم میں حرکت کرتی ہوئی لہریں رُک گئیں، اور اُس نے ایک آسانی سی محسوس کی جیسے سیما کی اور اُسکی شخصیت کے درمیان سے ایک اسرار سا تفریق ہو گیا ہو۔

"تعجب ہے"۔ اُس نے نیم طنزیہ سے لہجے میں کہا۔ "لیکن آپ کو اگر کسی دوسرے آدمی کے ساتھ بیٹھنا پسند نہ ہو تو میں یہ بنچ چھوڑ دونگا"

"نہیں آپ بیٹھے رہیں"۔ سیما نے پھر ایک عدم آسانی سی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال تھا اِس سمندر کے کنارے ایسی کوئی عورت نہ ہوگی جو کسی دوسرے آدمی کے ساتھ بیٹھنا پسند کرے"۔

سیما نے اُس کی طرف دیکھا، یہ بات اُسے پسند نہیں آئی لیکن اُسے ایک مخصوص سے تعجب نے مَس کیا۔

"دہلی میں میرا خیال تھا کہ صرف یہیں کے لوگوں میں ملنساری کی اتنی کمی ہے اور شاید بمبئی میں ایسا نہیں ہوگا، لیکن یہاں ہر شخص کی اپنی الگ زندگی ہے اور وہ اِس میں کسی کو شریک کرنا نہیں چاہتا"۔

"آپ دہلی سے آئے ہیں؟" سیما نے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔ اور اُسے اپنا استفسار عجیب سا معلوم ہوا۔

"ہاں" اُس نے جواب دیا۔ "اور یہاں ایسا معلوم ہوتا ہے یہ ایک دور دراز جزیرہ ہے، جہاں ساتھ دینے کو کوئی نہیں اور انسان بازاروں میں بے وقوفوں کی طرح چلتا ہے، اور دکانیں بالکل اجنبی معلوم ہوتی ہیں اور سڑکیں پرائی اور وہ زبان سنائی نہیں دیتی جسے سننے کی عادت ہے

وہ خاموش ہوگیا۔ سیما کو تعجب سا ہوا کہ یہ شخص کچھ زیادہ بے تکلفی سی بات کر رہا ہے۔ یہ بے تکلفی اُس نے اپنے لیئے محسوس نہ کی۔ اُس کی گفتگو کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ سیما سے زیادہ خود کو مخاطب کر رہا ہو، یا کسی کو بھی نہیں، یا سب کو، بغیر اس بات کی پرواکیئے کہ اس کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ وہ سفید پتلون اور سفید قمیص پہنے ہوئے تھا اور اس کے سر کے ہلکے بال ماتھے پر سے پیچھے کو چلے گئے تھے۔ اُس کے ماتھے پر خفیف سی شکنیں تھیں اور ان سے سیما کو ایک پر اسرار سی دلچسپی ہوگئی۔ اُسے محسوس ہُوا اُس کے گفتگو میں ایک صداقت سی ہے اور وہ اس کے جذبات کے متعلق متجسس ہوگئی۔ وہ خاموش ہوگیا تھا اور پھر اچانک اُس نے کہا۔

"میرا خیال ہے، آپ بمبئی کی رہنے والی نہیں۔"

"نہیں،" سیما نے جواب دیا۔ "لیکن مجھے بمبئی میں تین سال ہوگئے ہیں۔"

"اوہ، تین سال تو بہت ہوتے ہیں۔" وہ رُک گیا۔ پھر بولا۔ "یہاں میرا اُن لوگوں سے گفتگو کرنے کو جی چاہتا ہے، جو بمبئی کے نہیں ہیں، یا جو مجھے بمبئی کے معلوم نہیں ہوتے۔ آپکو میری گفتگو ناگوار تو نہیں؟"

سیما شاید کہنے لگی تھی کہ نہیں۔ لیکن اُس نے جواب کا انتظار نہیں کیا۔

بمبئی میں آکر میں نے صرف تین آدمیوں سے کبھی کبھی بات کی ہے، اور میں ان لوگوں سے اتنا اُکتا گیا ہوں کہ میں اُنہیں چھوڑ نہیں سکتا اور میں اُن سے نفرت کرنے لگا ہوں۔"

"آپ یہاں اکیلے رہتے ہیں؟"

"ہاں۔" اور پھر ایک مسکراہٹ میں، جو مسکراہٹ سے زیادہ کچھ اور تھی، وہ کہنے لگا۔ "تین مہینے کی تنہائی کے بعد اب کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ پاس سے گزرتے ہوئے، یا قریب بیٹھے ہوئے کسی آدمی کو مخاطب کروں، لیکن میں ایسا نہیں کرسکتا۔ آپ کے خیال میں کیا یہ بات صحیح ہے کہ انسان تنہائی سے اتنا پریشان ہوجائے۔ کہ راہ چلتے آدمیوں سے تعارف پیدا کرنا چاہیے؟ شاید آپ اِسے صحیح نہ سمجھتی ہوں لیکن یہ صحیح ہے، اور

کبھی کبھی مجھے تعجب ہوتا ہے اور غصہ آتا ہے کہ میں اتنے آدمیوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی اکیلا محسوس کرتا ہوں۔"

سیما سمجھ نہ سکی کہ کیا جواب دے اور وہ خاموش رہی۔ اِس شخص کی گفتگو اُس پر ایک مثبت اثر کر رہی تھی لیکن اسے اپنی زبان کے آگے ایک رکاوٹ سی محسوس ہوتی تھی۔ درمیان میں ایک جھجک سی حائل تھی، دِل کے نیچے اُسے محسوس ہوتا تھا کہ کچھ کہے لیکن جو کچھ کہنا تھا، وہ اُوپر نہ آتا تھا اور وہ خاموش بیٹھی رہی۔ سمندری افق پر سُرخی غائب ہو چکی تھی اور اب سُرخی کے سائے پر ایک بڑا سا ستارہ چمک رہا تھا، اور روشنی کی ایک طویل لکیر سمندر کی سطح پر پڑ رہی تھی، جو سُرمئی ہو گئی تھی، پانی کی نیلاہٹ میں اندھیرا گھُل گیا تھا۔ ہوا میں ایک عجیب سی سمندری بُو پھیل گئی تھی اور وہ یہ جان نہ سکی کہ بُو سمندر کی سیپیوں کی ہے یا ریت کی، یا پانی کی۔ یہ بُو عجیب تھی، اِس میں سمندر کی دلکشی اور ایک شامی برگشتگی دونوں پائی جاتی تھیں وہ اس کے متعلق ایک مخصوص احساس کی عادی تھی۔ ہوا ہلکی پڑ گئی تھی اور اُس کے سر پر ناریل کے درختوں کا جوش سرد ہو گیا تھا۔ اندھیرا ہو رہا تھا اور ساحل پر ٹہلتے ہوئے لوگ واپس جا رہے تھے، واپس چلے گئے تھے۔ قریب کے بینچ خالی پڑے تھے۔ سیما نے پھر خود کو نوجوان کے ساتھ اکیلا محسوس کیا اور عادتی طور پر اُسے خیال آیا کہ اب چلنا چاہیئے۔ وہ چلنے کو تیار ہو گئی، نوجوان اپنی انگلیوں کو ایک موہوم سی بے چینی میں مسل رہا تھا اور سیما نے اُٹھنے میں ایک تردد سا محسوس کیا، وہ ایک کشمکش میں پڑ گئی کہ اُٹھنے سے پہلے اُس سے کچھ کہے یا نہیں، کہے تو کیا کہے، یہ سمجھ میں نہ آتا تھا، اور وہ پھر تھوڑی دیر بیٹھی رہی، اندرونی طور پر وہ کچھ کہنے کے لئے محسوس کر رہی تھی لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے اور سیما انتظار کرتی رہی کہ وہ خود بھی کچھ کہے لیکن اُس نے کچھ نہیں کہا، اُس کی آنکھیں سمندر کی سطح پر روشنی کی لکیر کو دیکھ رہی تھیں، سمندر کا کنارا سنسان ہو گیا تھا، سیما اُٹھ کھڑی ہوئی۔ نوجوان نے خاموشی میں اُس کی طرف دیکھا، جیسے اُسے بُرا لگا ہو کہ جا رہی ہو! اور وہ چلی گئی، اُس کی نگاہ میں تعجب اور ناگواری کے اِس جذبے

سے سیما کو محسوس ہُوا کہ اُس نے اسکی توہین کی ہے اور آگے جا کر جب اُس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ اب بھی اُسے دیکھ رہا تھا، پھر یکبارگی ہی دونوں نے منہ پھیر لیا۔ وہ ساحل پر خالی بینچوں کو دیکھنے لگا اور وہ آگے چلی گئی۔

ماہم سے دادر جاتی ہوئی بس میں بیٹھی ہوئی وہ دیر تک سوچتی رہی۔ سیما کو معلوم ہو رہا تھا کہ اُس نے اجنبی کی ہتک کی ہے عجیب ڈھنگ سے وہ خود کو قصوروار سمجھ رہی تھی۔ وہ یاد کر رہی تھی کہ جب پیچھے مڑ کر اُس نے دیکھا تھا تو اجنبی نے جیسے بُرا مان کر منہ پھیر لیا تھا، بُرا مان کر۔ اور حقیقت میں وہ یہ نہیں چاہتی تھی، سیما کے دل کی عورت اُسکی گفتگو سے متأثر ہوئی تھی، اور خود کو قصوروار سمجھ رہی تھی۔ دلکشی کے اِس اثر کا وہ خود سے اعتراف کرنے کو تیار نہ تھی اور اُس نے اس احساسِ قصور کو اپنے اُوپر سے ہٹانے کی کوشش کی، کتنی عجیب تھی اُس کی یہ بات یہ یوں خواہ مخواہ اُس سے باتیں کرنے لگا، اُس نے سوچا، اُسے یہ اُمید ہی کیوں تھی کہ وہ اُسے اسی طرح جواب دے گی، لیکن —— سیما کے دِل میں کوئی چیز اُسکی حمایت لے رہی تھی۔ وہ اس ذہنی ضِد سے رہائی چاہتی تھی لیکن نوجوان کی سیاسی شخصیت ایک غیر معمولی تاثر کی شکل میں اُس کے ذہن میں مجتمع ہو گئی تھی، یہ شخص —— اچانک بے ربط طور پر اُسے اپنے شوہر کا خیال آ گیا۔ اُس نے سوچا کہ وہ اس وقت گھر پر نہ ہوں گے۔ اپنے شوہر کے ساتھ وہ ایک غیر خوشگوار حالت میں رہ رہی تھی۔ وہ دن میں لڑکیوں کو پڑھاتی تھی۔

بس رُک گئی تھی، اُسکی ساتھ والی عورت اُتر گئی اور سیما کھڑکی کے قریب کھسک گئی، بس اب دادر میں داخل ہو رہی تھی، مکانوں کی کھڑکیوں اور دکانوں کے اندرونی حصّوں میں دھیمی روشنیاں تھیں اور بس اندھیرے میں سے گذر رہی تھی، بلیک آؤٹ میں سڑک پر دور دور کھمبوں سے لٹکتی ہوئی روشنیوں کے دھبّے تھے اور اُن کے چاروں طرف اندھیرا۔ یہ اندھیرا اب اُس کے لئے اجنبی نہ رہا تھا، یہ بلیک آؤٹ اس سے بھی پہلے شروع ہُوا تھا جب اُس نے ٹیوٹوریل اسکول میں لڑکیوں کو پڑھانا شروع کیا تھا۔ اچانک اُسے پھر اپنے شوہر کا

خیال آ گیا۔ اور پھر اُس اجنبی کا۔ دونوں شخصیتیں اُس کے فکری دائرے کی قوس پر آ گئیں تھیں اور خیال کا سلسلہ اُسے قوس پر ہوتا ہُوا ایک دوسرے تک پہنچا دیتا تھا، اور یہ ایک سائیکل سی بن گئی تھی جس کے ساتھ وہ خوش نہ تھی۔ لیکن اس شخص کے قرب کو وہ اب بھی یگانگت سے محسوس کر رہی تھی، اور اُس نے اس کے خیال سے دُور ہٹنے کی کوشش کی۔ بس اب دادر کے پُل سے گزر رہی تھی، پانچ منٹ میں وہ گھر پہنچ جائے گی، وہ گھر پر نہیں ہوں گے۔ اپنے شوہر کا وہ اس وقت گھر پر موجود ہونا نہ چاہتی تھی۔

لیکن جب وہ گھر پہنچی تو ورمن موجود تھا۔

"سیر کر آئیں؟" اُس کے لہجے میں ایک طنز تھا۔

"ہاں —" سیما نے لاپروائی سے جواب دیا، اُس نے طنز کو محسوس کیا تھا لیکن اسکی پرواکرنا نہ چاہتی تھی، پچھلے دنوں سے وہ خود کو اپنے شوہر کے مقابلے میں مساوی سمجھنے لگی تھی اور اب اس طنز کی طرح محسوس کر کے اُسکی مخالفت کرنا ذلیل سا معلوم ہوتا تھا۔

"مجھے تمہارا یہ چوبیس گھنٹے گھومتے رہنا پسند نہیں۔"

"مجھے معلوم ہے تمہیں پسند نہیں ہوگا۔" سیما نے جواب دیا۔ "تم چاہتے ہو کہ میں دن بھر ان تین کمروں میں قید ہوں۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تم اس طرح سڑکوں کی خاک نہ چھانو۔"

"سڑکوں کی خاک کون چھانتا ہے۔ کیا تمہارے خیال میں صرف تمہیں ہی گھر سے باہر نکلنے کا حق ہے اور مجھے نہیں۔ جب تم رات کو دس دس بجے گھر آتے ہو تو میں شام کو سیر بھی نہیں کر سکتی؟"

ورمن چپ ہو گیا اور وہ کپڑے اُتارنے کے لئے اندر کمرے میں چلی گئی۔ سیما جانتی تھی کہ ورمن اُس کے ملازمت کرنے سے بھی برگشتہ ہے۔ اسے اب وہ اپنے شوہر کی خودغرضی پر محمول کرتی تھی۔ اس ملازمت کی وجہ سے وہ خود کو بڑا آزاد محسوس کرنے لگی تھی اور اپنے

شوہر کا دستِ نگر نہ سمجھتی تھی۔ اور اس احساس سے اُسکی اپنی مرضی کو تقویت مل گئی تھی۔ وہ اب وہی کرنا چاہتی تھی جسے خود ٹھیک سمجھتی ہو۔

کپڑے بدل کر جب وہ باہر آئی تو ورمن کھڑکی میں کھڑا ہُوا باہر دیکھ رہا تھا۔

"سیما ——" اُس نے مڑکر کہا۔ "میرا خیال ہے تمہارا یہ رویہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیوں؟" سیما نے استفسار کیا۔

"کیوں میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔"

"کیوں برداشت نہیں کر سکتے، یوں کہو کہ تم سے میری آزادی دیکھی نہیں جاتی۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تم عورتوں کی طرح رہو" ورمن نے بگڑ کر کہا۔

میں بالکل عورتوں کی طرح رہتی ہوں، لیکن تم چاہتے ہو کہ مجھے اپنے رعب میں رکھو" سیما نے جواب دیا۔

"مجھے تمہارا یہ سکول جانا بھی پسند نہیں ہے، یہ میری توہین ہے۔"

"میں تو اسے توہین نہیں سمجھتی۔" سیما نے اُس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اپنا بوجھ اپنے آپ اُٹھانا چاہتی ہوں اور میں اٹھا سکتی ہوں۔"

ورمن نے غصّے میں اُس کی طرف دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ یہ جھگڑے اب اس سے آگے نہ بڑھتے تھے۔ سیما اُس سے کہہ چکی تھی کہ تمہیں مجھ پر رعب جمانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور ورمن نے اُس پر رعب جمانا چھوڑ دیا۔ اور بات زیادہ سنجیدہ ہوتی جا رہی تھی۔

رات بستر پر وہ دیر جاگتی رہی۔ کمرے میں وہ اکیلی نہ تھی، درمیان میں چند فٹ کا فاصلہ تھا اور پھر ورمن کا بستر —— لیٹے ہوئے سیما کو احساس تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں یعنی ورمن جاگ رہا ہے۔ لیکن وہ سو رہی تھی، ورمن کے سامنے وہ جاگنا نہ چاہتی تھی، آنکھیں بند کئے وہ بستر پر لیٹی رہی۔

تین سال پہلے سیما کی شادی ورمن سے ہوئی تھی، جیسے شادیاں ہوتی ہیں، آگ کے

گرد گھوم کر، منتر پڑھ کر، شہنائیوں کی آواز کے درمیان۔ اور جب شادی ہوگئی تھی تو سیما نے اس کا بُرا نہ مانا تھا، وہ خوش تھی۔ ورمن ایم۔ اے تھا اور اسسٹنٹ پوسٹ آفیسر، اور وہ ہندو پرستھ گرلز کالج کی گریجویٹ تھی، جہاں اُن لڑکیوں میں "انگیجمنٹ" کے متعلق باتیں کر کر کے اُس نے اپنے ذہن میں اپنی دوشیزگی کو کھو دیا تھا۔ لیکن کتنی حسرت تھی۔ اُسے حقیقت سے دو چار ہونے کی یہ موقع اُسے ورمن نے دیا اور اُس نے اسے خوشی سے قبول کر لیا تھا، وہ یہ چاہتی تھی۔ اُن دونوں کئی کئی نصف گھنٹوں تک وہ لیٹے ہوئے ورمن کے پاس بیٹھی رہتی اُس کا بازو ورمن کے اُوپر سے ہوتا ہوا فرش کا سہارا لئے رہتا، اور اُس کا سینہ ورمن کے سینے سے چھوتا رہتا اور وہ ورمن کے سینے پر اپنی انگلیوں سے بے معنی لکیریں کھینچتی رہتی، اور وہ محبت کی باتیں کرتے رہتے۔ یا وہ ورمن کے بازوؤں میں اُس کے گھٹنوں پر لیٹی رہتی اور ورمن کی قمیص کے بٹنوں کو کھولتی رہتی، بند کرتی رہتی، اور ورمن کے بازو اُس کی کمر کے گرد حلقہ کئے رہتے، کتنی لذت تھی ایک مرد کے بازوؤں کو اس طرح اپنی کمر کے گرد محسوس کرنے میں، کتنی راحت تھی اور وہ محبت کی باتیں کرتے رہتے اور بوسے اور...... اوہ، کتنا کیف تھا، پہلے جاڑوں کی طویل راتوں میں وہ بستر پر اُس کے جسم کی مخصوص گرمی کو محسوس کرتی، کتنی مبنی ہوتی تھی یہ گرمی اور کتنی راحت بخش، اور وہ محبت کی باتیں کرتے رہتے اور ـــ وہ موضوع جن کے متعلق پشپا کپور، اور دریا وتی اور شمع اور شبنم اتنے ہیجانی انداز میں باتیں کیا کرتی تھیں اور جن کے متعلق سوچ سوچ کر اُس نے اپنے ذہن میں اپنی دوشیزگی سے ہاتھ دھو لئے تھے۔ بے شک وہ اتنے لذیذ نہ تھے جتنا اُس نے تصوّر کیا تھا لیکن اُس نے خود کو ان بوسوں اور بازوؤں اور حرارت اور سب چیزوں کے سپرد کر دیا تھا۔ جذبات کی شدت میں اُن دونوں نے ایک دوسرے کی تقصیروں کو نظر انداز کر دیا تھا اور وہ محبت کی باتیں کرتے رہتے تھے اور ایک سال گزر گیا۔ اور پھر محبت کی باتیں گویا ختم ہوتی گئیں، باتیں ہی تو تھیں اور سیما کا انہیں بار بار دہرانے کو جی نہ چاہتا تھا، جی ہی تو تھا۔

لیکن وہ جسمانی لمس، وہ بوسے، وہ بوسے، وہ......۔۔۔۔

اور دن گزرتے گئے، وہ ان کی عادی ہوتی گئی اور یہ دیکھنے لگی کہ ورمن میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جو اُسے پسند نہیں۔ اس میں خود بھی ایسی خاصیتیں تھیں جو ورمن کو پسند نہ تھیں اور اُسے یہ بالکل ناگوار معلوم ہوتا تھا کہ ورمن اُنہیں دیکھنے لگا ہے لیکن ورمن اُنہیں دیکھنے لگا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ سیما کو اُن کا احساس کرا دیتا تھا۔ سیما کو یہ بات پسند نہ آئی، پھر وہ اسے بُری لگنے لگی، لیکن ورمن باز نہ آیا، اور وہ بھی باز نہ آئی اور اُسے ورمن کے نقص اجاگر معلوم ہونے لگے۔ اور پھر اچانک اُسے محسوس ہُوا کہ اُس کے اور ورمن کے خیالات نہیں ملتے اور کہ ورمن کے ذہن میں ایم۔ اے کرنے کے باوجود بھی وہی روایاتی تنگی ہے۔

"۔۔۔لیکن تم اتنی اتنی دیر اس سے باتیں کیوں کرتی رہتی ہو؟"

"باتیں کرنے میں کوئی حرج ہے۔"

"وہ کیوں اتنی اتنی دیر یہاں بیٹھا رہتا ہے، مجھے یہ بالکل پسند نہیں۔"

"تمہیں تو کوئی چیز پسند نہیں۔ اوّل تو باتیں کرنے میں کوئی حرج ہے ہی نہیں، دوسرے وہ بالکل بچہ ہے، تمہیں تو دوسروں کے متعلق بڑی بڑی باتیں سوچنے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔"

"عادت نہیں، میں ان سب بچوں کو جانتا ہوں، یہ چودہ برس کے ہونے سے پہلے ہی جوان ہو جاتے ہیں۔"

"وہ نہیں ہے۔"

"ہو یا نہیں ہو۔" ورمن نے درشتی سے کہا۔ "لیکن میں تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اپنے گھر تم ایسا کر سکتی تھیں؟"

"اپنے گھر میں آزاد نہیں تھی۔"

"آزاد تو تم اب بھی نہیں ہو۔" ورمن نے اڑتی سی آواز میں کہا۔

"کیا؟"

"میں کہتا ہوں تم نے یہ قمیص میں بٹن کیوں نہیں ٹانکے، اگر تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا تو اِس شادی کا سکھ ہی کیا ہے۔"

"تو تم نے مجھ سے بٹن ٹکوانے کے لئے شادی کی ہے۔" سیما نے خفگی سے کہا، اُس نے سُن لیا تھا کہ وہ آزاد نہیں ہے، اندر پرستھ گرلز کالج کی گریجویٹ آزاد نہیں ہے، یعنی وہ کبھی آزاد نہیں رہے گی، شادی کے بعد بھی نہیں، تو پھر اس شادی کا سکھ ہی کیا ہے۔ اُسے ورمن کی اِس بات سے کتنی نفرت تھی، ورمن کی اِس بات سے، کتنی تنگ نظری تھی یہ۔ اُس کے خیالات نے ورمن سے ملنا چھوڑ دیا، اور دن گزرتے گئے اور اُس کے اپنے خیالات اُس کے ساتھ ایک Obsession ہو گئے۔ اُس کے اور ورمن کے درمیان خیالات کا اختلاف آ گیا۔ دراصل وہ اب اپنے اور اُس کے درمیان کچھ چاہتی تھی اور اُس نے آسانی سے اِس اختلاف کا سہارا لے لیا اور اپنے خیالات اُسے زیادہ عزیز ہوتے گئے اور پھر — یعنی خیالات میں اختلاف ہو تو انجکشن وہ لذت نہیں بخش سکتے، وہ اب پریمی نہ ہو کر میاں بیوی رہ گئے تھے اور میاں بیوی کی طرح رہتے تھے۔ اور اب سیما کو محسوس ہوتا تھا کہ اُس نے آرزو کو کھو دیا ہے، لیکن ایسا نہیں تھا، آرزو موجود تھی لیکن وہ شدّت سے پُوری نہیں ہوتی تھی وہ اس کے ردِ عمل کو محسوس کرتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے اسے کھو دیا ہے، ان انجکشنوں میں اب دلکشی نہ رہی تھی، وہ اب انکی کچھ ایسی خواہشمند نہ تھی اور کبھی کبھی اُسے یہ بالکل Proffessional سے معلوم ہوتے، اور ورمن اُسے انجکشن دینا چاہتا تھا۔ جب وہ ان کی خواہشمند نہ ہوتی Proffessioonal تھی، کتنی ذلیل بات تھی یہ، کتنی ناپسند تھی اُسے۔

سیما نے محبت دراصل ورمن سے کبھی نہیں کی تھی، یہ اُس کی جنسیت تھی جسے ورمن کے مرد سے محبّت تھی۔ اپنے جذبے کی شدّت میں اُس نے خود کو ورمن میں اُس شے کے سپرد کر دیا تھا جو اُسے تسکین بخشتی تھی۔ اُس وقت وہ تسکین چاہتی تھی جو پشپا کپور اور ودیاوتی

سے باتیں کر کے حاصل نہ ہوتی تھی۔ وہ سچائی چاہتی تھی۔ سچائی مل گئی تھی اور اس سچائی سے محبّت کی تھی، جیسے سب عورتیں کرتی ہیں۔

سیما کو اپنے ان احساسات پر اعتبار نہ تھا، اپنے ادراک سے نیچے وہ ان سے ڈرتی تھی اور اُسے اب بھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ ورمن سے محبّت کرتی ہے۔ لیکن یہ محبّت نہ تھی، اگر محبّت کچھ اور ہوتی ہے، یہ صرف ایک احساسِ ملکیت تھا، ورمن اُس کا شوہر تھا، اور ورمن کے علاوہ اُس کا اور کچھ نہ تھا، اُس کے لئے صرف وہ سب کچھ تھا اور سیما اُس سے ایک شوہر کے رول میں محبت کرتی تھی اور رازدارانہ طور پر اپنی رُوح کے نہاں خانے میں ایک مرد کی حیثیّت سے اب اُسے خوشی نہ ہوتی تھی یہ جنسی تعلقات اُس کے درمیان اُس کے درمیان ایسے ہو گئے تھے، گویا رات کے کھانے کے بعد تاش کھیلنے کو جی چاہتا ہو، یا جیسے کبھی انسان اپنے اُوپر سے کچھ اُتار پھینکنا چاہتا ہو۔ یہ تجربے اُسے ہمیشہ ایک ناگوار سی حالت میں چھوڑ جاتے، وہ محسوس کرنا چاہتی تھی اور محسوس کرنے کو کچھ نہیں تھا، اور ورمن اپنا بوجھ اُتارنا چاہتا تھا جب وہ خواہشمند نہ ہوتی تھی۔ کبھی خواہش ہوتی بھی تھی تو یہ صرف اپنی آرزو ہوتی تھی ——————— دوسرے کی جذباتی ضرورت نہیں، صرف اپنی خواہش کی تسکین کی آرزو۔ لیکن پھر بھی وہ خود کو ورمن کے لئے ریزرو سمجھتی تھی، جس کیلئے اُس نے آگ کے گرد پھیرے لئے تھے۔ اس ریزرویشن سے وہ اپنی رُوح میں برگشتہ تھی لیکن اپنی depeudouec کا ایک احساس، جس سے وہ تقریباً ناواقف تھی درمیان میں حائل تھا اور اُس نے کبھی یہ سوچنے کی جسارت نہ کی تھی، اور خواہش اُس کے اندر مردہ ہو گئی تھی، اکثر ان کے جھگڑے ہوتے تھے، ایک دوسرے کی تقصیروں کو برداشت کرنا اُنہوں نے چھوڑ دیا تھا۔

پھر وہ ایک ٹیوٹوریل سکول میں پڑھانے لگی، بندر پرستھ گرلز کالج کی گریجویٹ، ورمن نے اسکی مخالفت کی تھی لیکن وہ نہ مانی تھی اور سکول مسٹرس ہو گئی تھی۔ اُس نے اپنی

ماتحتی کو کبھی ادراکی طور سے محسوس نہیں کیا تھا۔ لیکن اس آزادی کو اُس نے پورے شعور سے پہچان لیا۔ وہ آزاد تھی اور ایک داخلی رہائی سی محسوس کرتی تھی۔ خود بخود ان دونوں کے درمیان اب جھگڑے کم ہو گئے تھے اور دُوری بڑھ گئی تھی۔

"ریما ——" بستر پر لیٹے ہوئے اُس نے ورمن کی آواز سُنی، لیکن وہ بولی نہیں۔ وہ جاگ نہیں رہی تھی۔ وہ سو بھی نہیں رہی تھی، وہ جواب دینا نہ چاہتی تھی۔ اُسے معلوم تھا ورمن کیا کہے گا۔ وہی جو شام کو کہہ چکا ہے اور اس سے پہلے کئی بار "مجھے تمہارا یہ رویہ پسند نہیں ہے آخر وہ ایسا کیا کرتی ہے، کیا پسند نہیں ہے اُنہیں، پسند، پسند۔ اُن دونوں کی پسند جُدا ہے اُن کے خیالات نہیں ملتے، وہ سوچتی رہی تھی۔ ورمن نے کروٹ بدل لی اور اُس نے ایک آسانی سی محسوس کی۔ اب وہ اپنے جسم کو حرکت دے سکتی تھی، سوتے ہیں کیا آدمی ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا اور اُس نے اپنا بازو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا —— مرد چاہتے ہیں کہ اُن کی غرض پوری ہوتی رہے، دوسرے کا کوئی خیال نہیں، عورتیں دُنیا میں کچھ نہ کریں، عورتیں سینما نہ دیکھیں، عورتیں سمندر کے کنارے نہ جائیں، کیوں، خود غرض مرد —— اچانک اُسے سمندر کے کنارے اُس اجنبی کا خیال آگیا اور اُس نے فوراً ہی اس خیال کو اپنے ذہن سے برخاست کر دیا۔ دیر تک وہ لیٹی رہی، اور اُس کے اُوپر ایک ویرانی کا احساس اُبھرنے لگا۔ جس میں چڑچڑے پن کا بڑا عنصر شامل تھا۔ اُسے زندگی کی بے رنگی پر ہمیشہ غصہ آتا تھا، اس ویرانی کے بارے میں اُس نے سوچا کبھی نہ تھا۔

بہت دیر تک وہ جاگتی رہی، بہت دیر بعد وہ سو گئی۔

دوسرے دن۔

دیر تک وہ سمندر کے کنارے گھومتی رہی۔ ساحل پر آج بھیڑ زیادہ تھی۔ لیکن وہ ایک تنہائی سی محسوس کر رہی تھی۔ کسی چیز کی کمی محسوس ہو رہی تھی اور وہ جانتی نہ تھی کہ یہ کیا ہے سمندر کے کنارے بکھری ہوئی اس بھیڑ سے اُسے ایک علحدگی کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ احساس خلا کا نہ

تھا، بلکہ جیسے وہ ایک وسیع مجمع میں اکیلی ہے اور مجمع کا دائرہ اُس کے گرد تنگ ہے۔ سمندر کی وسعت بھی تنگ معلوم ہوتی تھی، جیسے ذراسی دور پر، بالکل پاس ہی بسیط سمندر کو آسمان نے روک لیا ہو۔ آج مغربی اُفق پر شفق نہیں پھیلی تھی، دن ڈوب گیا تھا لیکن آسمان ویران تھا اور اُس نے سمندر کو روک رکھا تھا۔ کسی چیز کی کمی تھی، یہ بھیڑ اور تنہائی، لیکن وہ بھیڑ سے کنارا کرنا چاہتی تھی اکیلا رہنا چاہتی تھی، سمندر کے کنارے سیر کرنے اکیلی آئی تھی اور پھر یہ تنہائی، اُسے کسی چیز کی ضرورت کا نیم شعوری احساس تھا، کوئی چیز موجود نہ تھی۔

کنارے پر کھڑی ہوئی وہ لہروں کو ساحل کی ریت پر پھیلتے ہوئے دیکھتی رہی۔ لوٹتی ہوئی لہر سے ٹکرا کر پانی کنارے پر پھیل جاتا تھا اور ساحل کی ریت پانی اور اس کے جھاگوں سے چمک اٹھتی تھی۔ اور پھر پانی واپس لوٹ جاتا تھا اور ریت میں جذب ہو جاتا تھا اور ریت کی چمک معدوم ہو جاتی تھی۔ دیر تک وہ یہ تماشا دیکھتی رہی، پھر وہ چند قدم آگے بڑھ آئی، اب وہ لہر کی زد میں تھی غیر شعوری طور پر وہ لہر سے چھوا جانا چاہتی تھی اور آگے بڑھ آئی تھی۔ اور وہ دیکھتی رہی سمندر کی تمام حرکت جیسے اُبھر کر پانی بڑھا آتا تھا۔ جیسے ایک وسیع چادر آب سطح پر پھیلتی آ رہی ہو سمندر کی سطح پر اُس سے اونچی ایک دوسری سطح بنتی جا رہی تھی اور قریب آ رہی تھی، قریب آ رہی تھی اور ــــ اور پھر اچانک وہ ٹکرا گئی اور ایک شور میں بکھر گئی۔ اور پانی اُس کے قدموں میں پھیل گیا۔ سیما کے منہ سے تعجب کی ایک چھوٹی سی آواز نکلی اور وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ پانی غیر متوقع طور پر اُس کے قدموں میں آ گیا تھا، اُس کا شعور اس کے لئے تیار نہ تھا، وہ لہر سے چھو جانا چاہتی تھی لیکن ــــ

واپس جاتا ہوا پانی اب کنارے میں جذب ہو رہا تھا، وہ مڑی اور خشک ریت پر پاؤں کھینچتی ہوئی اُدھر بنچوں کی طرف چلی گئی، ریت اس کی گیلی سینڈلوں اور پاؤں میں چمٹ گئی تھی اور اپنے تصور میں اُسے اس کے کرکرے پن کا احساس ہوتا رہا۔

بنچ کوئی خالی نہ تھا، وہ اُن کے آگے سے گزرتی گئی۔ عورتیں اور مرد، اور صرف عورتیں اور صرف مرد۔ بنچوں پر بیٹھے تھے۔ اور وہ خالی جگہ کی تلاش میں آگے گزرتی گئی، یہ پارسی اپنی

بوڑھی عورت کے ساتھ کسی نوجوان کی طرح بیٹھا تھا، یہ دو لڑکیاں آپس میں باتیں کر رہی ہیں ان کے جوڑوں میں چنبیلی کے سفید پھول تھے، یہ ــــ اوہ، اس بینچ پر وہی کل والا اجنبی نوجوان بیٹھا تھا اور اُس کے برابر کی دونوں سیٹیں خالی پڑی تھیں، لیکن وہ گزر گئی۔ قریب سے گزرتے ہوئے اُس سے سیما کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ جیسے کہتا ہو، کیا تم وہی نہیں ہو جو کل گھنٹہ بھر میرے قریب بیٹھی رہی تھیں۔ اب سیما اُسے پیچھے چھوڑ آئی تھی، وہ یہ فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ اُس کے قریب بیٹھے، ایک جھجک سی محسوس ہوتی تھی، شعور دوئم میں اُسے اس بات کا احساس یا شاید ڈر تھا کہ اُس کے پاس بیٹھنا غیر اہم نہ ہوگا۔ وہ اس اہمیت سے خوفزدہ تھی۔

اخیر تک کوئی بینچ خالی نہ تھا اور وہ اب واپس آ رہی تھی۔ داخلی طور پر اب وہ فیصلہ کر چکی تھی اور سوچ رہی تھی کہ آخر ایک خالی سیٹ پر بیٹھنے میں حرج ہی کیا ہے، اور اُسے کوئی حرج نظر نہ آتا تھا۔ لیکن جب وہ اُس کے قریب آئی تو وہاں رُکنے میں اُسے پھر جھجک محسوس ہوئی، یہ نوجوان اُس کی رُوح میں ایک اہمیت رکھتا تھا، اور اس کی نگاہ خالی سیٹوں پر اٹکتی ہوئی آگے بڑھ گئی، وہ پھر آگے بڑھ گئی، وہ پھر آگے جا رہی تھی کہ نوجوان بینچ پر سے کھڑا ہو گیا۔

"آپ بیٹھئے۔" اُس نے کہا۔ "میں بہت دیر سے بیٹھا ہوا تھا۔ غالباً وہ سیٹ چھوڑ کر جا رہا تھا، بغیر ارادہ کئے ہوئے سیما نے کہا ــ "آپ میری وجہ سے نہ جائیں، میں کوئی اور سیٹ تلاش کر لونگی۔"

"خالی بینچ شاید آپ کو نہ ملے۔" اُس نے گویا طنزیہ سے انداز میں کہا۔ لیکن اُس کے لہجے میں یہ اثر ڈوب گیا تھا۔

"لیکن میں یہ نہیں چاہتی کہ کسی کو اُٹھا دوں۔"

"اور نہ یہ برداشت کر سکتی ہیں کہ کسی کے قریب بیٹھیں۔" سیما نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا، اُس کے ہونٹوں پر ایک بڑی نامعلوم سی مسکراہٹ تھی اور آنکھیں بالکل سنجیدہ

تھیں۔ "تشریف رکھیے۔" اُس نے کہا، اور پھر ــــ "شکریہ۔" سیما سیٹ کی طرف بڑھ چکی تھی، وہ بیٹھ گئی۔

چند لمحوں تک خاموشی رہی، ایک منٹ، دو منٹ ــــ تین منٹ۔ یہ خاموشی سیما کو بے ہنگم سی معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کا یہ ارادہ نہ تھا کہ اُس سے بات کرے لیکن یہ خاموشی ــــ اور چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ اور سیما کی توجہ اُن حالات پر جمی رہی جن میں وہ خود کو محسوس کر رہی تھی۔ یکایک اُس نے کہا ــــ "میں در اصل بڑا ڈھیٹ آدمی ہوں کہ یہاں سے ہٹا نہیں۔ آپ کو شاید یہ امید تو ہو گی کہ میں یہ سیٹ خالی کر دوں۔" اس کے ہونٹوں پر سے ایک نامعلوم سی مسکراہٹ گزر گئی۔

"نہیں تو۔" سیما نے کہا۔

"اوہ۔" اپنے خشک بالوں میں اُنگلیاں گزارتا ہوا وہ مسکرایا۔ "میرا خیال تھا عورتوں کو اس بات کی اُمید ہوتی ہے کہ ہم اُن کے لئے جگہ خالی کر دیں۔"

"شاید ــــ" مختصر طور پر سیما نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ہوتی ہے۔" اُس نے ہے پر زور دیا۔ "لیکن یہ کچھ سراہنے کے قابل بات نہیں۔ میں سمجھتا ہوں جب تک عورتوں کو یہ اُمید رہے گی وہ آزاد نہیں ہو سکتیں۔"

سیما نے اُس کی طرف دیکھا۔ ظاہر تھا کہ وہ گفتگو کو جاری رکھنا چاہتا تھا۔

"کسی دوسرے آدمی سے کچھ اُمید کرنا ہمیشہ خود کو بالواسطہ اُس کا ماتحت بنا دینا ہوتا ہے اور عورتیں ہمیشہ اُمید کرتی رہتی ہیں اور خود کوشش نہیں کرتیں، اُن کے ساتھ صدیوں سے خود کو Passive سمجھنے کی ایک عادت بن گئی ہے، اور یہ عادت اُن کی فطرت کا حصہ بنتی جا رہی ہے۔"

"میرا خیال ہے نیچر نے عورتوں کو Passive بنایا ہے۔" سیما نے کہا۔

"اوہ، نہیں ــــ" اُس نے نہیں کو طول دیتے ہوئے کہا۔ "قدرت اتنی بیوقوف

نہیں ہو سکتی، یہ بے شک صحیح ہے کہ بعض مخصوص حالتوں میں عورتوں کی activity بعد میں شروع ہوتی ہے۔ لیکن قدرت نے عورتوں کو Passive بنایا ہے یہ غلط ہے۔ عورتوں کی Passivity کی وجہ صرف یہ ہے کہ بنیادی خواہشات میں سماج نے ایک ایسا لازمی جو حقیقت میں غیر ضروری ہے تعلق پیدا کر دیا ہے کہ ایک کی تسکین کا انحصار دوسرے پر ہے، اور یہ دوسری چیزیں عورتوں کو کرنے نہیں دی جاتیں اور ایک عورت اُس وقت تک کسی آدمی کے ساتھ نہیں رہ سکتی جب تک اُس کی بیوی نہ بنے۔"

سیما سمندر کی طرف دیکھنے لگی، لیکن اُس کی توجہ کا مرکز گفتگو تھی، بلکہ گفتگو سے بھی زیادہ اپنی توجہ کا مرکز وہ خود تھی اُسکی بے تکلفی سے وہ ایک مخصوص قسم کا نسوانی حجاب محسوس کرنے لگی، لیکن یہ اُسے ناپسند نہ تھا، وہ کہہ رہا تھا — "بنیادی جذبات کے ساتھ ساتھ اقتصادی مسئلہ لگا رہتا ہے اور عورتیں اُس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتیں جب تک وہ اقتصادی طور پر دوسرے کی دست نگر رہے گی۔" اور پھر یکایک رُک کر وہ بولا — "آپ کو شاید عورتوں کی آزادی سے دلچسپی نہیں ؟"

"جی ؟"

"میں پوچھ رہا تھا کہ کیا آپ عورتوں کی آزادی میں دلچسپی نہیں لیتیں ؟ دراصل آپ کو یہ بڑی عجیب سی بات معلوم ہوتی ہوگی کہ چند منٹ کی ملاقات کے بعد میں آپ سے عورتوں کی آزادی کے بارے میں بات کرنے لگا ہوں۔ حقیقت یہ ہے، اور جس کا میں اقبال کر لینا چاہتا ہوں، کہ دراصل میں باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ بمبئی میں پچھلے تین مہینے سے میں نے کسی عورت سے بات نہیں کی اور اس سے اب میں اُکتا گیا ہوں۔" وہ ہنسا، لیکن اُس کا قہقہہ مسکراہٹ سے کچھ ہی زیادہ تھا۔

سیما کے چہرے نے ایک تعجب کی جھلک اوڑھ لی۔

"آپ کو میری اس بے تکلفی پر تعجب ہُوا ہوگا، کہ کم از کم ہونا چاہیئے تھا۔" وہ بولا۔

"لیکن میں نے کہا نہ کہ میں باتیں کرنا چاہتا ہوں، اور عورتوں کی آزادی کے سوا اور بات ہی کیا کہی جا سکتی ہے۔"

"آپ عورتوں کی آزادی کے بارے میں بہت پریشان معلوم ہوتے ہیں۔"

"ہاں، کیونکہ عورتیں اپنی آزادی کے بارے میں پریشان نہیں ہیں۔"

یسما مسکرائی، اب اُس کی گفتگو میں براہِ راست دلچسپی لے رہی تھی، اُس نے کہا۔ "لیکن عورتیں کسی دوسرے کا سہارا چاہتی ہیں۔"

"واقعی؟" اُس نے ایک ہلکے سے طنز سے کہا، سنجیدہ ہو گیا۔ "لیکن سوال چاہنے کا آجاتا ہے۔ چاہنا ایک دوسری بات ہے۔ خواہش ایک مقدس چیز ہے۔ میرا خیال ہے انسان اپنی روح سے جو چاہتا ہے وہ پورا ہونا چاہیئے۔ اگر کوئی شخص خود کو کسی دوسرے آدمی کے سپرد کرنا چاہتا ہے تو اس میں رکاوٹ نہیں ہونی چاہیئے —— سپردگی اُس آدمی کو خوشی اور مسرت اور راحت بخشتی ہے جو خود کو سپرد کرتا ہے اور اُس آدمی کو آرام اور سکھ دیتی ہے جسے سپرد کیا جاتا ہے۔ یہ صرف سپردگی جس پر ایک حسین زندگی کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے، اور اس کے لئے روح کی آزادی کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمارے پاس روحیں نہیں ہیں۔ ہماری روحوں کے دروازوں میں دھات کی تہذیب کے تالے پڑے ہوئے ہیں۔"

اُس کی گفتگو یسما کو متاثر کر رہی تھی۔ وہ اس سے متاثر ہوئی تھی، جیسے اُس کے الفاظ یسما کے ہی ان سوچے خیالات کی گونج ہیں۔ اپنے ہی خیالات کے اظہار کی دلکشی نے اُسے رجھایا تھا اور اُس نے اجنبی کے لئے اپنے دل میں ایک خلوص سا محسوس کیا اور ایک کشش جو واضح نہ تھی، جو یا اُس کے خیالات کی طرف تھی، یا اس کی شخصیت کی، یا اُسکی آواز کی۔ یہ کشش بالکل عجیب تھی اور اس نے خود کو اس کے تاثر میں محسوس کیا۔

"لیکن موجودہ حالات میں عورتیں سہارا نہیں چاہتیں، سہارا چاہنا پڑتا ہے۔ موجودہ

سماجی حالت ہر عورت کو خود کو Prostitute کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ صرف ایک غرض ہوتی ہے، مجبوری، جس کی وجہ سے اُنہیں ایک سہارے کی ضرورت رہتی ہے۔ اس میں سچائی نہیں۔ اور اپنی تہہ میں یہ چاہت بڑا کمینہ پن لئے ہوئے ہے۔"

سیما اس کی اس بات سے متفق نہ تھی، لیکن وہ اسکی مخالفت نہ کر سکی اور بالکل ایک ہپناٹک اثر میں سنتی رہی۔

"اور اس کے لئے عورتیں ذمہ دار نہیں، مرد بھی نہیں۔ یا شاید اس کے لئے دونوں ہی ذمہ دار ہیں۔"

"یا کوئی بھی نہیں ہے۔" سیما نے کہا۔

"نہیں۔ میرا خیال ہے، عورتیں اس کے لئے اتنی ہی مجرم ہیں جتنے مرد، یا شاید مرد زیادہ ہیں۔ کیونکہ اُن کے ہاتھ میں طاقت ہے، لیکن اُنہوں نے طاقت کو ذلیل کر دیا ہے، اور اسکی تقدیس کو کھو دیا ہے۔ عورت فطرتاً مرد کی حفاظت میں رہنا چاہتی ہے لیکن مرد اُسے اپنے قابو میں کرنے کے لئے ذلیل اور کمینے اور غیر فطری ہتھیار استعمال کرتا ہے، اُسے ہر طرح اپنا دست نگر رکھنا چاہتا ہے، اپنی جائداد بنا کر۔ اور اُس نے عورت کی روح کو کھو دیا ہے اور عورت کے جسم سے مطمئن ہے۔"

دیر تک وہ باتیں کرتا رہا اور سیما کو محسوس ہوا کہ وہ ورمن سے کس قدر مختلف ہے۔ صرف ایک بار اُسے اس فرق کا بہت مختصر سا احساس ہوا۔ اور وہ سنتی رہی۔ وہ زیادہ تر خود ہی بولتا رہا تھا۔ سیما کو کچھ کہنے کا موقعہ نہ آتا تھا۔ وہ کہنا بھی نہ چاہتی تھی۔ وہ سننا چاہتی تھی۔ اُس کی گفتگو میں ایک مخصوص دلکشی تھی، اور اسے سنتے ہوئے سیما کو ایک عجیب قسم کی نرمی کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ نرمی اُسکی گفتگو کے ساتھ سیما کے احساس میں پھیل رہی تھی، اور احساس سے نیچے اُتر رہی تھی۔ نرمی کا یہ تاثر ایک ہپناٹک سحر کی مانند تھا اور اُس کے شعور پر قابو پا رہا تھا۔ وہ خود اپنے اُوپر اس سحر کا اثر چاہ رہی تھی، یہ اتنا خوبصورت، اتنا ملائم اور پھر اتنا

غالب تھا۔

دیر تک وہ باتیں کرتا رہا۔ اور اُس سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی سیما نے اپنے اُوپر اس سحر کی ملائمت کو محسوس کیا۔ اور اُس کی گفتگو کی دلکشی نے سیما کو مغلوب کر لیا ہو۔ ہر روز شام کو وہ سیما کو یہاں مل جاتا تھا اور باتیں کرنے کے دوران میں اُس پر ایک ہپناٹک سا اثر رہتا یہ اثر اُس کی آواز میں قدرتی تھا۔ وہ خود کچھ کہے جاتا تھا اور سیما کے بولنے کی انتظار نہ کرتا تھا۔ اور وہ ایک نیم مسحور سی حالت میں سنتی تھی۔ گفتگو کے دوران میں وہ خود کو اس سحر کے تاثر کے سپُرد کر دیتی، اس کے سامنے وہ اپنی طاقت کو کھو دیتی۔ اُس کی موجودگی، اور خصوصاً اس کی گفتگو سے سیما کو اپنے اندر ہپناٹک لہروں کا ایک تسلسل سا محسوس ہوتا تھا۔ جو کچھ وہ کہتا اُس پر وہ یقین نہ بھی کرتی ہو تب بھی وہ خود کو اُس کی آواز کے سامنے کمزور محسوس کرتی، اور اسکی بات کو کاٹنا نہ چاہتی تھی۔ اُس کے سامنے سیما کو اپنے اصلی وجود کا احساس کم رہتا تھا اور اُس کا زیادہ۔ اس کی توجہ نہایت عجیب ڈھنگ سے اُسکی گفتگو میں مدغم رہتی، بلکہ اُس کی گفتگو سے بھی زیادہ کسی اور شے میں۔ وہ بخوبی یہ سمجھنے کی کوشش نہ کرتی تھی کہ وہ کیا کہتا ہے، کسی دوسری شے کے قابو میں اُس کا ذہن صرف اِس بات پر منعطف رہتا کہ وہ کچھ کہہ رہا ہے یہ اُسکی آواز تھی، یا اُس کے کہنے کا ڈھنگ، یا کچھ اور تھا، اُس نے کبھی نہیں پہچانا۔ اس سحر نے اُس کے تحت الشعور پر تسلط کر لیا تھا۔ اُس سے دُور ہونے پر بھی وہ اُس کے اثر میں آنا چاہتی تھی۔ کبھی اِس چاہت کی شکل خواہش کی ہوتی تھی۔ کبھی محض ایک کشش کی تمام دن وہ شام کی انتظار کرتی اور اسے کبھی یہ محسوس نہ ہوتا کہ وہ انتظار کر رہی ہے صرف ایک بے چینی ایک بے کلی سی محسوس ہوتی رہتی۔ ورمن کی بیوی اس انتظار کو اپنی دانست کے دائرے میں داخل کرنا چاہتی تھی، لیکن ــــ

"اب یہ ہر وقت غائب رہنا کیا اختیار کیا ہے تم نے؟" ورمن نے سوال کیا۔

"غائب رہنا؟"

"اور کیا۔ صبح ہوتی ہے سکول چل دیتی ہو۔ شام کو تمہاری سیر نہیں ختم ہوتی معلوم

ہوتا ہے گھر کو صرف سرائے سمجھ رکھا ہے۔"

"میرے باہر جانے سے تمہارا کونسا کام حرج ہوتا ہے۔"

"کام ـــ" ورمن نے چڑ کر کہا ـــ "کام تو بہت کرتی ہو تم۔"

"تو میں صرف کام کرنے کے لئے ہوں۔" سیما نے لوٹاتے ہوئے کہا۔

"نہیں تم صرف سیر کرنے کے لئے ہو!"

"تمہیں میرے ذرا سی دیر شام کو باہر جانے سے کیوں جلن ہوتی ہے۔"

"میں پوچھتا ہوں تم یہ جاتی کہاں ہو۔" ورمن گستاخی سے بولا۔

"تم کیا سمجھتے ہو۔" سیما نے کہا۔

"مجھے کیا پتہ کہاں ماری ماری پھرتی ہو۔ کیا جانے کہاں جاتی ہو۔"

"تمہیں مجھ پر کیا شبہ ہے؟" سیما نے جیسے چوٹ کھا کر پوچھا۔

"بحث مت کرو۔" ورمن نے کہا۔ "مجھے نہ تم پر شبہ ہے نہ تم پر اعتبار ہے۔"

"کیا؟" سیما نے رونی آواز میں کہا۔ لیکن ورمن کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔

ایک لمحے تک سیما ایک عجیب سی ذہنی حالت میں کھڑی رہی۔ اپنے دل کی تہہ میں اُسے خود اپنے اُوپر اعتبار نہ تھا۔ لیکن وہ اسے جاننا نہ چاہتی تھی اور اس وقت ورمن نے اسکی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ اور کتنے تحقیر آمیز انداز میں لیکن ان الفاظ کو اُس نے سچا نہیں سمجھا ورمن کے یہ لفظ اُسے ذلیل معلوم ہوئے، ذلیل اور کمینے اور ایک انتقامی جذبے میں اُس نے سوچا، کہ وہ گھر سے باہر نہیں جائے گی، نہیں جائیگی۔

لیکن اُس نے سکول جانا نہ چھوڑا اور شام کو سیر کرنے جانا چھوڑ دیا، اور تین دن خاموشی میں کٹ گئے، نہ وہ ورمن سے بولی نہ ورمن اُس سے بولا! اور وہ سوچتی رہی ـــ

اِس نو متعارف نوجوان کے متعلق اُس کے ذہن میں بظاہر یہ رشتہ بالکل افلاطونی تھا اُس نے کبھی اُس کے لئے شعوری طور پر جنسی کشش محسوس نہ کی تھی، جو کشش تھی وہ اُسے

جنسی نہ سمجھتی تھی اور سیما نے اُسے اِس قسم کی مخصوص اہمیت نہ دی تھی، لیکن حقیقت میں اب یہ نوجوان اُس کے تمام احساسات کا ذمہ دار تھا اور سیما کی روح اِس ممانعت کے خلاف بغاوت کر رہی تھی، وہ اسے ناحق سمجھتی تھی، جیسے ورمن کو اس طرح منع کرنے کا ادھیکار نہیں ہے۔ لیکن ورمن کو یہ ادھیکار تھا اور وہ اِس امر سے واقف تھی اور زیرِ نفسی طور پر اس ادھیکار کے خلاف باغی ہوتی جا رہی تھی۔ یہ حق کیوں ہے' وہ سوچتی تھی، کیا عورتوں کا جنم گھر کی دیواروں میں پیدا ہو کر وہیں مرجانے کے لئے ہوتا ہے' کیا اُنہیں دنیا میں کچھ دیکھنے کا حق نہیں، اُنہیں کیوں زندگی سے محروم رکھا جاتا ہے۔ اِس ممانعت کے بارے میں وہ ایک عمومی ڈھنگ سے سوچتی رہی لیکن حقیقت میں مرکز وہ خود تھی۔ اُسے ورمن کی شخصیت سے ایک رقابت سی ہو گئی۔ ورمن اور وہ —— وہ کیا ہے، وہ کیا ہے؟ وہ خود کو اکتساب لذت کی محض ایک مشین تصور کرنے لگی، جو ورمن کو لذت بخشتی ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے وہ سوچتی تھی کہ مرد تو ہر قسم کی آزادی کا لطف لیتے ہوئے اپنا دل خوش کرتا ہے۔ اور عورت —— عورت، عورت؟

اور تین دن خاموشی میں گزر گئے۔ چوتھے دن ——

رات کو ورمن نے اُسے منانا چاہا تھا۔ ایک انجکشن دے کر وہ سیما کو اپنا غلام بنائے رکھنا چاہتا تھا۔ ایک انجکشن —— لیکن سیما نے کہہ دیا۔ کہ اُن کے درمیان میاں بیوی کا تعلق نہیں ہے! کیا؟ ورمن کو یقین نہیں آیا۔ مگر پھر ورمن کو یقین آگیا اور وہ سیما کے پاس سے ہٹ گیا، اپنے غصے اور توہین کو ضبط کر کے۔ اُن کے درمیان میاں بیوی کا تعلق نہیں ہے، یعنی، یعنی —— تو پھر اس شادی کا مُکھ ہی کیا ہے۔ لیکن سیما نے ایک رہائی سی محسوس کی! جیسے اُس نے ورمن سے کوئی چیز لے لی ہے' یا ورمن کو کسی چیز سے محروم کر دیا ہے' اُس نے سوچا کہ جب اُنہیں اپنی زندگی میں کوئی کمی محسوس ہوگی تو علم ہوگا کہ ——

خود اس کے لئے میاں بیوی کے اس تعلق میں کوئی دلکشی نہ تھی ورنہ وہ یہ نہ کر سکتی۔ لیکن

اب کیوں وہ اس کی خوشی کا آلہ کار بنے جب وہ اسکی خوشی کی پرواہ نہیں کرتے۔ وہ سوچتی تھی۔ مرد کا یہ فرض ہے کہ وہ عورت کی خوشی کا خیال رکھے۔ وہ خوشی چاہتی تھی۔ اور خوشی مل نہیں رہی تھی۔ اور اپنی اقتصادی آزادی کا جذبہ غیر شعوری طور پر اُسے سہارا دے رہا تھا۔

اور دن گذرتے گئے۔ اُس نے ورمن کے بستر میں شرکت کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ گھر میں Indifferent انداز میں گفتگو کرتے، گفتگو جو لازمی ہوتی تھی۔ وہ اِس سے بچنا نہ چاہتی تھی، چاہتی تھی کہ ان حالات میں جھگڑا بڑھے نہیں اور یہ گفتگو بالکل کاروباری قسم کی ہوتی تھی۔

اُس نے سمندر کے کنارے جانا چھوڑ دیا تھا، اپنی حقیقی خواہشات کو دبایا تھا۔ ورمن نے اُس دن وہ الفاظ کہہ کر اُس کے زیرِ نفسی احساسات پر جنہیں وہ جاننا نہ چاہتی تھی، ایک ناگوار روشنی ڈال دی تھی، اور اُس نے انہیں Frustrate کیا تھا، اور سمندر کے کنارے جانا چھوڑ دیا تھا۔ اور اب ایک ویرانی سی محسوس ہوتی تھی: ویرانی، ویرانی، ویرانی۔ وہ سکول جاتی، لڑکیوں کو پڑھاتی اور ایک اُکتاہٹ سی اُس پر اُمڈی چلی آتی، اس کے گرد ہر شے بنجر ہو گئی تھی، ہر شے نے اپنی دلکشی کھو دی تھی، اُسے محسوس ہوتا کہ وہ زندگی کے لئے ایک ناگوار مشقت کر رہی ہے، وہ گھر میں رہتی اور یہ تین کمرے اُسے بالکل تنہا معلوم ہوتے۔ یہ تین کمرے اس کے مجسم وجود میں سے کوئی چیز زائل ہو گئی تھی، وہ چیز جو انہیں زندہ رکھتی تھی، وہ چیز جو ان کے اور سیما کے درمیان رشتہ تھی۔ اُس کی دلچسپی ان میں سے تفریق ہو گئی تھی۔ ورمن گھر میں ہوتا تو وہ اُس سے الگ الگ رہتی، ورمن کا باہر جانا بھی اُسے پسند نہ آتا، اُسے ورمن سے رقابت بڑھ رہی تھی، لیکن اُس کا اپنا وجود اُس میں اُکتاہٹ پیدا کر رہا تھا۔

پچھلے دنوں وہ بے چینی اور بے کلی جو وہ محسوس کیا کرتی تھی دب گئی تھی۔ اب وہ پھر اُبھرنے لگی، اُسے پھر وہی انتظار کا سا اضطراب محسوس ہوتا تھا، اپنے جذبات پر اسکی

گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی، دن طویل ہو گئے تھے اور دن ڈھلنے کے ساتھ ساتھ وہ پھر اپنے تصور میں خود کو اُس سحر کے زیر اثر محسوس کرنے لگی تھی۔ نیچے، اُس کی روح کی تہہ میں خود کو اس سحر کے سپرد کر دینے کی آرزو تھی۔ وہ اس ویرانی سے اس سحر کے دُھند میں پناہ چاہتی تھی، اُس ملائم، ڈھکے ہوئے، غالب دھند میں۔

اور اپنے اور اک میں وہ ضد بھی خیالات سے جھگڑنے لگی۔ وہ کیوں ان تین کمروں میں محبوس رہے، تمام دنیا اور زندگی سے منقطع ہو کر ان تین کمروں میں۔ اور اب اُس نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اُس کے گھر میں رہنے کا نتیجہ کچھ نہیں، اُس کے گھر پر رہنے سے ورمن پر کوئی اثر نہیں ہوتا، جیسے اس کی ورمن کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے، اسکی برداشت کا کوئی خیال نہیں، کیوں؟ —— وہ اسی کے لئے بنائی گئی ہے، وہ عورت ہے! مگر عورت اس کے لئے کیوں بنائی گئی ہے، یہ مردوں کی خود غرضی ہے، یہ مردوں کی دُنیا ہے۔ وہ گھر سے باہر جانا بند کر دیتی ہے۔ لیکن "اس" پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا، اُس کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اُسے محسوس ہونے لگا کہ اُس نے ورمن سے جنسی علحدگی اختیار کر کے بھی اُس کا کچھ نہیں بگاڑا۔ اُسے اس بات کا تاسف نہ تھا —— وہ کتنی غیر اہم ہے، وہ کیا کر سکتی ہے، وہ کچھ نہیں کر سکتی، وہ صرف ایک عورت ہے،

لیکن اس میں جو عورت تھی وہ ان حالات کے برخلاف ہو گئی۔ وہ کس بات میں ورمن سے کمتر ہے، اگر ہے بھی تو ورمن کو اُسے زندگی سے علحدہ رکھنے کا کیا حق ہے، حق! وہ حق پر مصر تھی، ایک عورت کے حق پر، ایک انسان کے حق پر۔

اور اب یہ ویرانی، جو کسی چیز کی آرزو نہیں ہے، کچھ بھی نہیں ہے، ہر ایک چیز کی دِلکشی مردہ ہو چکی ہے، ہر شے ایک decay میں پڑی ہے۔ ہر ایک شے پر سے خزاں گزر گئی ہے۔ اُسے اپنے اندر خزاں کا ایک کاری احساس ہوتا تھا، وہ اسے اپنے دل میں محسوس کرتی تھی، خزاں۔

اور اپنے گرد خزاں کے اس دائرے سے باہر آنا چاہتی تھی، وہ باہر آ گئی۔

سمندر آج ساحل سے پیچھے چلا گیا تھا۔ دھند لگا ہو چلا تھا، وہ دیر سے آئی تھی، سمندر کا شور فاصلے پر سنائی دیتا تھا اور زیادہ صاف اور زیادہ سنسان تھا۔ فضا میں سے دن کی روشنی غائب ہو رہی تھی اور چاندنی واضح ہوتی جا رہی تھی۔ سیاہ بینچوں کے سہارے سہارے چلتی رہی، سمندر دور چلا گیا تھا اور کنارے پر ٹہلنا بیکار تھا! اور وہ بینچوں کے قریب ٹہلتی رہی اس کونے سے اُدھر تک، ادھر سے اس کونے تک۔ اکثر بینچ خالی پڑے تھے، ایک سناٹا سا تھا، جیسے اُس نے ایک مبالغہ آمیز حد تک گہرا محسوس کیا، یونہی اُسے ایک معمولی سا خیال آیا کہ شاید وہ نوجوان یہاں پھر مل جائے لیکن اپنے دل میں وہ اُس کو ملنا چاہتی تھی، اپنی رُوح میں اُسے ڈھونڈھ رہی تھی، لیکن اکثر بینچ خالی پڑے تھے، سناٹا گہرا ہو رہا تھا ہوا بند تھی اور سمندر دُور چلا گیا تھا۔ ہر شے خود کو اُس سے چھُپاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، گھر سے باہر بھی ہر شے خالی تھی، اور اُس نے اپنے گرد و پیش سے علیحدہ سا ہو جانا چاہا اور وہ بینچ پہ بیٹھ گئی۔ دن کی روشنی چاندنی میں جذب ہو گئی تھی۔ اُس کے قریب چاندنی روشن تھی لیکن اُس سے دُور جاتی ہوئی ملگجی ہوتی گئی تھی، ایک سفید سی دھند چھائی ہوئی تھی، یہ اندھیرا تھا، نہ روشنی تھی، چاند جیسے ایک مُردہ دُنیا پر چمک رہا تھا۔ لیکن اُس نے چاند کو نہیں دیکھا اُس کی روح پر ایک بار سا تھا اور وہ نیچے جا رہی تھی، نیچے وہ ایک عجیب یاس سے ہم آغوش تھی اور ہر شے پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

دیر تک وہ بنچ پر بیٹھی رہی، ایک خیالی دیوانے پن کی سی حالت میں، اور غیر متوجہ شعور میں سمندر کا شور سنتی رہی۔ اب فاصلے پر سمندر کی سمت ایک روشنی چمک رہی تھی۔ سمندر کی موہوم سطح سے ادھر ایک آدمی کا سلیوٹ ہاتھ میں لالٹین لئے آ رہا تھا۔ اُس نے سلہوٹ کی موجودگی کو نظر انداز کر دیا اور لالٹین قریب آتی گئی۔ بیرونی تاریکی سے روشنی اس کے شعور میں گھُسی آ رہی تھی۔ بیرونی تاریکی سے روشنی اُس کے شعور میں گھُستی آئی اور

وہ ہوشیار سی ہوتی گئی۔ آنے والا سلیوٹ اور خشکی پر آ گیا تھا، اس کے ہاتھ میں لٹکتی ہوئی لالٹین ہل رہی تھی، روشنی کنارے کی ریت پر حرکت کر رہی تھی، اور وہ روشنی کا وجود ریت پر سے گزرتا ہوا سڑک پر چلا گیا۔ اور سیما نے جانا کہ وہ یہاں ہے، دھند لکے میں، اور اُسے یہاں سے جانا ہے۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی، اُسے جانا ہے، وہ جانے لگی۔

سمندر سے بازار کو جاتی ہوئی سنسان سڑک پر برقی بتیوں کی قطار چلی گئی تھی، شیڈ میں روشنیاں منجمد ہو گئی تھیں، ساکت، غیر متحرک اور جامد روشنیاں، سڑک پر لائٹ کے دھبے تھے اور اُن کے گرد تاریکی، اندھیرا روشنی سے زیادہ تھا، وہ جا رہی تھی، وہ آ رہا تھا اور روشنی کے دو دھبوں کے درمیان اندھیرے میں وہ ایک دوسرے کے پاس سے گزرے۔

"سیما دیوی۔"

سیما کے سینے میں دِل رُک گیا۔ وہ کھڑی تھی،

وہ اب قریب آ گیا تھا، اُس نے پوچھا — "آپ واپس جا رہی ہیں؟"

سیما کہہ نہ سکی کہ وہ جا رہی ہے، صرف کہہ نہ سکی۔

"جاتے جاتے مجھے شبہ ہوا تھا کہ یہ آپ ہیں۔ آپ تھوڑی دیر ٹھہریں گی نہیں؟"

"چلیئے" سیما نے کہا، ایک تیسری طاقت کے زیر اثر جو نہ اس کی اپنی تھی، نہ اس نوجوان کی۔ اور وہ واپس ساحل پر آ گئے۔

"سمندر کئی روز سے آگے گیا ہوا ہے۔" اُس نے کہا۔ "میرا خیال ہے ہم اس خشکی پر سے گزر کر کنارے پر چلے چلیں۔" اور اُس نے سیما کے جواب کی انتظار نہ کی، جیسے اُسے معلوم ہو کہ وہ انکار نہ کر سکتی، اور سیما اُس کے ساتھ ساتھ چلتی گئی۔ یہ یا اُس کی اپنی طاقت کا فقدان تھا یا اس نوجوان کا اثر، دونوں ہی تھے، اور وہ اُس کے ساتھ ساتھ چلتی گئی۔

"جب سے چاند بڑا ہونا شروع ہوا ہے، میں اب رات کو آتا ہوں۔ آپ نے تو آنا ہی چھوڑ دیا، ایک ہفتے تک مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں روز آپ کا انتظار کرتا ہوں۔ اور

مجھے اپنے اُوپر تعجب تھا کہ میں یہ انتظار کیوں کرتا ہوں۔ میں نے سوچا تھا کہ شاید آپ بمبئی میں نہیں ہیں، لیکن پھر بھی مجھے اُمید تھی کہ آپ یہیں ہیں اور مجھے پھر ملیں گی۔"

مبہوت سی سیما اُس کے ساتھ ساتھ چلتی رہی، وہ کیا کہے، اُس کے اندر کہنے کو کچھ نہیں تھا، لیکن وہ خود کچھ کہتا رہا، اُس کی متکلم موجودگی کا احساس سیما کو پھر ہپناٹائز کرتا جا رہا تھا، وہ پھر اپنی طاقت کو کھو کر کمزور ہو رہی تھی، وہی ایک نرمی کا تاثر اس کے ہوشیار شعور کو ڈھک رہا تھا۔

"آجکل میں رات دیر تک یہیں بیٹھا رہتا ہوں۔ گھر میں مَیں خود کو اکیلا محسوس کرتا ہوں، لیکن یہاں اس سنّاٹے میں مجھے تنہائی محسوس نہیں ہوتی۔ پھیلی ہوئی کھلی جگہ میں اکیلا ہونے پر بھی مجھے وحشت نہیں ہوتی، لیکن گھر میں ہمیشہ ایک جلا وطنی سی محسوس ہوتی ہے۔ کبھی کبھی مجھے تعجب ہوتا ہے کہ عورتیں کس طرح ساری عمر گھروں میں رہ کر گزار دیتی ہیں۔"

"انہیں گھروں میں رہنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔" سیما نے کہا۔

وہ رُک گیا اور سیما جیسے خاموشی میں گرنے لگی، پھر وہ بولا ——— "اگر انسان کی فطرت میں عادت نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔ شاید اُس وقت زندگی کی شکل ہی بدل جاتی، یا یوں کہئے کہ زندگی کی کوئی شکل ہی نہ ہوتی، یا اتنی شکلیں ہوتیں اور وہ اتنی جلدی جلدی بدلتی رہتیں کہ کسی ایک کو زندگی کہنا ناممکن ہو جاتا۔ عادت نے زندگی کو بالکل ساکت کر دیا ہے، ورنہ زندگی اتنی اکتا دینے والی نہ ہوتی، نہ اتنی یکساں، خیال کرو کہ انسان کی فطرت میں اگر عادت نہ ہوتی تو زندگی کی گاڑی کتنی تیز ہو جاتی۔"

وہ ہنس پڑا، لیکن بہت آہستہ سے، جیسے یا تو وہ خود اپنی آواز کے سحر میں ہو، یا اُس سحر سے واقف ہو اور اس کے دائرے سے باہر نہ جاتا ہو۔ جیسے اُسے یہ ڈر ہو کہ ایک اُونچا قہقہہ سحر کے دائرے کی قوس کو توڑ دے گا۔ اُس کے ہنسنے نے سیما کو متحرک سا کر دیا؛ جیسے پانی کی ساکن سطح پر چند بُوندیں پڑ جائیں۔ لیکن پانی کی سطح پھر ساکن ہو گئی تھی، وہ چلتی رہی، وہ کنارے کے قریب آ گئے تھے، یہاں زمین زیادہ تمدار تھی اور نرم زمین پہ پاؤں رکھتے ہوئے

اُسے وہی ایک گداز کا احساس ہو رہا تھا، اُس کا اوراک پگھل رہا تھا اور گردوپیش کا احساس ایک ملائمت کی سی کیفیت لیکر اُس میں سمایا جا رہا تھا۔ سمندر کا شور گداز اور شفقت آمیز تھا جیسے اُس کا ذہن بہت ملائم ربڑ کا بنا ہوا ہو اور سمندر ربڑ کے ساحل سے ٹکرا رہا ہو۔

وہ کنارے پر پہنچ گئے۔

یہاں تک آتے آتے وہ خاموش ہو گیا تھا، لیکن اُس کی خاموشی عجیب تھی، کسی دوسری شے سے حاملہ تھی۔ چپ ہو کر وہ کنارے پر سمندر کے جھاگوں کو پھیلتا ہوا دیکھتا رہا، جن کی سفیدی چاند کی روشنی میں نکھر جاتی تھی اور اُسکی آنکھیں آگے، آگے، ساحل کے کنارے کنارے ان جھاگوں کو دیکھتی رہیں۔ لہر لہر سے ٹکراتی تھی اور کنارے پر جھاگ بکھیر دیتی تھی، صرف ان سمندری جھاگوں کو چاندنی نے سفید کر دیا تھا اور باقی ہر شے دھندلی تھی۔ وہ کچھ اور سوچ رہا تھا، ان جھاگوں سے الگ کچھ اور، اور سیما اپنی حالت سے ناواقف اُس کے قریب کھڑی تھی، وہ اُس کے پاس تھا اور ہر شے ساکن ہو گئی، لیکن اس سکون سے نیچے، یا اس سکون کے پار ایک دوسرا متحرک احساس تھا اور اس احساس نے سیما کو ڈھک لیا تھا، وہ اس احساس کے تحت میں کھڑی رہی، جیسے عمیق، عمیق، روح کی عمیق گہرائی میں وہ کسی چیز کی انتظار کر رہی ہو۔ وہ کسی چیز کی انتظار کر رہی تھی۔

"آپ بیٹھیں گی؟" اُس نے پوچھا، اور کنارے سے ہٹ کر ریت پر اپنا کوٹ بچھا دیا۔

"بیٹھ جاؤ" اُس نے کہا، اُس کی آواز میں دور دراز تحکم کی ایک طاقت تھی اور سیما بیٹھ گئی، اور وہ خود بھی بیٹھ گیا۔ سیما اپنی آواز سے محروم تھی۔ وہ کچھ چاہ رہی تھی اور اپنی روح میں اس سے ڈر بھی رہی تھی اور بولنے کی طاقت سے محروم ہو گئی تھی۔ وہ عجیب ڈھنگ سے خاموش تھا اسکی حاملہ خاموشی، خاموشی، کائنات میں جو صوتی حرکت تھی وہ سیما کی توجہ کے دائرے سے باہر ہو گئی تھی۔ پھر آہستہ سے اُس نے سیما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور سیما نے ایسا ہونے دیا، وہ جیسے پیار سے اُس کی ہتھیلی پر اپنی اُنگلی سے لکیریں سی بنا رہا تھا، صلیب کے

سے نشان، وہ کچھ کہہ رہا تھا، سیما سُن رہی تھی، لیکن وہ سن نہیں رہی تھی، اُسے معلوم نہ تھا۔ وہ کیا کہہ رہا ہے، لیکن وہ کچھ کہہ رہا تھا اور سیما کو صرف اُس کی آواز کا احساس تھا، بلکہ اس سے بھی آگے صرف اس آواز کے تاثر کا، اور اس میں الفاظ نہیں تھے، الفاظ سے جُدا وہ صرف اس سحر کے زیرِ اثر تھی، اور ہاتھ کا یہ لمس ایک منزل تھی، یہ جیسے اُس سحر کی ایک مادی صورت تھی جس کے سپرد وہ خود کو کر دینا چاہتی تھی، یہ اُس سحر اور سیما کے درمیان ایک رشتہ تھا، پھر اُس کا بازو سیما کی کمر کے گرد آ گیا اور سیما نے روکا نہیں، وہ اپنی عملی طاقت سے مستعفی ہو گئی اور اُس کے بازوؤں کا دباؤ سیما کو قریب لاتا گیا، وہ سحر اُسے چھو رہا تھا، سحر اُسے اپنے آغوش میں لے رہا تھا، وہ آغوش میں آ گئی۔ اُس کے جسم کا ہر عضو ڈھیلا ہوتا گیا۔ اُس کے تمام وجود نے خود کو چھوڑ دیا، اور سیما اُس کے آغوش میں پڑی رہی وہ اگر اُسے چھوڑ دیتا تو وہ گر پڑتی، لیکن وہ سیما کو اپنے بازوؤں میں لئے رہا اور خاموشی کے لمحے دھڑکنوں میں جذب ہوتے گئے۔ اور سیما نے اُس کے ہاتھ کو اپنے سینے پر محسوس کیا، جیسے وہ اپنے ہاتھ سے ایک بلی کی ملائم سمور کو برش کر رہا ہو۔ سیما کی تمام موہوم توجہ اپنے سینے پر سمٹ آئی، وہ اپنے آپ سے غافل تھی، اُس سے بھی غافل تھی، ——— ———، اُسے اپنے سینے کا احساس تھا، صرف اس لمس کا جو اُس کے سینے اور اُس سحر کے درمیان تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اُس کے سینے پر ہاتھ پھیر رہا تھا، اُس کی چھاتی کو اپنی انگلیوں کے نرم دباؤ سے محسوس کر رہا تھا، وہ غافل تھی، اور اُس کے لب سیما کے لبوں پر رکھے تھے اور وہ غافل تھی ———

جب وہ گھر پہونچی تو اب تک وہ اس سحر کے اثر میں مبتلا تھی، اُس کی روح کو چھید کر کوئی چیز اُس کے اندر داخل ہو گئی تھی، اور اس نے اُسے لاعمل اور Submissive کر دیا تھا۔ اُس نے اپنے شعور کو اور اپنے عمل کو دوسرے ہاتھوں میں سونپ دیا تھا۔ اُن ہاتھوں کی

طاقت۔ اُس میں بہت بہت، اِس سے بہت زیادہ کچھ تھا جس کے خلاف وہ کھڑی رہ سکتی تھی۔ اور اُس نے خود کو فیل کر دیا تھا اور ابھی تک اِس سحر کے غالب اثر میں مبتلا تھی۔

لیکن اب مکان کا دروازہ بند تھا۔ بند دروازے کے آگے کھڑے ہوئے اُسے محسوس ہوا کہ دیر ہوگئی ہے، دیر ہوگئی تھی۔ اور دیر کا احساس اُسے پورے شعور کی ذلیل حالت میں لاتا گیا —— گررر گررر، وہ گھنٹی بجا رہی تھی، اور گھنٹی کی آواز اُس کی روح کو جھنجوڑ رہی تھی، نہایت عجیب ڈھنگ سے اُسے خوفزدہ کر رہی تھی، گررر گررر، کوئی نہیں بولا، دیر ہوگئی تھی، سب سو گئے تھے اور وہ گھر کے باہر کھڑی تھی، ایک تقصیر کا سا احساس لئے ہوئے خوفزدہ سی۔

گررر گررر، گررر گررر، گررر گررر ——

کوئی آ رہا تھا

دروازہ کھُل گیا۔ ورمن اندر کھڑا تھا۔ وہ ورمن کا سامنا نہ کر سکی، بالکل ایک قصوروار ڈھنگ سے وہ اندر آگئی۔ ورمن مڑ گیا تھا اور اندر آکے سیما نے دروازہ بند کر لیا، بالکل آہستہ سے کہ شور نہ ہو، وہ آواز سے خوفزدہ تھی اور اچانک کلاک نے گھنٹہ بجایا اور وہ چونک پڑی۔ ایک، دو، تین،..... کلاک گیارہ کے گھنٹے بجاتا رہا اور وہ گھنٹوں کی آواز پر قدم رکھتی ہوئی اندر چلی گئی۔ گیارہ بج گئے تھے۔

"کہاں تھیں؟" ورمن نے سنجیدہ درشتی سے پوچھا۔

"سمندر کے کنارے۔" سیما نے آہستہ سے جواب دیا۔

"وہاں نہیں تھیں تم، میں خود وہاں دیکھ آیا ہوں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کہاں تھیں؟"

"وہیں تھی۔" اُس کی آواز قصوروار تھی۔

"جھوٹ بولتی ہو۔ مجھے تم پہ بالکل یقین نہیں ہے۔ تمہارے منہ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تم۔ کہاں تھیں تم؟ تمہیں نہ اپنی عزت کا خیال ہے نہ میری، یہ رات کے گیارہ بجے تم سمندر کے کنارے

تھیں، شرم نہیں آتی جھوٹ بولتے ہوئے، کل سے نہ تم سمندر کے کنارے جا سکتی ہو، نہ کہیں اور، تمہیں جہاں جانا ہے میرے ساتھ جاؤ۔"

"کیوں؟" سیما نے حفاظتِ نفس کے سے جذبے سے کہا۔

"کیونکہ میں جانتا ہوں تم کیا کرنا چاہتی ہو اور میں تمہیں اپنے چہرے پر سیاہی نہیں پوتنے دونگا کل سے تمہارا اسکول جانا بند ہے، تم کہیں اکیلی نہیں جا سکتیں!"

"لیکن میں خود اپنے آپ کو سپورٹ کرنا چاہتی ہوں، میں تم سے کچھ نہیں چاہتی، کچھ نہیں چاہتی۔"

"تم میری بیوی ہو۔" ورمن نے زور سے کہا۔

اور الفاظ براہِ راست سیما کے لاشعور سے آئے ——

"لیکن میں اُس سے محبت کرتی ہوں، محبت کرتی ہوں، محبت کرتی ہوں ——"

"سیما!"

اور اُس نے اپنے ہاتھوں میں منہ چھپا لیا اور رونے لگی۔

مخمور جالندھری

کچھ تو سُنو!!

سالہا سال سے گھُلتا ہے فضا میں زہر اب
دُور و نزدیک سے آوازیں چلی آتی ہیں
تلخیٔ زیست کا پٹتا ہے ڈھنڈورا جن میں

سرِ راہ پھیلے ہوئے دامنِ تذلیل و طلب
"بھوکے محتاج کی حالت پہ ترس کھا بابا!!"
راستہ روکے سرِ شام انوکھے تاجر
"کیا کوئی مال، نیا کورا دکھاؤں صاحب"
دیو قد، رستم و سہراب بدن، پیکِ اجل
"سود اِتی لے گا، خو ہم رُپی پر لے گا"
شغل و تفریح کے رنگین سے دامِ تزویر
"دس روپے پتّے ذرا پھینٹ تو تِگّی پھینکو"
ہر طرح لیتی ہوئی دادِ عروسِ جدّت
"مرغ اور گولڈ رِبن، سب کے ہوئے سات روپے"
روحِ افگارِ غلامانہ تفاخر کی نمود
"ڈیوڑھا درجہ ہے کہاں بھاگے چلے آتے ہو"

مزدِ غیّور میں آمیزشِ دریوزہ گری
"اور ایک آنہ دو سرکار گراں ہے گندم"
ذلّت آموز، تواں سوز گھروں کے مکتب
"ہوّا آجائے گا، بستر میں دبک کے سو جاؤ"
مفلسی، فاقہ کشی، قابلِ تعذیب و سزا
"چور نوکر ہو، نکل جاؤ، نہ آنا کل سے"
ہر دکاں جیب کترنے کا حسیں ہتھکنڈہ
"ادھر سے تین روپے آپ سے دو لے لیں گے"
آمریّت کا ستم خانہ حکومت گھر کی
"بہو۔ کیوں ہاتھ پہ پھر ہاتھ دھرے بیٹھی ہو"

دور و نزدیک سے آوازیں چلی آتی ہیں
تلخیٔ زیست کا پٹتا ہے ڈھنڈورا جن میں

ہاجرہ مسرور

کُتّے

"لے ـــ لے ـــ دھت ـــ" دعوت بھی اور دھتکار بھی۔ بڑی عجیب سی حرکت ہے نا؟ اور یہ حرکت کرتا ہے للو حلوائی۔ اسے جہاں کوئی کتا دکان کیطرف منہ اٹھائے دکھائی دیتا ہے۔ بس وہ بیٹھے ہی بیٹھے پیچھے کیطرف سرک سرک کر پوری طاقت سے دھتکارتے ہوئے باسی تباسی مٹھائیاں جو خاص اسی مقصد کے لئے الگ تھالی میں پڑی رہتی ہیں۔ ذرا ذرا اٹھا کر کتّے کے سامنے پھینکنے لگتا ہے اور یہ حرکت کرتے ہوئے اسکی کچھ عجیب سی حالت ہو جاتی ہے۔ دھتکارنے کے زور میں اسکی گود میں رکھی ہوئی توند اس طرح متزلزل ہو جاتی کہ دیکھنے والے ہنسے بغیر نہ رہ سکتے۔ لیکن ہنسنے والوں کا کیا؟ سمجھیں نہ بوجھیں کھیسیں نکال دینے سے مطلب؟ کچھ زیادہ دماغ لڑایا تو یہ کہ للو کا دماغ چل گیا ہے۔ جبھی تو کتوں کو مٹھائیاں کھلاتا ہے۔ ہونہہ! کوئی اس کے دل سے پوچھے۔ سڑک پر پڑے ہوئے ان کتّوں کی اہمیّت کو۔ دیکھنے میں تو وہ کتّے ہیں۔ بھوکے، مرچھلے۔ جو ذرا دھمکائے سے کیں کیں کر کے ادھر اُدھر دبک کر اپنی اُبھری ہوئی پسلیوں کی دھونکنیوں کی

رفتار ذرا تیز کر دیتے ہیں مگر ان کتوں کا بھوک سے مرجھلا پن اور دبکنا ہی تو للّو کو کسی خوفناک اقدام کا پیش خیمہ معلوم ہوتا ہے —

بات کچھ یوں تھی —

شہر کے سب سے زیادہ عجیب لیکن اہم دو منزلہ بازار میں للّو کی دوکان اپنے سر پر اور آس پاس کئی بہت اونچی دکانیں رکھنے کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ دن بھر تو خیر وہ اچھی طرح دوکان لگاتا ہی نہیں تھا۔ لیکن جیسے ہی دھوپ ڈھلتی اور دو منزلوں پر سجی ہوئی دوکانوں میں ہر قسم کی عورتوں کو چھجّوں کے شوکیس میں رکھے دیکھتا تو اس کے بھاری بھرکم جسم میں ایسی چُستی آجاتی کہ جھپٹ جھپٹ کر کوٹھری سے مٹھائیوں کے تھال نکال نکال کر پتیل کے پتّر سے منڈھے ہوئے لکڑی کے تختے پر سجانے لگتا۔ رنگ برنگی چاندی کے ورقوں سے ڈھکی ہوئی مٹھائیاں — کہ دیکھ کر منہ میں پانی بھر آئے — مگر کھا کر —؟ دکان کے سامنے ہی لکڑی کی پرانی سیاہ تختی پر لکھا ہے۔ "خالص گھی کی عمدہ مٹھائیاں" شاید یہ اس وقت کی بات ہوگی جب اس تختی کے حروف دور سے چمکتے ہوں گے۔ اب تو اس کے حروف جیسے جیسے دھندلے پڑتے جاتے تھے ویسے ویسے خالص گھی کی عمدہ مٹھائیاں خواب ہوتی جا رہی تھیں۔ آس پاس والے دیکھتے کہ اس تختی کی چوٹ پر اسی جگہ ٹھاٹھ سے بناسپتی گھی کے کنستر پر کنستر کھول کر بڑے سے بڑے کڑھاؤ میں اوندھا دئے جاتے —۔ سڑے بُسے کُسڑیاں لگے میدے، کھٹے کھوئے اور سستے مال مسالے کی بنی ہوئی مٹھائیاں مزے سے تل دی جاتیں لیکن دیکھنے والے چوں نہ کرتے — بھلا کوئی کتنے دانت منہ میں رکھ کر کہتا۔ یہاں تو سبھی للّو کی مٹھائیوں جیسا حال اپنا بھی پاتے — ہاں تو بازار سجتے ہی للّو کی دکان بھی سج جاتی۔ بے فکرے گاہکوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں سمٹی سکڑی اور بل کھاتی ہوئی سڑک پر پھسل کر اس طرح گشت کرنے لگتیں جیسے رات بھر ٹاپے تلے بند رہنے والی مرغیاں صبح چگنے کو چھوڑ دی جائیں۔ اس وقت سے بس للّو کی دکان کے آگے خاصا جمگھٹ سا لگ جاتا بکری تو خیر بہت نہ ہوتی کیونکہ گاہک دن کی

روشنی میں آبنوالے ہوتے۔ یوں ہی بس آنے دو آنے کی چیز خریدی اور دکان کے تختے سے بھڑ کر دس پانچ منٹ کو کھڑے ہو گئے۔ کیونکہ سامنے کی اُونچی دکان سچ مچ بڑی اونچی تھی —— اتنی اونچی کہ ایسے ویسے لوگوں کی ہمت نہ پڑتی اُوپر جانے کی۔ لیکن نیچے والے پھر بھی اوپر ہی دیکھتے —— سنتے ہیں قطب کی لاٹ بڑی اونچی ہے۔ لیکن بغیر دیکھے تو نہیں معلوم ہو سکتا کہ واقعی اُونچی ہے۔ اچھے ہٹے کٹے لوگ تو خیر اسکی بلندی کا اندازہ سیکڑوں سیڑھیاں طے کر کے لگا لیتے ہیں۔ لیکن جن کی ٹانگوں میں اتنا دم نہیں ہوتا۔ وہ نیچے سے ہی کھڑے ہو کر اسکی بلندی کو دیکھنے کے لئے منہ اٹھا دیتے ہیں۔ اور اٹھاتے ہی چلے جاتے ہیں۔ چاہے سر سے ٹوپی ہی کیوں نہ گر جائے گردن پیٹھ سے کیوں نہ جا لگے۔ پر حسرت تو نہیں رہے گی دیکھنے کی؟ اور پھر سچی بات تو یہ ہے کہ اونچائی پر نظروں کی چڑھائی کر لی یہی بہت ہے۔ لیکن للّو اس قسم کے گاہکوں سے کچھ چڑ جایا کرتا۔ کوئی کہے اس کا جاتا ہی کیا تھا بھلا۔ آنے دو آنے کر کے روپوں کا حساب پڑ جاتا تھا اسے۔ خیر وہ بات تو تھی ہی لیکن یہ دیکھ کر کہ للّو کے تن بدن میں سچ مچ آنچ اٹھنے لگتی کہ کمبخت کتّے صرف اسکی مٹھائیوں کے لالچ میں اسکی دوکان کے سامنے جمع ہو جاتے، سوکھے، کھجلی کے مارے گھناؤنے کتّے، محض اسکی مٹھائیوں کے شیدائی دبنا دلانا کچھ نہیں —— اپنی امر پھلکی آنکھیں اُبالے، لال لال لکاسی زبانیں لٹر بڑاتے بس سجی ہوئی مٹھائیوں کو ہی تاکتے رہتے۔ اور للّو کا مارے جھنجھلاہٹ کے رنگ بدلنے لگتا۔ کچھ بس نہ چلتا تو زور زور سے دھتکارنے لگتا۔" دھت —— دھت —— کمبخت نہ کسی کام کے نہ کاج کے"۔ رات کی رکھوالی کی کہو تو اس بازار میں رات ہی دن تھا۔ چوری چکاری کا امکان نہیں۔ اور اگر دن کی بات لو تو انگریزی راج کس کی ہمت جو دکان کے قریب بھی پھٹکے۔ خواہ وہ اور دوسرے تمام دکاندار دن بھر اونگھتے ہی کیوں نہ ہیں۔ پھر اسے فائدہ ہی کیا تھا ان کتّوں سے؟ سوائے نقصان کی بعض سفید پوش کتّوں کو دوکان کے سامنے جمع دیکھ کر ذرا خوف ہی تو کھاتے۔ اور بھئی ان سب باتوں کے علاوہ وہ تھا مٹھائیوں کا مالک۔ اور مٹھائیاں رکھتی تھیں قیمت۔ کوئی سستی کوئی مہنگی۔ مگر ہر ایک کی کچھ نہ کچھ قیمت ضرور تھی

یہ نہیں کہ کوئی آتا اور مفت مزا لیکر چلتا بنتا — لیکن وہ مرجھلے کتے اپنی عمر یں اسی بازار میں گذارنے کے باوجود قیمت والی بات سمجھتے ہی نہ تھے۔ بس دکان کے سامنے ہی منڈلایا کرتے۔ دھنسے ہوئے پیٹ دھونکنی کی طرح پھولتے پچکتے۔ ساری جان سے کپکپا کپکپا کر زبان کی نوک سے رال کا تار باندھا کرتے اور للو تھا کہ آپ ہی آپ سلگتا۔ عاجز تھا غریب۔ ارے یہ کتے — وہ دانت بھینچ کر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتا۔ مگر وہ کتے تو کتے —

سورج غروب ہوتے ہی بازار کی رونق چوگنی ہو جاتی۔ بجلی کی تیز روشنی میں مٹھائیوں پہ چپکے ہوئے چاندی کے ورق اور چھتوں کے شوکیس میں رکھی عورتوں کے چہروں پہ جما ہوا پوڈر کا غبار ایسا بھلا لگتا کہ بس۔ بازار میں گاہک امنڈ پڑتے۔ قسم قسم کے گاہک۔ موٹروں پر اتر کر آنیوالے، پیدل رینگ کر چلنے والے، جیبوں میں نوٹوں کی گڈیاں رکھنے والے اور مٹھی میں چند پیسے دبا کر کسی کسی نچلی دکان پر خریداری کے بہانے کھڑے ہونے والے۔ سب کے پاس قیمت ضرور ہوتی۔ چاہے وہ اونچی دکان پہ پہنچنے کے لئے لفٹ کا کام دیتی ہو یا ایک پان اور ایک سگریٹ خرید کر گھنٹوں دکان پر اڈا جمانے کے لئے ہو۔ مگر اس بازار کے گاہکوں کی ایک قسم اور بھی۔ جسم پہ لتے لگے ہیں، ہڈیوں کا پنجر ہو رہے ہیں، پلے پھوٹی کوڑی نہیں اور منھ اٹھائے دکانوں کے چکر کاٹ رہے ہیں۔ جیسے کہہ رہے ہوں ہم بھی ضرور تمند ہیں۔ بیوقوف کہیں کے جب پھرتے پھرتے تھک جاتے تو پھر کسی نچلی دکان سے لگ کر رال کے گھونٹ کے گھونٹ حلق سے اتارتے۔ اور اکثر تو ایسا ہوتا کہ للو کی دکان کو اڈا بنا کر اونچائیاں ناپی جاتیں۔ اس پر للو کو کتوں کے ساتھ ساتھ ایسے لوگوں پر بھی غصہ آنے لگتا۔ شرم نہیں آتی۔ چلے ہیں خالی جیب عشق لڑانے۔ وہی مثل کہ جسم پہ نہیں لتا پان کھائیں البتہ۔ آخر یہ دکان سجا کر بیٹھنے والی عورتیں۔ پیٹ ظالم ان کا مالک ہے۔ پیٹ جسم بیچتا ہے جب کہیں خود کو پاٹتا ہے۔ اور پھر اسے اونچے دکانداروں پہ رحم آنے لگتا۔ بالکل ویسے ہی جیسے کتوں کو جمع دیکھ کر اپنے اوپر آیا کرتا تھا۔

اکثر تو وہ کتوں کی سرشت رکھنے والے کتوں کی طرح کیں کیں تو نہیں ہاں دانت دبا کر سی سی

کرتے ہوئے ایک دوسرے سے کہنے لگتے۔ "دیکھو ذرا ادھر والی ــــ کو" وہ سامنے والی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کوئی موٹی سی گالی ضرور بکتے۔ اور جیسے وہ گالی سیدھی للّو کے کلیجے میں برچھی بن کر اُتر جاتی۔ وہ اپنی مٹھائیوں پر نظر جما کر کان اس طرف لگا دیتا۔ اور ادھر سے پڑتیں گالیاں اوپر بیٹھنے والیوں کو ــــ ایسی ہے ویسی ہے، کھوسٹ ہے، نکٹی ہے، چپٹی ہے، ــــ اور للّو اپنے کلیجے پر ہاتھ رکھ کر سوچتا، انگور کھٹے ہیں ــــ اگر مٹھائیوں کو تاکنے والے کتّوں کی سوں سوں اور کیں کیں کا کچھ مفہوم نکالا جا سکے تو یقیناً یہی ہوگا۔ مانا کہ مٹھائیاں دراصل ویسی نہیں ہوتیں جیسی کہ دکھائی دیتی ہیں پھر بھی ان کے بنانے میں کچھ تو لاگت آتی ہی ہوگی۔ مزا بہت اچھا نہ سہی۔ مگر وقت پر انہیں کھا کر بھوک کی شدّت تو کس قدر کم ہو سکتی تھی ــــ بس اوپر نیچے کا یہی معاملہ تھا۔ ورنہ سرے سے یہ بازار ہی نہ ہوتا اور نہ کتّے۔

"ذرا بھئی، سیر بھر گلاب جامنیں تو دینا"۔ کوئی بڑے ہی شوقین مزاج لگنے والے گاہک سینہ تانے دوکان پر آ پہنچتے۔ اور للّو کو ایسا محسوس ہوتا جیسے ان کی آمد نے اس کے خیالات کی تائید کر دی ہو۔ لسّریاں لگے میدے، کھٹّے کھوئے اور بناسپتی گھی سے سینچتی ہوئی گلاب جامنیں تولا کر وہ غرور سے پھول جاتا۔ اور وہ شوقین گاہک جیب کھنکھناتے، خراب گلاب جامنیں لئے کسی نہ کسی زینے پر دندناتے، کسی ردّی لیکن سجی سجائی عورت کے پاس پہنچ جاتے۔ اور للّو فاتحانہ شان سے چلّا اُٹھتا۔ "دھت دھت ــــ سالے کتّے ــــ" کتّے دم دبا کر گردن جھکائے چپکے سے سرک جاتے اور پاس جھنجی کوڑی نہ رکھنے والے بڑی کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کسی خالی چھجے پر للچائی نظریں ڈال کر ادھر اُدھر ہو جاتے۔ اب للّو کو آپ ہی آپ ہنسی آنے لگتی۔ سارے جسم میں زلزلہ سا آ جاتا اور وہ بڑے پیار سے اپنی چمچاتی ہوئی مٹھائیوں کے ننھے منّے ٹیلوں کو دیکھ کر سوچنے لگتا۔ بھلا اس سے فائدہ ہی کیا ــــ؟ جانتے بوجھتے اڑے رہتے ہیں کمبخت ــــ بگلوں کی سمجھ میں آتا ہی نہیں کہ یہاں قیمت ہی سب کچھ ہے۔ ضرورت کچھ نہیں۔ یہاں سیکڑوں ایسے ہیں جو آئے دن سیروں مٹھائیاں ٹھونستے ہیں۔ پھر چاہے بد ہضمی کیوں نہ ہو جائے۔ یہ کتّے کیوں نہ بھریں؟ ہر جگہ گندگی کیوں نہ پھیلاتے پھریں۔ لیکن

کسی کو ان پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا کیونکہ وہ قیمت ادا کرتے ہیں۔ اور ایک یہ ہیں پگلے۔ کوئی کیوں مفت ان کی ضرورت کا لحاظ کرے؟ چاہے انہیں عمر بھر مٹھائیوں کے لئے ترسنا اور بلکنا کیوں نہ پڑے۔ قیمت نہیں تو کچھ نہیں ـــــ اور للّو یہ سب سوچ کر ٹھیٹ دکاندار بنجاتا۔ اسے ذرہ برابر بھی کتّوں سے ہمدردی نہ رہتی۔ گھوڑا گھاس سے رشتہ محبت جوڑے تو بیچارہ کھائے کیا۔

لیکن ایک دن ـــــ

بازار حسب معمول ایک بڑی سی گڑ کی بھیلی کی طرح اپنی جگہ پر تھا۔ گاہک مکھیوں اور چیونٹیوں کی طرح اس پر چڑھائی کئے ہوئے تھے۔ اور للّو اس دن کتّوں کو چھڑی دکھا دکھا کر رعب گانٹھ رہا تھا کہ اتنے میں اس نے اپنے سامنے کی اونچی دکان پر چند ہولناک چیخیں سنیں۔ گود میں پڑی ہوئی توند کو اچھال کر حیرت سے کھڑا ہوگیا۔ اور سڑک پر تو جیسے غدر سا پڑ گیا۔ جسے دیکھو بے تحاشہ اسی زینے پر چڑھا جا رہا ہے۔ کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ ـــــ جواب میں اسی اونچی دکان کی دو عورتوں میں سے ایک چھجے پر آکر سینہ کوٹتے ہوئے چلّانے لگی۔

"ہائے مار ڈالا ـــــ زہرہ کے چھری بھونک دی ـــــ ہائے ـــــ ہائے ـــــ"

اوپر پہنچنے والوں میں سے کسی نے ازراہ ہمدردی زہرہ کی بہن کو کمر سے پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا۔ لیکن وہ تھی کہ جیسے چلا چلا کر جان دے ڈالے گی ـــــ للّو کا دل چاہا کہ وہ اوپر جاکر پوری حالت معلوم کرے اور کچھ نہیں تو زہرہ کی بہن سلطانہ کو تسلّی ہی دے آئے ـــــ بیچاری کیسی بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ لیکن دوکان کس پر چھوڑے؟ یہ سوچ کر وہ دل مار کر اپنی جگہ پر جما رہا ـــــ

ذرا دیر بعد خون میں لت پت زہرہ ہاتھوں ہاتھ سڑک پر اتاری گئی اور اس کے پیچھے ایک مریل سے وحشی آدمی کو جسے کئی مضبوط جوانوں نے دبوچ رکھا تھا ـــــ بجلی کی تیز روشنی میں زہرہ کے سینے سے ابلتا ہوا خون اور اس آدمی کی آنکھیں اس طرح چمک رہی تھیں۔ للّو کا جسم مارے خوف کے سرد پڑ گیا۔ اسے یاد پڑا کہ اس مریل آدمی کو اس نے سیکڑوں دفعہ اپنے دوکان سے لگے دیکھا تھا جو جیب میں کوڑی نہ رکھنے والے گاہکوں

کے گھر وہ ہیں سے تھا۔

سلطانہ رو رو کر کہہ رہی تھی "ارے —— یہ آیا۔ تو زہرہ باجی سے بلا پیسے کوڑی کے چمبڑ کرنے لگا —— جس پہ باجی اسے کوٹھے سے اُتارنے لگیں۔ بس اس نے کچھ کہا نہ سنا جھٹ چھری نکال کر ماردی —— ہے —— میری بہن —— بیچاری ——"

زہرہ خوفناک آہستگی سے کراہ رہی تھی اور وہ مریل سا آدمی آنکھیں پھاڑے کڑیل جوانوں کی بانہوں میں جکڑا ادھبی ادھبی سانسیں لے رہا تھا —— مجمع میں چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں اور اس سرے سے اس سرے تک بیٹھنے والے تاجر سہمے ہوئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد زہرہ کو اسپتال اور اس مریل آدمی کو پولیس چوکی لیجایا گیا۔ مجمع چھٹا تو بازار میں جیسے الّو بول گیا۔ ہر شخص چپ —— للّو تو جیسا بیٹھا تھا ویسا ہی بیٹھا رہ گیا۔ نہ اس نے کسی سے کچھ پوچھا نہ کسی سے ہمدردی ظاہر کی —— بالکل گم سُم۔ "یہ ننگے بھوکے آدمی اور یہ ہمت ——" وہ سوچ سوچ کر حیرت میں غرق ہوا جا رہا تھا۔ کہ سنّاٹے میں چند کتّے پھر اُسکی دکان کے سامنے سڑک پہ جمع ہوگئے مُرجھلے بھوکے، دھنسے ہوئے پیٹوں والے کُتّے —— اور للّو کا دماغ تھکنے لگا۔ اسے بس ایسا معلوم ہوا کہ اب ان کتوں سے دکان پر جست کر کے اسے چبایا، اس کے خون کو لال لال کھردری زبانوں سے چاٹا —— روشنی میں بہت سی چمکتی ہوئی بھوکی آنکھیں ——!

"دھت۔ دھت۔" وہ کمزور آواز میں چلّایا۔ لیکن کتّے نہ سرکے۔ یہ کوئی خلافِ معمول بات نہ تھی۔ لیکن آج کتّوں کی ہٹ سے بڑی ہی خطرناک معلوم ہوئی۔ اور اس نے ڈر کر کچھ باسی جلیبیاں سڑک پر پھینک دیں —— بھوکے ہیں —— نہ جانے کیا کر بیٹھیں ——؟

اس دن سے آج تک ——

"دھت دھت ——" وہ کتّوں کو دکان کے سامنے جمع دیکھ کر خوف سے چلّاتا ہے اور پھر جانے کیا کچھ سوچ کر "لو۔ لو دھت!" کہتا کچی پکی مٹھائیاں ان کے آگے پھینک کر سوچتا ہے۔ کوئی ایسی صورت ہو جائے کہ دنیا میں سرے سے کتّے نہ رہیں تو کیسا اچھا رہے ؟

کرشن چندر

غالیچہ

اب تو یہ غالیچہ پُرانا ہو چکا، لیکن آج سے دو سال پہلے جب میں نے اسے حضرت گنج میں ایک دکان سے خریدا تھا اُس وقت یہ غالیچہ بالکل معصوم تھا، اسکی جلد معصوم تھی۔ اس کی مسکراہٹ معصوم تھی، اس کا ہر رنگ معصوم تھا، اب نہیں، دو سال پہلے، اب تو اس میں زہر گھل گیا ہے، اس کا ایک ایک تار مسموم اور متعفن ہو چکا ہے، رنگ ماند پڑ گیا ہے تبسم میں آنسوؤں کی جھلک ہے، اور جلد میں کسی آتشک زدہ مریض کی طرح جا بجا گڑھے پڑ گئے ہیں، پہلے یہ غالیچہ معصوم تھا۔ اب قنوطی ہے زہریلی ہنسی ہنستا ہے۔ اور اس طرح سانس لیتا ہے، جیسے کائنات کا سارا کوڑا کرکٹ اس نے اپنے سینے میں چھپا لیا ہو۔

اِس غالیچے کا قد نو فٹ ہے، چوڑائی میں پانچ فٹ، بس جتنی ایک اوسط درجے کے پلنگ کی چوڑائی ہوتی ہے، کنارہ چوکور بادامی ہے، اور ڈیڑھ انچ تک گہرا ہے، اس کے بعد اصل غالیچہ شروع ہوتا ہے، اور گہرے سُرخ رنگ سے شروع ہوتا ہے، یہ رنگ غالیچے کی پوری چوڑائی میں پھیلا ہوا ہے اور دو فٹ کی لمبائی میں ہے گویا ۲ x ۵ فٹ کی مستطیل، سرخ رنگ کی اک جھیل بن گئی ہے، لیکن

اِس جھیل میں بھی سُرخ رنگ کی جھلکیاں کئی رنگوں کے تماشے دکھاتی ہیں، گہرا سُرخ، ہلکا سُرخ، گلابی، ہلکا قرمزی، اور سُرخ جیسے گندہ خون ہوتا ہے، لیٹتے وقت غالیچے کے اس حصّے پر میں ہمیشہ اپنا سر رکھتا ہوں، اور مجھے ہر بار یہ احساس ہوتا ہے، کہ میرے سر میں جونکیں لگی ہیں۔ اور میرا گندہ خون چوس رہی ہیں۔

پھر اس خونی مستطیل کے نیچے پانچ اور مستطیلیں ہیں، جن کے الگ الگ رنگ ہیں، یہ مستطیلیں غالیچے کی پوری چوڑائی میں پھیلی ہوئی ہیں، اس طرح کہ آخری مستطیل پر غالیچے کی لمبائی بھی ختم ہو جاتی ہے، اور دری کی کور شروع ہوتی ہے، ... خونی مستطیل کے بالکل نیچے تین چھوٹی چھوٹی مستطیلیں ہیں، پہلی سپید اور سیاہ رنگ کی شطرنجی ہے۔ دوسری سپید اور نیلے رنگ کی، تیسری بلو بلیک اور خاکی رنگ کی، یہ شطرنجیاں دُور سے بالکل چیچک کے داغوں کی طرح دکھائی دیتی ہیں، اور قریب سے دیکھنے پر بھی انکے حسن میں زیادہ اضافہ نہیں ہوتا۔ بلکہ نیلام شدہ پرانے گرم کوٹوں کی جلد کی طرح میلی میلی اور بدنما نظر آتی ہیں۔ پہلی مستطیل اگر خون کی جھیل ہے، تو یہ تین چھوٹی چھوٹی مستطیلیں مجموعی طور پر پیپ کی جھیل کا تاثر پیدا کرتی ہیں۔ ان کے سپید، کالے، پیلے، بلو بلیک رنگ پیپ کی جھیل میں گڈمڈ ہوتے نظر آتے ہیں، اس جھیل میں میرے شانے، میرا دل اور میرے پھیپھڑے پسلیوں کے بکس میں دھرے رہتے ہیں۔

چوتھی مستطیل کا رنگ پیلا ہے، اور پانچویں کا سبز ہے، لیکن ایسا سبز جیسا گہرے سمندر کا ہوتا ہے۔ ایسا سبز نہیں جس طرح موسم بہار کا ہوتا ہے۔ یہ ایک خطرناک رنگ ہے، اسے دیکھ کر شارک مچھلیوں کی یاد تازہ ہوتی ہے، اور ڈوبتے ہوئے جہازرانوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں، اور اچھلتی ہوئی طوفانی، دیوہیکل لہروں کی گونج اور گرج رعشہ پیدا کرتی ہے، اور یہ پیلا، مٹیالا رنگ تو منحوس ہی، یہ رنگ زعفران کی طرح، بسنت کیطرح پیلا نہیں، یہ رنگ مٹی کی طرح پیلا ہے، تپ دق کے مریض کیطرح پیلا ہے پیلے گناہ کی طرح زرد ہے، اک ایسا زرد رنگ جسمیں شاید اک ہلکا سا احساسِ ندامت بھی شامل ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے یہ مستطیل بار بار کہہ رہی ہو، میں کیوں ہوں۔ میں کیوں ہوں.....!

جہاں میں اپنا سر رکھتا ہوں، اُس کے دائیں کونے میں نیلے اور پیلے رنگ کے دس خطوط وحدانی بنے ہوئے ہیں، اور جہاں میں اپنے پاؤں پسار کے سوتا ہوں، وہاں گیارہ خطوط وحدانی ہیں، یہ پیلے

اور فیروزی رنگ کے ہیں، غالیچے کے وسط میں چھ خطوط وحدانی سُرخ و سپید رنگ میں ہیں اور ان کے بیچ میں ایک گہرا سیاہ نقطہ ہے ... جب میں غالیچے پر لیٹ جاتا ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا سر سے پاؤں تک کسی نے مجھے ان خطوط وحدانی کی مکوں میں جکڑ لیا ہے۔ مجھے صلیب پر لٹکا کر میرے دل میں اک گہرے سیاہ رنگ کی میخ ٹھونک دی ہے، چاروں طرف گندہ خون ہے، پیپ ہے، اور سبز رنگ کا سمندر ہے۔ جو شارک مچھلیوں اور سمندری ہزار پایوں سے معمور ہے، شاید مسیح کو بھی صلیب پر اتنی ایذا نہ پہنچی ہو گی، جتنی مجھے اس غالیچے پر لیٹتے وقت حاصل ہوتی ہے، لیکن ایذا پرستی تو انسان کا شیوہ ہے، اسی لئے تو یہ غالیچہ میں اپنے آپ سے جدا نہیں کر سکتا۔ نہ اسکی موجودگی میں مجھے کوئی اور غالیچہ خریدنے کی جرأت ہوتی ہے، میرے پاس یہی ایک غالیچہ ہے، اور میرا خیال ہے کہ مرتے دم تک یہی ایک غالیچہ رہے گا۔

اس غالیچے کو دراصل ایک خاتون خریدنا چاہتی تھی، حضرت گنج میں ایک دکان کے اندر وہ اسے کھلوا کر دیکھ رہی تھی، کہ میری نگاہوں نے اسے پسند کر لیا، اور وہ خاتون کچھ فیصلہ نہ کر سکی، اور اسے وہیں چھوڑ کر اپنے بلاؤز کے لئے ریشمیں کپڑے دیکھنے لگی،

میں نے منیجر سے کہا، "یہ غالیچہ میں خریدنا چاہتا ہوں۔"

وہ خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "مس روپ وتی — شاید — اسے پسند کر چکی ہیں۔ شاید! — ٹھہریئے میں اُن سے پوچھتا ہوں،

روپ وتی بولی "غالیچہ — بُرا نہیں!"

"بُرا نہیں؟ کیا مطلب ہے آپ کا" میں نے بھڑک کر کہا۔ "ایسا غالیچہ دنیا میں اور کہیں نہیں ہو گا دانتے کے تخیل نے بھی ایسا جہنمی نقشہ تیار نہ کیا ہو گا، یہ غالیچہ ہسپتال کی گندی بالٹی کی طرح حسین ہے امراض خبیثہ کی طرح رُوح پرور ہے، یہ آگ اور پیپ کا دریا حاتم طائی کے سفر کی یاد دلاتا ہے، قدیم اطالوی راہب مصوروں کے شاہکاروں کی یاد تازہ کرتا ہے، یہ غالیچہ نہیں ہے تاریخ ہے انسان کی، انسان کی روح کی!"

وہ مسکرائی، دانت بے حد سپید تھے، لیکن ذرا ٹیڑھے بیڑھے، اور ایک دوسرے سے بہت قریب، پھر بھی وہ مسکراہٹ اچھی معلوم ہوتی، کہنے لگی، "کیا آپ کبھی اٹلی گئے ہیں؟"

میں نے کہا، "اٹلی کہاں! میں تو کبھی حضرت گنج کے اُس پار نہیں گیا، عمر گذری ہے اسی ویرانے میں، یہ پان کی دکان اور سامنے وہ کافی ہاؤس"

منیجر نے اب تعارف کرانا مناسب سمجھا۔ بولا "آپ آرٹسٹ ہیں۔ کاغذ پر تصویر کھینچتے ہیں، یہ مس روپ وتی ہیں۔ یہاں لڑکیوں کے کالج میں پرنسپل ہو کر آئی ہیں، ابھی ابھی انگلینڈ سے تعلیم حاصل کر کے یہاں......"

وہ بولی: "چلئے تو یہ غالیچہ آپ ہی لے لیجئے۔ مجھے تو خاص پسند نہیں۔"

"آپ کا بڑا احسان ہے۔" میں نے غالیچے کی قیمت ادا کرتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ میرے ساتھ کافی پینا گوارا کریں گی، چلئے نا ذرا کافی ہاؤس تک، اگر ناگوار خاطر نہ ہو۔"

"شکریہ۔ مگر میں ذرا یہ بلاؤز دیکھ لوں"۔ وہ پھر مسکرائی۔

مسکراہٹ بھلی معلوم ہوئی، ذہین بیضوی چہرے کا رنگ زرد تھا، صندلی رنگ پر لبوں کی ہلکی سی سُرخی اک عجب رسیلا تموّج سا پیدا کر رہی تھی، بلاؤز کا کپڑا خرید کر جب وہ میرے ساتھ چلنے لگی تو لڑکھڑا گئی، میں نے بانہہ سے پکڑ کر سہارا دیا اور پوچھا "کیا بات ہے۔ کیا آپ ہمیشہ لڑکھڑا کر چلتی ہیں۔"

وہ بولی۔ "نہیں تو......" میں نے غور سے دیکھا، پاؤں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"زخم ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ انگوٹھے کا ناخن بڑھ گیا تھا، جلد کے اندر..... جہاں کا سرجن بالکل گدھا تھا......"

اُس نے ماتھے پر ساڑھی کا پلّو سرکایا اور جب وہ پہلی بار مڑی تو میں نے اُس کے بالوں میں گردن کے قریب دائیں طرف گلاب کے زرد پھول ٹکے ہوئے دیکھے پھر جب وہ مڑی تو ماتھے کا قمقم درخشاں نظر آیا۔ اس سے پہلے کیوں یہ قمقم اس قدر خوبصورت نہ تھا؟

کافی ہاؤس میں بیٹھ کر معلوم ہوا کہ وہ خوبصورت تھی، کچھ تو کافی ہاؤس میں روشنی کا انتظام ایسا ہے کہ مرد بدصورت نظر آتے ہیں، عورتیں حسین تر، پھر ــــ ہاں ــــ کچھ تو تھا، ورنہ یہ لوگ بار بار مڑ کر کیوں دیکھتے تھے، عورتیں تیز نگاہ سے کیوں گھورتی تھیں، بیرے اتنی جلدی میز پر کیوں آ جاتے تھے۔

وہ مسکرا کر کہنے لگی، ... دیکھو بیرا، تھوڑا سا گرم دودھ، اور گرم پانی ایک الگ پیالے میں۔

گرم پانی تو ــــ بیرے نے رُک کر کہا۔

"تھوڑا سا گرم پانی بس!" وہ پھر مسکرائی، اور بیرا سر سے لیکر پاؤں تک پگھل گیا۔ جیسے اُس کا سارا جسم شیشے کا بنا ہو، میں اُسے پگھلتے ہوئے دیکھ رہا تھا، اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی، اور اُس کے سارے جسم کو پگھلاتی ہوئی چلی گئی، یہ نگاہ کیا ہے؟ یہ تجلی کیسی ہے؟ کیا یہ کافی ہاؤس کی بجلیوں کا شعبدہ تو نہیں؟

"اور بیرا ــــ انڈے کے سینڈوچ"۔ وہ پھر بولی۔

بیرے نے واپس آ کر کہا۔ "جی انڈے کے سینڈوچ تو ختم ہو گئے"۔

"تھوڑے سے بھی نہیں ہیں؟ اُس کی بڑی بڑی معصوم زخمی سی آنکھیں اور بھی کھلتی ہوئی معلوم ہوئیں" بس دو چار! ایک پلیٹ بھی نہیں؟"

سینڈوچ بھی مل گئے

"نہیں بل میں ادا کروں گی۔

"نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں مرد ہوں"۔

وہ ہنسی، "بہت پرانی بات ہے"۔ اور اُس نے بل ادا کر دیا۔

گھر پہ نوکر کو غالیچہ پسند نہ آیا، اُن دنوں ایک تنک مزاج شاعر مہمان تھا جو آزاد بحر میں نظمیں لکھا کرتا تھا۔ شراب پیتا تھا اور پانچ وقت نماز ادا کرتا تھا، اُسے بھی یہ غالیچہ پسند نہ آیا۔ میں نے

پوچھا تو بس "ہوں" کر کے رہ گیا، وہ نظمیں خفنی لمبی لکھتا تھا۔ باتیں اسی نسبت سے کم کرتا تھا۔

"ہوں کا کیا مطلب ہے" میں نے چڑھ کر کہا۔ "کچھ تو کہو۔ ان رنگوں کا تناسب"

"ہوں"

روپ اُسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی، اب کھلکھلا کر ہنس پڑی، اُس سڑے بُسے شاعر سے کہنے لگی، اپنی تازہ نظم سناؤ،... تمہیں معلوم ہے آجکل اسپنڈر اور روڈن اغلامیت کے حق میں نظمیں لکھ رہے ہیں۔

"ہوں" وہ اپنی داڑھی پر ہات پھیر کر غرّایا۔

میں نے روپ سے پوچھا "تمہیں کیسے معلوم ہے؟ کیا اُن لوگوں نے تمہیں اپنی نظمیں سنائی تھیں"

"نہیں۔ لیکن مجھے جو نے بتایا تھا"

"کون؟ جو؟"

"جو براؤن، نام نہیں سُنا ہے کیا؟ آجکل آکسفورڈ کا محبوب ترین شاعر ہے، ہندوستان میں ابھی اُس کا کلام نہیں پہنچا، لندن میں مجھ پر عاشق ہو گیا تھا" وہ کچھ عجب، کچھ بے باک، کچھ شرمیلی سی ہنسی کے ساتھ کہنے لگی، اور ماتھے کا قُم قُم یاقوت کی طرح دمکنے لگا۔

میں نے پوچھا "تمہاری زندگی فتوحات سے پُر معلوم ہوتی ہے!"

"نہیں" اُس نے آہ بھر کر کہا۔ اس طرح کہ میراجی چاہا اُسے گلے سے لگا لوں۔

"ہوں" شاعر بولا۔

رُوپ مسکرا کر کہنے لگی "تمہارا شاعر بہت باتونی ہے۔ ... سنو... تمہیں ایک نظم سناتی ہوں"

میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی، میں نے پوچھا "تم شاعر بھی ہو"

"نہیں۔ یہ نظم میری والدہ نے کہی تھی"

"ٹھہرو۔ مجھے یہ غالیچہ بچھا لینے دو"

غالیچہ بچھ گیا۔ اور نظم روپ نے گا کر سُنائی: بنگالی نظم تھی، اُداس محزوں، شبِ فراق کی

جلی ہوئی، رُوپ شمع کی طرح خوبصورت تھی، آواز شعلے کی طرح لرزاں، تاثر شراب کی طرح خمار آگیں، بنگالی دوشیزائیں قطار اندر قطار.... گھڑے اُٹھائے ہوئے گھاٹ کی طرف جا رہی تھیں سمندر کی سبز لہریں اُچھل رہی تھیں، شو جی کا ڈمرو بج رہا تھا، پاربتی رقص کر رہی تھیں، برف گر رہی تھی۔ ...... اب فضا خاموش تھی۔ اور رُوپ کی آنکھوں میں آنسو تھے.... آنسو رخساروں سے ڈھلک کر غالیچے پر گر پڑے، اور وہ سُرخ مستطیل، جیسے آگ کا شعلہ بن گئی......!

"تمہیں جو براؤن سے عشق نہیں ہوا؟" میں نے پوچھا۔

روپ نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ بولی، "مجھے جس لڑکے سے عشق تھا، اُسے لندن ہی میں تپدق ہو گیا تھا۔ وہ جہاز پر میرے ساتھ آرہا تھا، لیکن راستے ہی میں اُس کی موت ہو گئی، عدن سے پرے، بحیرہ سُرخ میں!"

"بحیرہ سُرخ" میں نے سوچا۔ اور غالیچے کی سُرخ مستطیل بحیرہ سُرخ بن گئی، اور اس کے گہرے پانیوں میں مجھے اِک زرد رُو کھانستا ہوا چہرہ نظر آیا، اور پھر بھنور میں غائب ہو گیا، محوِ خواب ہے رُوپ کا محبوب، سُرخ سمندر کے پانیوں میں، اور رُوپ کے آنسو میرے غالیچے پر گر رہے ہیں....

"ہوں" شاعر نے کہا۔ اور میں نے ایک کتاب اُس کے سر پر دے ماری۔

روپ آنسوؤں میں مسکرا دی، بعض اوقات آنسو رونے سے آنسو پینا زیادہ اندوہناک معلوم ہوتا ہے!

رُوپ!

کیسی عجیب سی لڑکی تھی وہ، لندن میں شاعر جو براؤن اُسے محبت کرتا تھا، اور لکھنؤ میں حضرت گنج کا یہ آوارہ مزاج غریب آرٹسٹ اُس کی محبت میں گرفتار ہو گیا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ زہر ہے وہ کس طرح اس پیالے کو پی گیا، یاسیت، نامرادی، بے بسی، عشق کا جواب ہمیشہ عشق کیوں نہیں ہوتا، یہ کیسی آگ ہے جو ایک کو جلاتی ہے اور دوسرے کے دل میں برف کی سِل بن جاتی ہے، جو محرومِ تمنا کو آنسو رلاتی ہے اور جانِ تمنا کے لبوں پہ تبسم ریز سایہ بھی نہیں لا سکتی

میں نے غالیچے سی جھنگنے ہوئے پوچھا۔

غالیچے نے کہا۔"میں صلیب ہوں، میں دکھ اور درد جانتا ہوں، دکھ اور درد کی دوا نہیں جانتا!"

اور رُوپے نے کہا۔"یہ قسمت ہے، قسمت تمہیں غالیچہ خریدنے کے لئے وہاں لے گئی، قسمت نے تمہیں مجھ سے رُوشناس ہونے کا موقع دیا، اب یہ تمہاری قسمت ہے کہ مجھے تم سے وہ محبت نہ ہو سکی، ہزار کوشش کرنے پر بھی یہ رفاقت محبت میں مبدّل نہیں ہو سکتی۔ یہ قسمت نہیں تو اور کیا ہے؟"

پھر کہنے لگی۔"شاعر اپنے شعر سناؤ۔"

چند روز کے بعد اُس نے یکایک مجھ سے کہا۔"مجھے تمہارے شاعر سے محبّت ہو گئی ہے۔"

"جھوٹ.... اس چند سے....."

"اُس کی آنکھیں دیکھیں تم نے۔" وہ آہ بھر کر بولی۔"جیسے مسیح دار پر لٹکا ہو کتنا اندوہ ہے ان میں!"

میں نے کہا۔"اگر تم کہو تو میں اپنی آنکھیں اندھی کر لوں۔"

"شاید میری تلخی اُسے ناگوار گذری۔ سنجیدہ ہو کر بولی۔" "کیا کروں؟"

"ہاں۔ دل ہی تو ہے!" میں نے طنزاً کہا۔

"ہوں۔" شاعر بولا۔

جس روز وہ دونوں رخصت ہوئے، میں نے گھر پر اک چھوٹی سی دعوت کی، رُوپے ڈھاکے کی سیاہ ساری پہنی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں کاجل گھرا تھا۔ ریشمی چوڑیوں کا رنگ بھی سیاہ تھا، ہر روز اُسے دیکھ کر اُجیالے کا، سُورج کا ——— چاند کی کرن کا، روشنی کا احساس ہوتا تھا۔

نجانے آج اُسے دیکھ دیکھ کر کیوں تاریکی کا احساس ہو رہا تھا۔ کیوں وہ اس اپنی مکمل کامرانی کے لمحوں میں بھی مجسم یاس و غم کی تصویر دکھائی دیتی تھی، کیا یہ غریب آرٹسٹ کے دل کا اندھیرا تو نہیں تھا۔ کیا یہ اُس کے برش کی تاریکی تو نہ تھی! آج میں نے اُس سے وہی گیت سننے کی تمنّا کی تھی جو اُس نے پہلے روز گایا تھا.... مجھے یاد ہے، گانے کے بعد وہ ناچی بھی تھی، میں نے اُس کا چہرہ نہیں دیکھا، میں اُس کے پاؤں دیکھتا رہا، دھندلے دھندلے تاریک سے پاؤں جن میں حنا کی سُرخ لکیر بجلی کی طرح چمک چمک جاتی

تھی، اُس تاریکی میں صرف یہاں روشنی تھی، وہ ناچتی رہی اور میں اُس تاریکی میں حنائی لکیر کا ناچ دیکھتا رہا۔ اور جب ناچ بھی بند ہوگیا، تو میں نے وہ پاؤں اُٹھا کر اپنے سینے میں رکھ لئے، کیوں یہ پاؤں آج تک اس سینے میں محفوظ ہیں.... کیا اس اہرام میں ممیوں کے سوائے اور کسی کے لئے جگہ نہیں؟

جب وہ چلی گئی تو میں پھر غالیچے پر آ بیٹھا۔ زرد گلاب کی اک کلی اُس کے جوڑے سے نکل کر غالیچے پر پڑی رہ گئی تھی.... میرے دل میں شاید اب رُوپ کی کوئی یاد باقی نہیں، صرف یہ دو پاؤں ہیں اور اک یہ گلاب کی زرد کلی... کیسی تصویر ہے یہ؟ مصور ہو کر بھی میں نے شاید ایسی عجیب تصویر اس سے پہلے کبھی نہ بنائی تھی.... پھر؟

میں غالیچے سے پوچھتا ہوں۔

غالیچہ کہتا ہے "میں تو صلیب ہوں، صلیب موت بخشتی ہے، اُسے زندگی کی ترتیب، تناسب، توازن سے آگاہی نہیں......"

اچھا اسے بھی جانے دو۔ جو ہوا سو ہوا۔ اگر زندگی میں قبر ہی کا مزا لینا ہے تو کیوں نہ اسے آرام سے حاصل کیا جائے، اگر شہد میں زہر ہی ملا کے پینا ہے، تو کیوں نہ خالص زہر پیا جائے، اگر معصومیت برقرار نہیں رہ سکتی، تو کیوں نہ گہری معصیت کی آغوش میں پناہ لی جائے، آؤ، اپنے دل میں ضمیر کی جو ہلکی سی شمع رہ گئی ہے اُسے بھی خموش کر دیں، اور بڑھتی ہوئی تاریکی میں گناہ کے پھیلتے ہوئے دُود کو دیکھیں اور زندگی کا منہ چڑائیں اور قہقہے لگائیں، محبت نہ سہی، بوالہوسی سہی!

آرٹسٹ نے اک اور لڑکی سے آشنائی پیدا کر لی، جو بینک میں ملازم تھی، اُس کا نام تھا آشا لیکن صورت پر بالکل نراشا برستی تھی، ایسی بھُو کی لڑکی تھی وہ، کبھی مرد دیکھا ہی نہ تھا، کُتیا کی طرح ساتھ ساتھ لگی پھرتی تھی، بے چاری آرٹسٹ کو شاید اُس پر رحم آنے لگا تھا، وہ اُس کے ساتھ شفقت برتنے لگا۔ اِک مربیانہ، پدرانہ انداز کے ساتھ اب وہ اُسے ہر جگہ لئے لئے پھرتا، لوگ طنزاً اُس کے حسن انتخاب کی داد دیتے اور وہ بظاہر بڑے خلوص سے داد قبول کرتا، کوئی کہتا بھئی، بڑی

بدصورت ہے وہ، تم نے کیا سوچ کر ـــــ" تو وہ لڑنے پر آمادہ ہو جاتا، گھنٹوں اُس کی خوبصورتی کا تجزیہ کرتا، کوئلے سے اُس نے آشا کی تصویر بنائی تھی۔ اور اپنے سٹوڈیو میں ہر کس و ناکس کو وہ یہ تصویر دکھاتا تھا۔ وہ اپنے زخم دکھا رہا تھا۔ دیکھو ... دیکھو ... دیکھو ... مجھے تمہاری کیا پروا ہے ... میں اپنی رُوح کا آپ مالک ہوں ... زہرخند! ... کوئلے!

لیکن وہ جو کبھی حضرت گنج کے اُس پار نہ گیا تھا۔ اب وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کرنے لگا، فٹ پاتھ پر چلتے چلتے وہ ہزاروں اُلٹے سیدھے خواب دیکھنے لگتا، رہگذر کے ہر پتھر پر اُسے کسی کے پیروں کے دھندلے دھندلے سائے کانپتے ہوئے معلوم ہوتے، کافی کی پیالی کے ہر سانس میں وہ اُس کے گرم سانس کا مس محسوس کرتا، اور برقی شمعدانوں کے براق اجیالے میں اُسے ہزاروں قُمقُم تیرتے ہوئے دکھائی دیتے، یہ ہنسی؟ وہ مڑ کر دیکھتا کہاں سے آئی تھی، لیکن یہ تو وہی کشمیری پالتو مینا اپنے پنجرے میں چہک رہی تھی، بُلبُل قفس کی تیلیاں توڑ کر پرواز کر گئی تھی اور وہ ابھی تک کیوں حضرت گنج کے ویرانے میں مقید تھا ... کیوں؟ کیوں؟ وہ حنائی لکیر بار بار بجلی کی طرح چمک کر اُس سے بار بار پوچھ رہی تھی!

اب جبکہ وہ شہر چھوڑ کر جا رہا تھا اُس نے اپنے سب دوستوں کو، اُس ویک لڑکی کو اور اُس کی سب سہیلیوں کو آخری دعوت دی تھی اور جب دعوت کے بعد سب لوگ چلے گئے تھے۔ تو ویک لڑکی حیران و پریشان اُس غالیچے پر بیٹھی رہی تھی، اور پھر یکایک اُس کے سینے سے لگ کر رو پڑی تھی، یہ گرم گرم آنسو جو اُس کے سینے میں برف کے پھُول بنتے جا رہے تھے، عشق کا جواب عشق کیوں نہیں ہوتا، یہ کیسی آگ ہے جو ایک کو جلاتی ہے اور دوسرے کے دل میں برف کی سل بن جاتی ہے!

ویک لڑکی غالیچے پر لیٹی تھی، بازو اُوپر کے خطوط وحدانی کے شکل میں تھے۔ پاؤں نیچے کے خطوط وحدانی میں، غالیچے نے چپکے سے اُس کے دل میں اک سیاہ میخ ٹھونک دی، اہرام کے لئے ایک اور ممی تیار ہو گئی، لیکن وہاں جگہ کہاں تھی، سینے میں اب بھی وہی دو پاؤں ناچ

رہے تھے . . . . اور وہی گلاب کی اک زرد کلی!

میں نے غالیچے سے پوچھا، "یہ کیسا کھیل ہے؟ میں کس کا منہ چڑا رہا ہوں، یہ زخم کس کے ہیں؟ یہ لڑکی . . . . . . کیوں رو رہی ہے، اگر یہ سب قسمت ہے تو پھر یہ کاوشِ پیہم کیا ہے جو ممی کو بھی زندہ کر دینے پر تُلی ہوئی ہے۔"

غالیچے نے جواب دیا، "مجھے معلوم نہیں۔ میں تو ایک صلیب ہوں، جو دل میں سیاہ کیل ٹھونکتی ہے، سپید روشنی نہیں لاتی، جو قسمت کا انجام دکھاتی ہے، اُس کا آغاز و شباب نہیں!"

تجھے جلا کر خاک نہ کر ڈالوں!

اِس نئے شہر میں!

چار آدمی غالیچے پر تاش کھیل رہے ہیں۔

دو ایکٹر

دو تجارہ

اور جو تماشہ دیکھ رہا ہے وہ آرٹسٹ ہے!

تاش کھیلتے کھیلتے ایکٹر اور تجارہ لڑنا شروع کرتے ہیں، ہاتھا پائی کی نوبت آتی ہے، غالیچہ نوچا جاتا ہے، کیونکہ ایک چال میں ایک تجارہ غلطی سے یا جان بوجھ کر آٹھ آنے زیادہ لے گیا تھا، میرا گریبان تار تار ہو چکا ہے، کیونکہ جو آدمی لڑائی رفع کرنا چاہتا ہے، وہی سب سے زیادہ پٹتا ہے۔

پھر میں سوچتا ہوں۔ اِس بدمزگی کو دُور کرنے کا کیا طریقہ ہے، بذلہ سنجی ناممکن! گراموفون بڑا واہیات! چائے لعنت! شراب؟ سبحان اللہ!!

سب لوگ شراب پی رہے ہیں، آرٹسٹ کی آنکھیں سُرخ ہیں، ہمیشہ ہنسنے اور خوش رہنے والا خوش شکل ایکٹر ہمیشہ چُپ رہنے والے قبول صُورت ایکٹر سے کہہ رہا ہے۔ محبت؟ محبّت؟

سالا تو محبّت کیا جانے، ابھی کالج کا لونڈا ہے تو . . . . ایں . . . . محبّت کا نشہ مجھ سے پُوچھ . . . . سالی یہ شراب بھی بالکل تلخ نہیں ہے . . . . رانی کو دیکھا ہے تُو نے ؟

"رانی ۱۹۴۴ کی بہترین ایکٹرس ہے نا" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں، وہ ــــ وہی ــــ سالا تو کیا جانے . . . . وہ میری محبُوبہ ہے . . . . سمجھے ؟ . . ایں ! میں نے اُس کے لئے اپنے ماں باپ کی گالیاں کھائیں . . . کئی لڑائیاں لڑیں رقیبوں سے . . . اپنا گھر بار چھوڑ دیا . . . . یہ انگوٹھی شالے دیکھتے ہو، یہ قمیض کے بٹن، یہ کف بٹن، یہ سب سونے کے ہیں، شالے تو کیا جانے . . . . یہ سب اُس نے دیئے ہیں . . . . تحفے . . . مگر میں اُس سے شادی نہیں کرونگا۔ کبھی نہیں کرونگا" اس نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔ "کیوں ؟"

"وہ مجھے چاہتی ہے۔ پر وہ مجھ سے بہت امیر ہے . . . . وہ چاہتی ہے کہ مجھ سے شادی کرلے پر میں مر جاؤں گا، اُس سے بیاہ نہیں کروں گا"

"تمہیں اس سے محبّت نہیں !" ایک تجّار نے پوچھا۔

"لیکن بھئی گھر آئی دولت کیوں چھوڑتے ہو" دوسرے تجّار نے پوچھا۔

ایکٹر نے مٹھیاں بھینچ کر کہا "میں جو ہوں وہی رہونگا۔ میں اُس سے محبت کرتا ہوں لیکن اُس کا غلام بن کر نہیں رہ سکتا۔ میں اُس کی محبت چاہتا ہوں۔ میں اُس کی محبت چاہتا ہوں دولت نہیں، اور خ !" ایکٹر نے زور سے غالیچے پر ہاتھ مار کر کہا۔ اور پھر قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا !!

غالیچہ کانپ اُٹھا۔ اُس کا رنگ عجیب سا ہو گیا۔

اور شراب دے حرامزادے ! وہ اپنے خالی گلاس کو ٹٹول رہا تھا۔

میں نے کہا "رانی ؟ ارے بھئی۔ آج ہی تو میں نے اخبار میں پڑھا ہے کہ رانی نے ایک امریکن سے شادی کر لی"

ایکٹر نے آہستہ سے شراب کا گلاس غالیچے پر لنڈھا دیا۔ اُس کی اُنگلیاں کانچ کی سطح پر سختی سے جم گئیں۔ کانچ اُس کی اُنگلیوں کو زخمی کرتا ہوا ریزہ ہو گیا۔

وہ رندھے ہوئے گلے سے کہنے لگا "یہ غلط ہے، بالکل غلط ہے!"

آرٹسٹ نے میز پر سے اخبار اُٹھا کر پڑھا۔

ایکٹر کا چہرہ!..... وہ غالیچے پر دونوں کہنیاں ٹیکے میری طرف دیکھ رہا تھا.... اُس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا.... اُس کا چہرہ سُتا جا رہا تھا۔ ممی کے خدوخال اُبھر رہے تھے۔

"یہ غلط ہے۔ بالکل غلط ہے" وہ پھر چیخا۔ پھر ایک دم خاموش ہو گیا۔ دوسرا ایکٹر اُسکے گلاس میں شراب انڈیلنے لگا۔ وہ اب بھی خاموش تھا، لیکن پہلا ایکٹر غالیچے سے لگ کر سسکیاں لے رہا تھا۔ پھر اُس نے غالیچے پر قے کر دی.... مجھے غالیچے کا رنگ اُڑتا ہوا معلوم ہوا۔ سُرخ سے سپید و زرد ــــ جیسے یہ غالیچہ نہو۔ زندگی کا کفن ہو۔

رانی! رانی!! رانی!!!

صبح میں نے غالیچہ دھلوایا، اور صاف کرا کے پھر کمرے میں رکھا، کہ میری محبوب کمرے میں داخل ہوئی، یہ میری نئے شہر کی محبوب تھی؛ یہاں آ کر آرٹسٹ نے پھر عشق کر لیا تھا۔ عشق کرنا کس قدر مشکل ہے لیکن جب عشق مر جائے، اُس کے بعد عشق کرنا کس قدر آسان ہو جاتا ہے، اہے نا! مردُود بولتے کیوں نہیں؟ جواب دو! میری محبوب کے ہونٹ موٹے تھے، رخسار بھی موٹے۔ جسم بھی موٹا، ہنسی بھی موٹی، عقل بھی موٹی، وہ عورت نہ تھی، اک دھرا ہوا غالیچہ تھی، آج اُس نے اپنے بالوں کی دو چوٹیاں بنا ڈالی تھیں، اور اُن میں چنبیلی کے پھول سجائے تھے،

وہ غالیچے پر آ کر بیٹھ گئی۔

میں نے اُس کی بلائیں لیکر کہا۔ "آج تو تم قلوپطرہ کو بھی مات کرتی ہو۔"

"کلوپترا کیا ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"مصر کی ملکہ تھی۔"

"مسر؟"

"ہاں مصر، وہ ملک جہاں مرنے کے بعد اہرام تیار ہوتے ہیں۔ اور مُردوں کی ممیاں تیار کی

تباہ کی جاتی ہیں . . . . خدا کرے تمہاری موت بھی قلوپطرہ کی طرح ہو!"

"ہائے کیسی باتیں کرتے ہو؟ کیا ہوا تھا اُسے . . . . !"

"سانپ سے ڈسوا کر مر گئی تھی"

وہ اِک ہلکی سی چیخ مار کر میرے قریب آ گئی، "ڈراتے ہو مجھے"، اُس نے میرا بازو پکڑ کر کہا پھر وہ ہنسی، اپنی موٹی بھدی ہنسی، جیسے بھینس جگالی کر رہی ہو . . . پھر اُس نے اپنے ہونٹ میرے آگے بڑھا دیئے۔ جیسے کوئی فیاض جاٹ کسی اجنبی شہری کو گنا چوسنے کو دیدے!

میں نے گنا چوستے ہوئے کہا "یہ غالیچہ جیتا ایک بار ہے لیکن مرتا بار بار ہے . . . . تو، یہ موت بار بار کیوں آتی ہے . . . اب آ بھی جائے آخری موت!"

"آج یہ تم کیوں بار بار موت کا ذکر کر رہے ہو" وہ منمنائی۔

"کچھ نہیں۔ تم نہیں سمجھو گی" میں نے کہا۔ ہاں یہ تو بتاؤ آج تمہارے تازہ لبوں سے رخساروں سے، آنکھوں سے، بالوں سے، یہ کیسی لطیف خوشبو نکل رہی ہے"

"کچھ نہیں! وہ ہنس کر بولی" آج کھوپرے کا خوشبو دار تیل لگایا ہے!"

میں نے غالیچے کیطرف کنکھیوں سے دیکھا، اُس کا رنگ اُڑتا جا رہا تھا۔ بیچارہ ایکبار پھر مر رہا تھا اُس کی جانکنی مجھ سے دیکھی نہ جاتی تھی، میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

سیدھا سٹیشن پہنچ گیا، ارادہ تھا، جی بھر کر بیئر پیوں گا۔ بیئر پیوں گا، نہ صرف اپنے گردوں کو بلکہ اپنی روح کو بھی جُلاب دونگا تا کہ یہ سارا کوڑا کرکٹ بہہ جائے، نکل جائے۔ طبیعت ہلکی ہو جائے!

سٹیشن پر بیئر سے پہلے رُوپ مل گئی۔

"ارے؟ تم کہاں؟"

"جونا گڑھ گئی تھی پہاڑ پہ"

"اور شاعر؟"

وہ کھانس کر کہنے لگی "اُس نے مجھے چھوڑ دیا ہے"

چھوڑ دیا؟" "کیوں!"

"مجھے تپدق ہے، جوناگرٹھ سینی ٹوریم میں گئی تھی نا!"

اُس کی نگاہوں میں سبز رنگ کا سمندر تھا، اور راک زرد و نحیف چہرہ بھنور میں غوطے کھا رہا تھا، پھر وہ چہرہ بھی غائب ہوگیا، اب شاعر کا سڑا ہوا بشرہ لہروں پر تیرنے لگا، شاعر کا چہرہ سر ہلا کر کہہ رہا تھا۔"ہوں"

میں نے کہا۔"کہاں ہے وہ حرامزادہ!"

"جانے دو" وہ محزوں انداز میں کہنے لگی "اُسے گالی نہ دو۔۔۔ مجھے اُس سے ابھی تک محبت ہے!"

"لیکن"

"ہاں،" وہ بولی "اِس لیکن کے بعد بھی ــــ اب میں اپنے گھر جا رہی ہوں، میکے، آرام سے مرونگی"

"نہیں، نہیں" میں نے سختی سے کہا۔"اب میں تمہیں نہیں جانے دونگا، زندگی نے تمہیں مجھ سے چھین لیا، اب موت کے دروازے تک ہم دونوں اکٹھے چلیں گے، اور اگر اس دنیا کے بعد کوئی دوسری دُنیا ہے تو شاید ــــ

وہ ہنسی، وہی اجیالی ہنسی، وہی صندلی چہرہ، وہی دمکتا ہوا قمقم۔

میں نے اُس کی بانہہ پکڑ کر کہا "گھر چلو ــــ روپ! جیتے جی تم نے مجھے اپنے ساتھ نہ رہنے دیا۔ اب موت کے چند لمحے تو بخش دو۔"

وہ مسکرائی۔ بولی "تم نہیں جانتے؟ محبت زندگی میں اور موت میں بھی یکساں سلوک کرتی ہے!"

گاڑی نے سیٹی دی۔

وہ بولی۔"مجھے اُمید نہ تھی تم کبھی ملو گے! افسوس ہے کہ میں یہاں رُک نہیں سکتی، ہاں یہ کتاب تمہیں دے سکتی ہوں، اُس لڑکے کی نظمیں۔"

گارڈ نے جھنڈی دکھائی۔

وہ اپنے ڈبے کی طرف چلدی، میں اُس کے چہرے کیطرف نہ دیکھ سکا۔ میری آنکھیں پھر اُس کے

پاؤں پر گڑ گئیں، وہ پاؤں چلتے گئے، چلتے گئے، وہ جاتے ہوئے بھی گویا قریب آتے گئے، بالکل میرے سینے پر آ گئے، اور میں نے اُنہیں اُٹھا کر اپنے سینے کے اندر چھپا لیا۔ . . . .

میں نے نگاہ اُٹھائی۔

گاڑی جا چکی تھی!

محبُوبہ ابھی تک میری راہ دیکھ رہی تھی۔ بولی، کہاں چلے گئے تھے۔

میں چُپ ہو رہا۔

"یہ کونسی کتاب ہے؟"

"الکے کی"

"کیا؟"

"ایک شاعر کی نظمیں ہیں"۔

"مجھے سناؤ۔ کیا کہتا ہے یہ؟"

میں نے کتاب کھولی، پندرھواں صفحہ آنکھوں کے سامنے آیا۔ آہستہ سے پڑھنا شروع کیا۔

"اے خدا تُو نے زندگی اپنی مرضی کے مطابق دی، اب موت تو میری مرضی کے مطابق بخش دے۔ تجھ سے اور کچھ نہیں چاہتا ہوں خداوند!"

"پھر موت!" وہ بولی۔ "بُرا شگون ہے۔ اُس نے کتاب میرے ہاتھ سے چھین کر الگ کر دی، اور اپنے لب میری طرف بڑھا دیئے۔ غالیچہ اُبل رہا تھا۔ بالکل آگ ــــــ شعلوں کا دریا، پیپ کا سمندر، زہر کا کھولتا ہُوا گرم چشمہ، میں نے اُس سے پُوچھا۔ تم صلیب ہو، تم نے آدمی کے بیٹے کو مسیحا بنا دیا۔ بتاؤ، مجھے کیا بناؤ گے۔

غالیچے نے کہا۔ "جو تم خود بن چکے ہو۔ اِک اہرام ــــــ اک کھوکھلا اہرام جس کے سینے میں ممیاں دفن ہیں!"

میں نے اپنی محبوبہ سے کہا "میرا جی چاہتا ہے۔ اس غالیچے کو جلا کر خاک کر ڈالوں"۔
وہ بولی۔ "ہاں! پرانا تو ہو گیا ہے"۔
"لیکن"۔ میں نے رُک کر افسردہ لہجے میں کہا ــــ "میرے پاس تو یہی ایک غالیچہ ہے۔ اور یہی ایک زندگی ہے۔ نہ اسے بدل سکتا ہوں۔ نہ اُسے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!!!"

یہ کہہ کر آرٹسٹ گنّا چُوسنے لگا۔

جدید غزلیں

فراق گورکھپوری

دیکھ محبت کا یہ عالم — ساز بھی کم کم، سوز بھی کم کم
یہ شیرازۂ دل کا ہے عالم — یک جا، یک جا برہم برہم
حسنِ گلستاں، شعلہ و شبنم — سوزاں سوزاں، پُرنم پُرنم
یاد ہے ان آنکھوں کا وہ عالم — مستی کم کم، وحشت کم کم
ساکت ساکت شورشِ عالم — دِل کی صدا بھی مدھم مدھم
عالم عالم عشق بھی تنہا — تنہا حُسن بھی عالم عالم
یہ کیا کم ہے عشق کا حاصل — کچھ مجھ کو غم، کچھ تم کو غم
غمکدۂ دل کا یہ دھندلکا — روشنی کم کم، تیرگی کم کم
سازِ محبت، نغمۂ جنت — سوزِ محبت، نارِ جہنم
رنگ ہے کِس کا، رُوپ ہے کِس کا — نِکھرا نِکھرا، مبہم مبہم
دِل کی وُہ دنیا ہے جو ہوگی — برہم ہو کر اور منظم
دِل کی جراحت تیری محبت — ایسا زخم، نہ ایسا مرہم
آتی بہاریں، جاتی بہاریں — دونوں کا حاصل دیدۂ پُرنم
عشق میں سچ ہی کا رونا ہے — جھوٹے نہیں تم، جھوٹے نہیں ہم
ہم نے بھی آج فراقؔ کو دیکھا — سوزِ مکمل، دردِ مجسم

جذبی

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا، اب خواہشِ دنیا کون کرے؟
جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے؟
ہاں وادیِ ایمن بھی ہے وہی، ہاں برق کا مسکن بھی ہے وہی
اور ہوش کا خرمن بھی ہے وہی پر اُن سے تقاضا کون کرے؟
جو آگ لگائی تھی تم نے اُس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اُس آگ کو ٹھنڈا کون کرے؟
دُنیا نے ہمیں چھوڑا جذبی، ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دُنیا کو
دُنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں، اب دُنیا دُنیا کون کرے؟

ہم اس دہر کے ویرانے میں جو کچھ بھی نظارا کرتے ہیں
اشکوں کی زباں میں کہتے ہیں، آہوں میں اشارا کرتے ہیں
کیا تجھ کو پتہ، کیا تجھ کو خبر، دن رات خیالوں میں اپنے
اے کاکلِ گیتی! ہم تجھ کو جس طرح سنوارا کرتے ہیں،
اے موجِ بلا! اُنکو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارا کرتے ہیں
کیا جانیئے کب یہ پاپ کٹے، کیا جانیئے وہ دن کب آئے
جس دن کیلئے ہم اے جذبی کیا کچھ نہ گوارا کرتے ہیں

احمد ندیم قاسمی

اذنِ جہاں کا طالب کیوں ہے ولولۂ اعجاز نمائی
رسم کے زنداں میں کیوں سمٹے جذبۂ وحشت کی گہرائی
یہ پُرشور عبادت خانے مقتل ہیں احساسِ جواں کے
بندوں کا محتاج نہ ہوگا حُسنِ مشیت کا شیدائی
چاہوں تو تخلیقِ جہاں کے سب اسرار نمایاں کر دوں
لیکن مجھ کو روک رہی ہے جذبۂ یزداں کی رسوائی
اک زنجیر کی اتنی کڑیاں! اک مالا کی اتنی لڑیاں!
وہ بحری۔ یہ کوہستانی۔ وہ میدانی۔ یہ صحرائی
غازہ و خوشبو کے جالوں سے وہ انسان کیوں دھوکا کھائے
جس کے تصور پر طاری ہو حُسنِ ازل کی وہ سالوائی